چاند گہنا

اور

دیگر افسانے

راجہ مہدی علیخان

چاند کا گناہ

اور

دیگر افسانے

از

راجہ مہدی علی خان

پبلشرز

مکتبۂ اُردو ۱۵ سرکلر روڈ لاہور

قیمت مجلد صرف دو روپے (عہ)

فہرس

دیباچہ

از جناب عابد علی صاحب عابد ایم اے ایل ایل بی پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور

میرے مکرم دوست راجہ مہدی علی خاں جن سے اردو داں حضرات اب بخوبی واقف ہو چکے ہیں اپنے تراجم کا یہ مجموعہ شائع کر رہے ہیں اور مجھے اس بات کیلئے انتخاب کیا گیا ہے کہ اس کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ کو بحرِ ابد میں چھوڑ دوں دیکھیں شہرتِ دوام کے کنارے لگتی ہے کہ نہیں۔

ہر ادبی کتاب کی اشاعت ایک قسم کا تجربہ ہے!

بعض ادبی کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ نہایتِ موضوع، اور اندازِ جمیل کے باوجود زندگی دوام کے کناروں تک نہیں پہنچتیں، اور بعض کتابیں ایسی ہیں کہ سیدھی سادی زبان میں لکھے جانے کے باوجود، موضوع کی گراں پائیگی سے بے نیاز مستقلاً اپنی ایک جگہ بنا لیتی ہیں۔

میرے خیال میں یہ کتاب موخر الذکر کتابوں میں سے ہے!

آج کل اکثر ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں، خدا انگریزی دانی کا بھلا کرے،

ترجمے بھی ہوتے ہیں، ماخوذ بھی، ملخص بھی، آزاد بھی، مختصر یہ کہ ہمارے ادیبوں نے ترجمے کی کتنی قسمیں قرار دی ہیں، اور ان تمام اصناف تراجم پر طبع آزمائی کرنے والوں کی کمی نہیں ہے!

شکر ہے کہ مہدی صاحب ان مترجمین میں سے نہیں جو اپنے افلاس ذہنی کو چھپانے کے لئے آزاد ترجمے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، وہ ان باہمت نوجوانوں میں سے ہیں جو دشواری راہ کی جاں گسل منزلوں کو خود حصولِ مقصد سے زیادہ ہمت آموز تصور کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ترجمہ کرتے ہیں!!

جن لوگوں نے ترجمہ کیا ہے، وہ اس مختصر سے فقرے کے اندر جو جانگدازیاں پنہاں ہیں۔ ان کا اندازہ کرسکتے ہیں، میرے محترم دوست محمد ہادی حسین صاحب قریشی ایم۔ اے، آئی، سی، ایس، ترجمہ کرنے کے بعد اس طرح نڈھال ہو جایا کرتے تھے۔ گویا کسی مہلک بیماری سے شفایاب ہوئے ہیں، لیکن اس کاوش کا نتیجہ دیکھئے، فنونِ لطیفہ، ورٹر کی داستانِ غم، اور آسکر وائلڈ کے افسانوں کے ترجموں کی صورت میں!

اصل مصنف کے معانی و مطالب کو سمجھنا! یعنی جس زبان میں اصل کتاب لکھی گئی ہے۔ اس زبان کی تمام باریکیوں، تمام دلالتہائے التزامی، تمام رعایات ز

رسوم سے کماحقہ واقف ہونا! اور پھر اردو کی انشاء پردازی سے اہلِ زبان کی طرح باخبر ہونا، یہ چیز پیدا ہو پھر ترجمہ ہوتا ہے، ورنہ جہاں علم کی تہی دامانی سے قلم ذرا رکا 'آزاد ترجمہ' لکھ کر گویا فرائض سے عہدہ برآ ہو گئے:

اس کتاب میں یورپ کے مشاہیر افسانہ نویسوں کے افسانے ہیں، ہندوستان کی اینگلو انڈین زندگی کا ترجمان کپلنگ بھی ہے ـــ اور فطرتِ نسوانی کو سمجھنے کا دعویدار موپاسان بھی ہے عہد وکٹوریہ کا واحد ذہین و فطین (CLEVER) ادیب (جس نے ادبی ذہانت کی بنیاد رکھی ہے) آسکر وائلڈ بھی ہے، زندہ جاوید افسانہ نگار ہنیز اینڈرسن بھی ہے۔ موصوف کے اس مجموعے میں اکثر افسانے ہنیز اینڈرسن کے ہیں اور اس بات کے ساتھ ایک کہانی متعلق ہے؟

بعض مترجمین اور افسانہ نویسوں میں ایک قسم کا اشتراک ذہنی ہوتا ہے۔ یعنی بعض ادیب بعض افسانہ نویسوں کے متعلق اس طرح محسوس کرتے ہیں۔ گویا "صدا یہ کیسی آشنا کی ہے" یہ ایک نہایت مبارک و مسعود اتفاق ہوتا ہے۔ اور جب ان حالات میں غیر زبان سے کوئی چیز منتقل ہوتی ہے تو خود اصل کی اہمیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ مہدی صاحب نے ہنیز اینڈرسن کے جو ترجمے کئے ہیں وہ اس معیار پر تمام و کمال پورے اترتے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے اس کے افسانے اردو میں دیکھ

چکا ہوں نہایت احتیاط سے ترجمہ کئے گئے تھے۔ لیکن اس جسم میں روح مفقود تھی۔ ان افسانوں میں عروس جمیل و لباس حریر کی تفسیر دیکھ لیجئے۔ ان کے ترجمے میں جو نمایاں خوبی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ نقلی مال معلوم ہی نہیں ہوتا۔ نقل اور اصل کی تمیز انہوں نے اس طرح مٹائی ہے اور اپنے دماغی سانچوں میں ان افسانوں کو اس طرح ڈھالا ہے کہ ہنیز اینڈرسن کے افسانے میری نظر سے گذرے نہ ہوتے تو ان ترجموں کی بے تکلفی اور برجستگی اور سہل الممتنع سادگی کو دیکھ کر مجھے بجا طور پر شبہ ہوتا کہ انہی کے اپنے افسانے ہیں اور انہوں نے ہمیں دھوکا دینے کے لئے ہنیز اینڈرسن کا نام لکھدیا ہے۔

انتخاب موضوع میں، انداز تحریر میں، زندگی کے متعلق نقطۂ نظر میں، مسائل حیات کی افہام و تفہیم میں، ذہنیت و شخصیت کے اظہار میں، یہ تمام مصنف ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں، اور اس قدر متنوع ادبی ضیافت کا دستر خوان قارئین کرام کیلئے شاید ہی کبھی بچھایا گیا ہو۔

زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ حسنِ اتفاق سے ہنیز اینڈرسن کی تمثیلی کہانیوں کے ساتھ آسکر وائلڈ کی بھی ایک تمثیلی کہانی ترجمہ کی گئی ہے۔ دونوں نے جس طرح ایک ہی صنفِ ادب میں اپنی شخصیت کا اظہار کیا ہے۔ وہ ذوقِ نظر کے لئے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے!

میری نظر میں تراجم کا دور گذر گیا، بہت جلد ہندوستان کے ادیب ترجمے کی ذہنی غلامی کے خلاف بغاوت کریں گے، اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ ترجمہ بیکار ہے، دنیا کے شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرنے والے تحسین وستائش کے مستحق ہیں، لیکن جن لوگوں نے انگلستان کے ٹٹ پونجیوں کے ردی کے میگزینوں سے ترجمہ کر کے ایک فانی سی شہرت حاصل کر لی ہے، ان کا دور گذر گیا، اب ترجمہ صرف ان چیزوں کا ہوا کرے گا۔ جن کے بغیر اردو زبان نامکمل ہے۔ ہندوستان میں اپج والے دماغوں کی کمی نہیں ہے، اور مقام مسرت ہے کہ مختلف جرائد وصحائف میں اس بات کے آثار نظر آ رہے ہیں! طبعزاد افسانے پہلے سے زیادہ شائع ہوتے ہیں، تراجم کے جنوں کی شدت میں کمی ہو گئی ہے،

اس مرحلے پر مہدی صاحب کی اس کتاب کی اشاعت کو بھی اپنے نظریئے کی موید سمجھتا ہوں، کیونکہ اس میں انگریزی کے ادنے درجے کے میگزینوں سے ترجمہ کئے ہوئے افسانے نہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کے انشاپردازوں کے نتائج دماغی ہیں!

خدا کرے ان کی دوسری کتاب طبعزاد افسانوں کا مجموعہ ہو!

عابد علی

انتساب

نگہت کے نام

راجا مہدی علی خاں

جل پری

جل پری

سمندر میں دور، بہت دور جا کر عمیق ترین گہرائیاں آ جاتی ہیں۔ ایسی گہرائیاں جنہیں لمبی سے لمبی رسی کی مدد سے بھی نہ پایا جا سکے گرجاؤں کے بہت سے مینار سمندر میں اوپر تلے رکھ دیئے جائیں جب بھی پانی کی سطح تک نہ پہنچ سکیں۔ وہاں کا پانی اتنا نیلا ہے جتنا آسمان اور اتنا ہی شفاف جتنا بلور۔ سمندر کا بادشاہ اور اس کی رعایا وہیں رہتی تھی۔ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ سمندر کی تہ میں نیلی نیلی ریت کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں نہیں، یہ حقیقت ہے کہ وہاں نرالی سے نرالی وضع کے پھول اور خوشنما سبزیاں اُگی ہیں جن کی پتیاں اور شاخیں اس قدر لچکدار ہیں کہ پانی کی لطیف ترین جنبش بھی ان میں ایک ہلچل ڈال دیتی ہے۔ اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ان میں جان سی پڑ گئی ہے۔ ان شاخوں میں چھوٹی بڑی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے زمین پر پرند درختوں کی شاخوں میں پھدکتے نظر آتے ہیں۔ عمیق ترین حصے میں سمندر

کے بادشاہ کا محل کھڑا ہے۔ جس کی دیواریں مرجان کی ہیں۔ اور نکیلے محرابوں والی لمبی لمبی کھڑکیاں مصفیٰ تریں کہربا کی بنی ہیں۔ چھت سیپ کی ہے۔ اور جب پانی محل پر سے گذرتا ہے۔ تو کھڑکیاں کھلتی اور بند ہوتی رہتی ہیں۔ یہ منظر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب سیپ کا منہ کھلتا ہے تو ہر سیپ میں چھپا ہوا موتی صاف صاف نظر آجاتا ہے۔ ایسا موتی جو کسی ملکہ کے تاج ہی کے لئے موزوں ہو؟

سمندر کا بادشاہ کئی سال سے رنڈوا ہو چکا تھا۔ گھر کا انتظام اس کی بوڑھی ماں کیا کرتی تھی، وہ ایک بہت ہی دانا عورت تھی۔ اور ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ خود اسے اس بات پر بے حد ناز تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ اپنی دم پر بارہ سیپیں پہنا کرتی تھی اور بھی کئی عورتیں اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن انہیں صرف چھ چھ سیپیں پہننے کی اجازت تھی۔ بہر حال وہ بہت ہی تعریف و توصیف کی مستحق تھی۔ خصوصاً اس لئے کہ وہ ننھی سمندری شہزادیوں کی، جو اس کی پوتیاں تھیں بڑی نگہداشت کیا کرتی تھی۔ یہ چھ خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی سب سے خوبصورت تھی۔ اس کا بدن گلاب کے پھول کی پتی کی طرح ملائم اور نازک تھا اور آنکھیں اتنی ہی نیلی تھیں جتنا عمیق تریں نیلا سمندر، لیکن اپنی دوسری بہنوں کے مانند اس کے بھی پاؤں نہیں تھے۔ اس کا پیکر ایک مچھلی کی دم پر ختم ہوتا

تھا۔

شہزادیاں دن بھر قلعے کے بڑے بڑے کمروں یا اُن زندہ پھولوں میں کھیلتی رہتیں جو دیواروں سے باہر اُگے ہوئے تھے۔ کہربا کی کھڑکیاں کھلی رہتیں۔ اور اُن میں مچھلیاں آ آکر یوں داخل ہوتیں جیسے جب ہم کھڑکیاں کھولتے ہیں تو ہمارے گھروں میں ابابیلیں آکر اُڑنے لگتی ہیں۔ فرق صرف یہی تھا کہ ابابیلیں تو ہم سے ڈرتی ہیں۔ لیکن مچھلیاں بلا خوف شہزادیوں کے پاس چلی جایا کرتیں۔ وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے اچھی اچھی چیزیں کھلاتیں اور ان کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرتیں۔ قلعے کے باہر ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس میں سُرخ رنگ کے چمکیلے اور گہرے نیلے رنگ کے پھول کھلے تھے۔ کلیاں آگ کے شعلوں کی ہمشکل تھیں اور پھل سونے کی طرح چمکدار۔ شاخیں اور پتیاں اِدھر اُدھر ہلتی رہتیں۔ زمین نفیس ترین ریت کی بنی تھی۔ اور گندھک کے جلتے ہوئے شعلے کی طرح نیلگوں تھی۔ ہر چیز سے انوکھی شان کی ایک دھیمی دھیمی روشنی لپٹی رہتی۔ جیسے اسے اوپر کی ہوا نے گھیر کر ہر چیز پر لا ڈالا ہو سمندر کی تاریک گہرائیوں کے باوجود نیلا آسمان یہاں سے چمکتا ہوا دکھائی دیتا۔ پرسکون موسم میں سورج ایک ایسے ارغوانی پھول کے مانند نظر آتا۔ جس کی کٹوری سے روشنی کی ایک نہر بہ رہی ہو۔

باغ میں ہر ننھی شہزادی کے لئے زمین کا ایک ایک ٹکڑا موجود تھا۔ وہ جب جی چاہے زمین کھود کر ان میں پودے لگا سکتی تھیں۔ کوئی اپنی پھولوں کی کھیتی وہیل مچھلی کی شکل میں بناتی اور کوئی اسے کسی ننھی جل پری کی شکل دیتی لیکن سب سے چھوٹی لڑکی کی کھیتی سورج کی طرح گول تھی۔ اس میں اس نے ڈوبتے سورج کی شعاعوں کے سے سُرخ پھول بو رکھے تھے۔ یہ ایک عجیب وغریب لڑکی تھی۔ خاموش طبیعت اور غور وفکر کرنے والی۔ اس کی بہنیں تو تباہ شدہ جہازوں کی عجیب وغریب چیزیں پا پا کر خوش ہوا کرتیں۔ لیکن اسے اپنے سُرخ آفتابی پھولوں یا ایک خوبصورت مرمریں مجسمے کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ تھی یہ مجسمہ ایک حسین لڑکے کا تھا۔ جو سنگ مرمر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ یہ کہیں کسی تباہ شدہ جہاز سے سمندر کی تہ میں آگرا تھا۔ ننھی شہزادی نے اس مجسمے کے قریب گلاب کے پھول کے رنگ کا بید مجنوں کا درخت لگا رکھا تھا۔ یہ نہایت شان سے بڑھا اور بہت جلد اس کی شاداب شاخیں مجسمے پر پھیل کر نیچے کی ریت کو چھونے لگیں۔ اس کا سایہ سُرخی مائل نیلا تھا۔ جو شاخوں کی طرح اِدھر اُدھر ہلتا رہتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ درخت کی چوٹی اور جڑ ایک دوسری کو چھیڑ رہی ہیں۔ یا ایک دوسری کا مُنہ چومنے کے لئے مضطرب ہیں ننھی شہزادی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ اوپر کی دنیا کے متعلق کچھ باتیں سُنے۔ وہ اپنی بوڑھی دادی سے جہازوں شہروں انسانوں اور جیوانوں

کے متعلق ہر وہ بات جو اسے معلوم ہوتی سُنا کرتی۔ اور اُسے یہ تصوّر بہت ہی خوشنما اور حیرت انگیز معلوم ہوتا کہ سمندر کے پھولوں میں خوشبو نہیں اور خشکی کے پھولوں میں خوشبو بھی ہے۔ جنگلوں کے درخت سبز ہوتے ہیں! اور وہاں کے درختوں کی مچھلیاں ایسے شیریں گیت گاتی ہیں کہ اگر کوئی انھیں سُن لے تو خوش ہو جائے۔۔۔۔۔ اس کی دادی پرندوں کو مچھلیاں کہتی تھی۔ اگر وہ نہ کہتی تو اس کی بات ننھی شہزادی سمجھ ہی نہ سکتی۔ کیونکہ اس نے کبھی پرندوں کو کب دیکھا تھا۔

ایک دفعہ اس کی دادی اس سے کہنے لگی "جب تم پندرھویں برس میں قدم رکھوگی تو میں تمھیں سمندر میں اوپر کو جانے کی اجازت دُوں گی۔ تم چاندنی میں اُن چٹانوں پر بیٹھ سکوگی۔ جن کے قریب سے بڑے بڑے جہاز گذر رہے ہوں گے اور پھر تم جنگل بھی اور شہر بھی دیکھ سکوگی۔"

آئندہ سال ایک بہن کی عمر پندرہ سال ہونے والی تھی۔ لیکن چونکہ ہر چھوٹی بہن اپنی بڑی بہن سے ایک ایک سال چھوٹی تھی۔ اس لئے سب سے چھوٹی کو اوپر سمندر میں آکر ہماری طرح زمین دیکھنے کے لئے ابھی پانچ سال اور انتظار کرنا تھا۔ تاہم ہر ایک نے دوسری سے وعدہ کر لیا کہ وہ باقی سب کو اپنے پہلے سفر کا حال سنائے گی اور بتائے گی کہ اسے کونسی چیز سب سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوئی ہے

کیونکہ ان کی دادی ان کو کافی باتیں نہ سُنا سکی تھی۔ کئی ایسی باتیں تھیں جن کے متعلق انھیں بہت کچھ اور معلوم کرنا تھا۔

اپنی باری کے لئے کوئی شہزادی اتنی مضطرب نہ تھی جتنی سب سے چھوٹی شہزادی جسے سب سے زیادہ انتظار کرنا تھا۔ اور جو اس قدر چپ چاپ اور سوچ بچار میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اکثر ہی راتوں کو وہ کھلی کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر گہرے نیلے پانیوں میں اوپر کی سمت دیکھا کرتی۔ یا ان مچھلیوں کا تماشا دیکھتی جو اپنے پنکھوں اور دُموں کو ہلاتی پانی اُچھالتی آگے نکل جایا کرتیں۔ اُسے چاند اور ستاروں کی ہلکی ہلکی جھلک نظر آتی۔ لیکن پانی میں یہ اُسے نسبتہً بڑے معلوم ہوتے۔ جب اس کے اور چاند تاروں کے درمیان کوئی سیاہ بادلوں کی سی شے حائل ہو جاتی۔ تو وہ سمجھ لیتی کہ یا تو کوئی وہیل مچھلی اوپر سے گذر رہی ہے۔ یا یہ کوئی انسانوں سے بھرا ہوا جہاز ہے۔ جنھیں مطلق خبر نہیں کہ ایک ننھی سی خوب صورت جل پری ان کے جہاز کے پیندے کی طرف اپنی گوری گوری بانہیں پھیلائے کھڑی ہے۔

جب سب سے بڑی بہن کی عمر پندرہ سال کی ہو گئی تو اسے سمندر کی سطح پر آنے کی اجازت مل گئی۔ جب وہ واپس گئی تو اسے صدہا باتیں سُنانی تھیں۔

وہ کہنے لگی" اوپر کی دنیا کی حسین ترین چیز یہ ہے کہ کوئی چاندنی میں خاموش پانیوں کے قریب کسی ریتیلے جزیرے پر لیٹ کر قریب کے شہر کی سمت دیکھتا رہے جہاں سینکڑوں ستاروں کی طرح روشنیاں جھلملاتی ہیں - یا وہاں کی موسیقی کے دِل نشیں نغموں، چلتی ہوئی گاڑیوں اور لاتعداد انسانوں کی آوازیں سُنے یا گرجاؤں کے میناروں سے نکلتی ہوئی سرود انگیز آواز سُن کر خوش ہو۔" چونکہ وہ ابھی ان حیرتناک چیزوں کے قریب نہ جاسکتی تھی۔ اس لئے اس کے دِل میں ان کے دیکھنے کی پہلے سے بھی زیادہ خواہش پیدا ہوگئی۔

سب سے چھوٹی بہن ان تمام باتوں کو نہایت توجہ سے سُنا کرتی - بعد میں وہ کھلی کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوتی اور گہرے نیلے پانیوں میں سے اوپر کو دیکھتی اور بڑے شہروں اور وہاں کے رہنے والوں کی دوڑ دھوپ اور ان کی آوازوں کے متعلق سوچا کرتی۔ تصور ہی تصوّر میں سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں میں بھی اسے گرجاؤں کی گھنٹیوں کی آواز آنے لگتی۔

آئندہ سال دوسری لڑکی کو بھی سطح بحر پر ابھر کر اپنی مرضی سے ہر جگہ سیر کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ اسوقت اوپر آئی جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دیکھتے ہی بول اٹھی "یہی خوبصورت ترین نظارہ ہے۔"

اس وقت تمام آسمان پر سونے کا برادہ بکھر رہا تھا۔ اور ادھر ادھر سُرخی مائل نیلے رنگ کے بادل تیر رہے تھے وہ حیران تھی کہ یہ کیا ہے۔ بادلوں سے بھی زیادہ تیز رفتار سے جنگلی بطخوں کا ایک بڑا جھنڈ آسمان کے آرپار ایک لمبی سی سفید چادر کی طرح اُڑتا ہوا ڈوبتے سورج کے قریب پہنچکر غائب ہو گیا۔ وہ بھی سورج کی سیدھ میں تیرنے لگی۔ لیکن افسوس یہ لہروں میں غروب ہو گیا اور بادلوں کے خوبصورت رنگ بھی غائب ہو گئے۔

اب تیسری بہن کی باری آئی۔ وہ ان سب سے زیادہ بہادر تھی۔ وہ ایک ایسے چوڑے دریا میں جا تیری جو سمندر میں آکر گرتا تھا۔ سمندر کے کنارے پہاڑیوں اور انگور کی بیلوں سے ڈھکے پڑے تھے۔ محلات اور قلعوں کی چوٹیاں جنگل کے بلند درختوں سے اوپر اچھل کر جھانک رہی تھیں۔ پرندے چہچہا رہے تھے سورج کی شعاعوں میں اس قدر تمازت تھی کہ ہر گھڑی غوطہ لگا کر اسے اپنے تپتے ہوئے گال ٹھنڈے کرنے پڑتے۔ اس نے دیکھا کہ ایک تنگ سی خلیج میں بالکل ننگے انسانی بچوں کا ایک پورے کا پورا گروہ پانی میں کھیل رہا ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ بھی ان سے کھیلے لیکن وہ اسے دیکھتے ہی خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ پھر ایک چھوٹا سا کالا جانور پانی میں اُتر آیا۔ یہ ایک کتا تھا۔ لیکن وہ نہ سمجھی کہ یہ کیا ہے؟

کیونکہ اس نے پہلے کبھی کوئی کتا نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اس قدر خوفناک آواز میں بھونکا کہ وہ ڈر کر جلدی سے کھلے سمندر میں غوطہ لگا گئی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس خوبصورت جنگل ان سبز سبز پہاڑیوں اور خوبصورت بچّوں کو جو مچھلیوں کی سی دُمیں نہ ہونے کے باوجود تیر سکتے تھے کبھی نہ بھولوں گی ۔

چوتھی بہن ذرا زیادہ بزدل تھی۔ وہ سمندر کے وسط ہی میں رہی اس کا خیال تھا کہ سمندر بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا اس کا ساحل۔ وہ اپنے ارد گرد میلوں تک نظریں دَوڑا سکتی تھی۔ اوپر آسمان شیشے کی کٹوری کی طرح نظر آتا تھا اس نے جہاز بھی دیکھے لیکن اتنی دور سے کہ وہ اُسے بالکل بحری بگلے معلوم ہوئے۔ بڑی بڑی مچھلیاں لہروں میں چُہلیں کرتی پھرتی تھیں اور بڑی بڑی وہیل مچھلیاں اپنے نتھنوں سے یُوں پانی اچھال رہی تھیں جیسے یک دم سینکڑوں فوارے چھوٹ پڑے ہیں ۔

پانچویں بہن نے سرما میں جنم لیا تھا۔ سو جب اس کی باری آئی تو اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو اس کی دوسری بہنیں نہیں دیکھ سکی تھیں ۔ سمندر بالکل سبز معلوم ہوتا تھا۔ اور برف کے بڑے بڑے تودے تیرتے پھرتے تھے۔

بھر ایک موتی کی طرح چمکدار تھا۔ لیکن انسان کے بنائے ہوئے گرجاؤں سے زیادہ بڑا اور زیادہ اونچا۔ ہر ایک کی شکل بڑی انوکھی تھی۔ وہ ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے شہزادی برف کے ایک بڑے سے تودے پر بیٹھ گئی۔ اور ہوا اس کے لمبے لمبے بالوں سے کھیلنے لگی۔ وہ دل میں کہنے لگی "یہ سب جہاز سمندر کے "برفانی پہاڑوں" سے اتنی تیزی سے اور اتنا دور دور رہ کر گذرتے ہیں جیسے یہ ان سے خوف زدہ ہیں!"

شام کے وقت جب سورج ڈوب گیا تو کالے کالے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ بادل کی غضب ناک گرج سُنائی دینے لگی اور بجلی تھر تھری تڑپ تڑپ کر چمک چمک کر آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی سسکیاں لیتے ہوئے سمندر میں اچھلتے جھولتے برفانی تودوں پر سُرخ روشنیاں جھلملانے لگیں۔ تمام جہازوں کے کانپتے ہوئے بادبان خوف زدہ ہو کر سمٹ جاتے لیکن وہ تیرتے ہوئے برفانی تودے پر مطمئن بیٹھی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی ۔ ہر آن نیلا ہٹوں میں سے کود کود کر بجلی آگے کو جھانکتی اور اپنے چمکتے ہوئے تیر و نشتر سمندر کے سینے میں بھونک دیتی۔

جب پہلے پہل ان بہنوں کو سطح بحر پر آنے کی اجازت ملی تھی۔ تو ان میں

سے ہر ایک ان نئی نئی خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ جوان ہو گئی تھیں۔ اپنی مرضی سے ادھر آسکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اب ان نظاروں کی پروا نہ رہی تھی۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ پھر پانیوں میں چلی جائیں۔ جب ایک مہینہ گذر گیا تو وہ کہنے لگیں "اونہہ! اس سے تو نیچے ہی رہنا اچھا ہے۔ ہمارا وطن بدرجہا خوبصورت اور زیادہ دلکش ہے۔" تاہم شام کے وقت پانچوں بہنیں ایک دوسری کے بازوؤں میں بازو ڈالے ایک قطار بنا کر سطح بحر پہ آیا کرتیں۔ ان کی آوازیں انسانی آوازوں سے کہیں زیادہ دلکش تھیں۔ کسی طوفان کے آنے سے پہلے جب انھیں کسی جہاز کے ڈوبنے کا انتظار ہوتا وہ جہاز کے سامنے آ آ کر ان عجیب و غریب چیزوں کی تعریف میں گیت گایا کرتیں جو انھیں جلد ہی سمندر کی گہرائیوں سے ملنے والی ہوتیں۔ یا نہایت ملتجیانہ انداز سے گیت گا گا کر جہاز رانوں سے کہتیں "مت ڈرو! مت ڈرو! سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے مت ڈرو۔" لیکن جہاز ران ان کے گیت کیا سمجھتے۔ وہ خیال کرتے یہ طوفان کا شور و شغب ہے۔ ان لڑکیوں کو یہ عجیب و غریب چیزیں کبھی نہ ملتیں۔ کیونکہ جب جہاز ٹوٹتا اور آدمی ڈوب جاتے تو صرف ان کی لاشیں شاہ بحر کے محل تک پہنچ سکتیں۔

جب یہ بہنیں بازوؤں میں بازو ڈال کر اس انداز سے پانیوں میں سے ہوتی ہوئی اوپر آیا کرتیں سب سے چھوٹی بہن وہیں اکیلی کھڑی رہ جاتی وہ نہایت بے بسی سے ان کی طرف دیکھتی اور اس کی چیخیں نکلتے نکلتے رہتیں۔ جل پریوں کے آنسو نہیں ہوتے کہ وہ روئیں اور اس وجہ سے انھیں کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوا کرتی ہے وہ کہتی "کاش میں پندرہ سال کی ہو جاؤں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ مجھے اوپر کی دنیا اور اس کے تمام لوگ کتنے اچھے لگیں گے"۔

آخر وہ بھی پندرہ سال کی ہو گئی۔ بڑھیا رانڈ اس سے کہنے لگی۔ "اچھا اب تم جوان ہو گئی ہو آؤ اب تمھیں بھی میں تمھاری دوسری بہنوں کی طرح آراستہ کروں۔

چنانچہ اس نے چھوٹی جل پری کے بالوں میں نرگس کے سفید پھول گوندھ دیئے۔ جن کی ہر پتی تقریباً ایک موتی تھی۔ اور پھر حکم دیا کہ اُس کی دُم میں آٹھ بڑی بڑی سیپیں باندھی جائیں۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کا خاندان عالی مرتبہ ہے"۔

چھوٹی جل پری کہنے لگی۔ "لیکن یہ تو مجھے تکلیف دیتی ہیں!"

بوڑھی خاتون نے جواب دیا "پر عظمت بننے کے لئے تکلیف برداشت کرنی ضروری ہوتی ہے۔"

. . . .

اگر ننھی جل پری کے اختیار میں ہوتا تو خوشی سے یہ تمام سنگھار کی چیزیں جھٹک کر پھینک دیتی اور یہ بوجھل ہار اتار کر پرے رکھ دیتی۔ کیونکہ اسے اپنے باغ کے سرخ سرخ پھول بہت زیادہ بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ مجبور تھی چنانچہ وہ "خدا حافظ" کہہ کر ایک بلبلے کی طرح نہایت لطافت سے سطح پر آگئی۔ اس نے اپنا سر لہروں سے اوپر بلند کیا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ بادل قرمزی اور سنہری رنگوں سے رنگین ہو چکے تھے۔ پرسکون سمندر کی حدود کے پار شفق کی تمتماہٹ میں شام کا تارا اپنی پوری دلکشی کے ساتھ چمکتا ہوا نکل آیا تھا ہوا نرم و نازک اور تازہ تھی۔ تین مستولوں والا ایک جہاز سطح بحر پر ساکن کھڑا تھا۔ اس کا صرف ایک بادبان کھلا تھا۔ کیونکہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آتا تھا۔ ملاح نہایت سستی سے عرشۂ جہاز پر بیٹھے تھے۔ موسیقی اور گیتوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ جب اندھیرا چھا گیا تو جہاز پر رنگ رنگ کی صدہا مشعلیں جلنے لگیں یوں معلوم ہونے لگا جیسے تمام قوموں کے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ چھوٹی جل پری جہاز کے ایک کمرے کی کھڑکیوں کے قریب آکر تیرنے لگی۔ ہر وقفے کے بعد جب لہریں اسے اوپر اٹھا لیتیں وہ کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانک کر خوش پوشاک لوگوں پر ایک نظر ڈال لیتی۔ ان لوگوں میں ایک نوجوان شہزادہ

بھی تھا جو سب سے زیادہ حسین تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ رنگ کی تھیں۔ عمر سولہ سال تھی۔ اس وقت اس کی سالگرہ کا جشن بڑی مسرت سے منایا جا رہا تھا۔ ملاح فرطِ مسرت سے عرشۂ جہاز پر ناچ رہے تھے۔ جب شہزادہ کمرے سے باہر آیا تو یکدم ہوا میں سینکڑوں ہوائیاں چھوڑ دی گئیں۔ اور فضا دن کی طرح روشن ہو گئی۔ چھوٹی جل پری اتنا ڈری کہ اس نے فوراً پانی میں غوطہ لگا دیا۔ اور جب اس نے پھر اپنا سر باہر نکالا تو اُسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے گرد آسمان کے ستاروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس نے پہلے کبھی یہ نظارہ نہ دیکھا تھا۔ بڑی بڑی توپیں اپنے منہ سے اُگل اُگل کر آگ باہر پھینک رہی تھیں۔ اور نیلی نیلی ہواؤں میں شاندار جگنو سے اُڑ رہے تھے۔ صاف و شفاف سمندر میں گہرائیوں تک ان سب کا عکس پڑنے لگا۔ خود جہاز اس قدر تیزی سے چمک رہا تھا کہ تمام لوگ بلکہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہایت آسانی سے صاف صاف نظر آنے لگی۔ اس وقت شہزادہ بھی بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رات کی شفاف ہوا میں مطربوں کے نغمے ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ اور شہزادہ ہر ایک سے ہاتھ ملا کر مسکرا رہا تھا۔

بہت دیر ہو چکی تھی۔ لیکن اب بھی چھوٹی جل پری جہاز سے یا شہزادے

سے نظروں پرے، نہ ہٹا سکتی تھی۔ رنگ برنگ کی بتیاں اب بجھ گئیں۔ اب کوئی
ہوائی فضا میں نہیں چھوٹتی تھی۔ توپیں بھی اب نہیں چل رہی تھیں۔ البتہ سمندر بیتاب
ہو چکا تھا۔ اور لہروں کے نیچے سے نالوں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن
اب بھی چھوٹی جل پری پانیوں میں دھکے کھاتی ہوئی جہاز کے قریب ہی تھی۔ اب
بھی وہ کبھی کبھی اندر جھانک سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یکایک جہاز کے بادبان
تن گئے اور پُر عظمت جہاز نے اپنا راستہ لے لیا۔ لیکن بہت جلد لہریں زیادہ
بلند ہو کر اُٹھنے لگیں۔ تاریک بادلوں نے آسمان کا چہرہ سیاہ کر ڈالا۔ دُور سے
کبھی بجلی کی چھوٹی چھوٹی جھلکیاں بھی نظر آ جاتیں۔ ایک وحشت ناک طوفان کی
آمد آمد تھی۔ ایک دفعہ پھر بادبانوں کا پھیلاؤ ذرا کم کر دیا گیا اور عظیم الہیئت جہاز
غضب آلودہ سمندر میں اپنا راستہ چیرتا اُڑتا جھپٹتا شدت کی تیزی سے آگے
بڑھنے لگا۔ لہریں پہاڑ بن گئیں۔ جیسے یہ ابھی ابھی مستولوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر
جا پہنچیں گی۔ جہاز ان کے درمیان راج ہنس کی طرح ڈبکیاں لگانے لگا۔ بار بار
کف آلودہ بلند لہروں کے ہجوم میں اوپر ابھر آتا۔ چھوٹی جل پری کو یہ سب کچھ
ایک دلچسپ کھیل معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن ملّاحوں کو نہیں۔ آخر کار جہاز ایک
چیخ کی سی آواز پیدا کرتا ہوا ٹوٹ گیا۔ لہروں کے تھپیڑوں نے عرشۂ جہاز کو چکنا چور

کر دینے کے بعد جہاز کے باقی موٹے موٹے تختوں کو بھی توڑ ڈالا۔ سب سے بڑا مستول نے کی طرح ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جہاز اپنے پہلو پر گرا اور پانی جھپٹ کر اس کے اندر جا داخل ہوا۔ چھوٹی جل پری نے دیکھا۔ کہ جہاز کے لوگ خطرے میں ہیں۔ اسے خود بھی شہتیروں اور تختوں کی زد سے بچنے کے لئے جو ادھر اُدھر ہچکولے کھا رہے تھے۔ ذرا ہوشیار ہونا پڑا۔ ایک لمحے کے لئے تو اتنی سخت تاریکی چھا گئی کہ اس کی نظروں سے ایک ایک چیز اوجھل ہو گئی۔ لیکن دفعتہً بجلی کے چمکنے سے تمام نظارہ روشن ہو گیا اور اسے شہزادے کے سوا جہاز کا ایک ایک فرد نظر آگیا۔ جب جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا چھوٹی جل پری نے اسے گہری لہروں میں ڈوبتے دیکھا تھا۔ اور بہت خوش ہوئی تھی کہ اب وہ اس کے ساتھ رہا کرے گا۔ لیکن اب اسے یاد آگیا کہ انسان تو پانیوں میں نہیں زندہ رہ سکتے۔ جب وہ اس کے باپ کے محل تک پہنچے گا تو وہ بالکل مر چکا ہو گا۔

"میں ہر گز اسے مرنے نہ دوں گی" اس نے شہتیروں اور تختوں کے درمیان جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے تیرنا شروع کیا۔ وہ بالکل بھول گئی کہ یہ شہتیر اور تختے اس کے پرخچے اُڑا سکتے ہیں۔ اس نے تاریک پانیوں کی گہرائیوں میں غوطہ

لگیا۔ لہریں کبھی اسے اوپر لے جانے کی کوشش کرتیں کبھی نیچے۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح وہ نوجوان شہزادے کے قریب پہنچ ہی گئی۔ جس کی طاقت اسے اس طوفان زدہ سمندر میں تیرنے سے جواب دے چکی تھی۔ اس کے اعضاء بے حس تھے اور اس کی خوبصورت آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ مر چکا ہوتا اگر چھوٹی جل پری اس کی مدد کو نہ آجاتی۔ اس نے اس کا سر پانی سے اوپر بلند کیا اور پھر اس کو اور اپنے آپ کو لہروں پر چھوڑ دیا کہ جہاں چاہیں انھیں بہائے جائیں۔

صبح ہوگئی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ لیکن جہاز کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔ افق کی سرحد کے قریب سُرخ سورج چمکتا ہوا پانیوں میں سے نکل آیا۔ اس کی شعاعیں شہزادے کے گالوں پر صحت کا اصلی رنگ واپس لے آئیں۔ لیکن ابھی اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ چھوٹی جل پری نے اس کی نرم ونازک کشادہ پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اس کے بھیگے ہوئے بال پیچھے کی طرف ہٹائے۔ اسے وہ سنگ مرمر کے اس مجسمے کا ہمشکل معلوم ہو رہا تھا۔ جو اس کے چھوٹے سے باغ میں پڑا تھا اس نے بار بار اس کا منہ چومنا شروع کیا اور اس کا دل پہلے سے بھی زیادہ اس کے زندہ رہنے کی تمنا کرنے لگا۔ اس دوران میں اسے خشکی نظر پڑی۔ دور آسمانی رنگ کے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ ان پر سفید سفید برف اس طرح معلوم ہو رہی تھی جیسے

وہاں راج ہنسوں کے گروہ بیٹھے ہوں۔ ساحل کے نزدیک خوبصورت اور سرسبز جنگل نظر آرہے تھے۔ قریب ہی ایک بڑی سی عمارت کھڑی تھی۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ یہ کوئی گرجا ہے یا خانقاہ۔ باغ میں نارنگی اور گلگل کے درخت لگے تھے اور دروازے کے سامنے بڑے بڑے اونچے قد کے کھجوروں کے درخت۔ یہاں سمندر ایک چھوٹی سی خلیج بن کر رہ جاتا تھا جس میں پانی بالکل ساکن۔ لیکن بہت گہرا تھا۔ سو وہ حسین شہزادے کو لے کر ساحل تک تیرتی آئی۔ جس پہ ہر سمت سفید سفید ریت بچھی تھی۔ وہیں اس نے اسے خوشگوار دھوپ میں لٹا دیا۔ لیکن اس طرح کہ اس کا سر اس کے جسم سے ذرا اوپر اٹھا رہے۔ تھوڑی دیر بعد اس بڑی سی سفید عمارت میں گھنٹیاں بجنے لگیں اور بہت سی نوجوان لڑکیاں باغ میں آگئیں۔ چھوٹی جل پری تیر کر ساحل سے چلی گئی۔ اور چند اونچی اونچی چٹانوں پر جو سطح بحر سے باہر نکلی ہوئی تھیں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے چہرے اور گردن پر سمندر کا جھاگ مل لیا تاکہ اس کا ننھا سا چہرہ دکھائی نہ دے سکے اور انتظار کرنے لگی کہ دیکھیں بیچارے شہزادے کا کیا حشر ہوتا ہے۔

اسے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ جلد ہی ایک لڑکی اُدھر آنکلی، جہاں شہزادہ پڑا تھا پہلے پہل تو وہ ڈر گئی، لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ اس کے

بعد وہ جاکر اپنے ساتھ اور بھی بہت سی سہیلیوں کو وہاں لے آئی۔ جل پری نے دیکھا کہ شہزادہ پھر زندہ ہو گیا ہے۔ اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ لیکن اس کی طرف دیکھ کر وہ ایک مرتبہ بھی نہ مسکرایا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی جان ایک جل پری نے بچائی ہے۔ اس بات نے اسے بہت ہی مغموم کر دیا اور جب وہ لوگ اسے اس بڑی عمارت میں لے گئے۔ تو وہ شدّت غم سے پھر پانی میں غوطہ لگا کر اپنے باپ کے محل کو واپس آگئی۔

وہ ہمیشہ سے چپ چاپ اور فکر مند رہا کرتی تھی۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ وقت سوچ بچار میں گذارنے لگی۔ اس کی بہنوں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنے پہلے سفر میں کیا کیا دیکھا ہے لیکن اس نے انھیں کچھ نہ بتایا۔ اکثر ہی صبح اور شام وہ اُس جگہ جایا کرتی۔ جہاں اُسنے شہزادے کو چھوڑا تھا۔ باغ میں پھل آچکا تھا۔ بلکہ اب اسے توڑ بھی لیا گیا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف پگھل چکی تھی۔ لیکن شہزادہ اسے کبھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہمیشہ پہلے سے بھی زیادہ مغموم ہو کر گھر چلی آتی اس کے غم کو سب سے زیادہ آرام اس بات میں ملتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے باغ میں بیٹھی رہے اور اس خوبصورت مرمریں مجسمے کے گرد اپنے بازو حمائل کر دے جو بالکل شہزادے کا ہم شکل تھا۔ اب اس نے اپنے پھولوں کی خبر لینی بھی

چھوڑ دی تھی۔ پھولوں کے پودے بڑی بے ترتیبی سے ادھر اُدھر پھیل کر راستوں پر بھی اُگ آئے تھے۔ ان کے پودوں کے لمبے لمبے پتّے اور تنے درختوں کے گرد لپٹ گئے تھے۔ تمام باغ تاریک اور اُداس اداس نظر آتا تھا۔ وہ اپنے سینے میں زیادہ دیر تک محبت کے جذبات نہ چھپا سکی۔ آخر کار اس نے اپنی ایک بہن کو تمام واقعہ سُنا دیا۔ دوسری بہنوں نے بھی یہ راز سُن لیا۔ بہت جلد یہ بات دوسری جل پریوں نے بھی سن لی جن کی ایک سہیلی جانتی تھی کہ شہزادہ کون ہے اس نے بھی عرشۂ جہاز پر اس جشن کا نظارہ دیکھا تھا۔ اس جل پری نے انھیں بتا دیا کہ شہزادہ کہاں سے آیا تھا اور اس کا محل کدھر ہے۔

"آؤ چھوٹی بہن" کہہ کر دوسری شاہزادیوں نے ایک دوسری کے بازوؤں میں بانہ ڈال دیئے اور ایک لمبی قطار بنا کر سطح بحر پر ابھر آئیں۔ اس جگہ کے بالکل قریب جہاں ان کے خیال میں شہزادے کا محل کھڑا تھا۔ محل زرد رنگ کے ایک نہایت ہی چمکیلے پتھر کا بنا تھا۔ جس کے زینے میں لمبی لمبی سیڑھیاں تھیں۔ ایک سیڑھی تو بالکل پانی کو چھو رہی تھی چھتوں پر شاندار سنہرے گنبد نظر آرہے تھے ادہ ستونوں کے درمیان جنھوں نے تمام عمارت کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا مرمر کے مجسمے کھڑے تھے جو بالکل زندہ معلوم ہوتے تھے بلند کھڑکیوں

کے بلوریں شیشوں میں سے عالی شان کمرے جن میں بیش قیمت پردے لٹکے تھے نظر آرہے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں لٹکی تھیں جنھیں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ سب سے بڑے کمرے کے مرکز میں ایک فوّارہ چل رہا تھا جس کی کرنوں کی سی شوخ اور چمکیلی دھاریں بلند ہو ہو کر گُنبد کو چھو رہی تھیں ادھر سورج کی شعاعیں بلوریں گنبد سے چھن چھن کر فوارے کے پانی اور ارد گرد اُگے ہوئے خوش نما سبزے سے کھیل رہی تھیں۔

اب چونکہ جل پری کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اس نے بہت سے دن اور بہت سی راتیں محل کے قریب ہی گذار دیں ۔ وہ ساحل کے بہت نزدیک آآکر تیرا کرتی اتنا نزدیک آ کر جتنا نزدیک آنے کی پہلے کبھی کسی جل پری کو جرأت نہ ہوئی تھی۔ اور ایک دفعہ تو وہ درحقیقت تنگ خلیج کے اندر اس مرمریں برآمدے کے نیچے تک آگئی جس کا چوڑا سا سایہ پانی پر پڑ رہا تھا۔ اب یہیں بیٹھ کر وہ شہزادے کی طرف دیکھا کرتی۔ شہزادہ سمجھتا کہ اس نورانی رات میں اس وقت میں یہاں بالکل تنہا ہوں لیکن جل پری بارہا شام کے وقت اسے لہراتے ہوئے جھنڈوں والی خوبصورت کشتی میں جس میں اسکے ساتھ والے گانا سننے میں مشغول ہوتے تھے سمندر کی سیر کرتے دیکھ چکی تھی اس

وقت وہ سبز ناگر موتھے کے پردوں سے باہر نکل آتی ۔ اور اگر ہوائیں اس کی لمبی سی سیمین نقاب کو پکڑ کر کھینچتیں تو لوگ دُور سے دیکھ کر سمجھتے کہ کوئی راج ہنس پر پھیلائے بیٹھا ہے۔ اکثر ہی راتوں کو جب مچھیرے اپنی اپنی مشعلیں لے کر خشکی سے سمندر میں نکلتے ، اور شہزادے کے کارناموں کی داستانیں سناتے تو وہ انھیں بڑی توجہ سے سُنا کرتی ۔ وہ یہ یاد کر کر کے خوش ہوا کرتی کہ مَیں نے اس وقت اس کی جان بچائی تھی جب وہ نیم مُردہ ہو کر لہروں میں ہچکولے کھاتا پھرتا تھا۔ اس کا سر میرے سینے سے چھو چکا ہے اور میں کس طرح دِل کھول کر اس کے بوسے لے چکی ہوں۔ لیکن شہزادے کو ان باتوں کا کچھ علم نہ تھا۔ بلکہ اسے تو خوابوں میں بھی کبھی وہ دکھائی نہ دی تھی ۔

اب جل پری کے دِل میں انسانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ اُنس پیدا ہونے لگا۔ اس کا دِل اس دنیا کی سیر کا اور بھی آرزومند رہنے لگا جو اس کی دنیا سے اتنی زیادہ بڑی نظر آتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی انسان جہازوں میں بیٹھ کر سمندروں پر اُڑتے پھرتے تھے اور ان بلند پہاڑیوں پر بھی چڑھ سکتے تھے۔ جو کہیں بادلوں سے بھی بہت زیادہ اونچی تھیں ۔ ان کی زمینیں ان کے جنگل اور ان کے کھیت حد نظر سے بھی پرے دُور دور تک پھیلے

تھے۔ کتنی ہی باتیں تھیں جو وہ جاننا چاہتی تھی۔ اس کی بہنیں اس کے تمام
سوالوں کا جواب نہ دے سکتی تھیں۔ اس وقت وہ اپنی دادی کی طرف رجوع
کیا کرتی جو اوپر کی دنیا کے متعلق سب کچھ جانتی تھی اور اسے سمندر کے اوپر کے
حصے کی زمین کہا کرتی۔

ایک دن جل پری اپنی دادی سے پوچھنے لگی کہ "اگر انسان نہ ڈوبیں
تو کیا پھر وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ کیا وہ اس طرح نہیں مرتے جیسے ہم لوگ
سمندروں میں مر جاتے ہیں"۔

بوڑھی دادی کہنے لگی "نہیں۔ وہ بھی مر جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی عمریں ہماری
عمروں سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ ہم لوگ تو بعض دفعہ تین تین سو سال تک
زندہ رہتے ہیں۔ لیکن جب یہاں ہمارا خاتمہ ہو جاتا ہے تو ہم سطح بحر پر جھاگ
بن کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ یہاں تو ان لوگوں کی قبریں بھی نہیں ہوتیں جن سے ہم
محبت کر چکے ہوتے ہیں۔ ہماری روحیں فانی ہیں۔ ہم پھر کبھی نہیں جئیں گے
بلکہ سمندر کی کٹی ہوئی سر سبزی کی طرح تباہ ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس
انسانوں کی روح ہوتی ہے۔ جو فنا نہیں ہوتی۔ جب ان کے جسم خاک بن جاتے
ہیں۔ تو ان کی روح زندہ رہتی ہے۔ یہ صاف اور دھلی ہوئی ہواؤں میں سے

ہوتی ہوئی اوپر چمکتے ستاروں سے بھی پرے چلی جاتی ہے جیسے ہم پانی کی سطح پر ابھر کر خشکی کے نظارہ پر نگاہ ڈالتے ہیں بالکل اسی طرح روحیں اوپر بلند ہو کر وہاں کا عجیب وغریب نظارہ دیکھتی ہیں جو ہم لوگ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

چھوٹی جل پری نہایت غمگیں ہو کر کہنے لگی "ہماری روح بھی کیوں غیر فانی نہیں؟ میں بخوشی اپنی عمر کی تمام صدیاں صرف ایک دن انسان بننے کے لئے دے دوں گی تاکہ مجھے بھی ستاروں سے پرے کی عالی شان دنیا دیکھنے کی امید ہو"۔

بوڑھی جل پری کہنے لگی "تمھیں ایسی باتوں کا خیال نہیں کرنا چاہئے ہم انسانوں سے زیادہ خوش اور زیادہ بہتر حالت میں ہیں"۔

چھوٹی جل پری بولی "تو کیا میں مر جاؤں گی؟ نہ لہروں کی موسیقی سن سکوں گی۔ نہ خوبصورت پھول دیکھ سکوں گی۔ نہ لال لال سورج؟ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں جس سے میری روح بھی غیر فانی ہو جائے"۔

بوڑھی اماں کہنے لگی "یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ کوئی انسان تم سے اتنی محبت نہ کرنے لگ جائے کہ تم اس کے دل کی تنہا مالک بن جاؤ۔ یہاں تک کہ اس کے ماں باپ سے بھی زیادہ پیاری ہو جاؤ۔ اس

کے تمام خیالات اور تمام محبت تم پر مرکوز ہو جائے۔ اور پادری اس کا دایاں ہاتھ تمھارے دائیں ہاتھ میں دے دے اور وہ آدمی تم سے وعدہ کیے کہ وہ اس وقت بھی اور بعدازاں بھی تم سے سچی محبت کرتا رہے۔ ایسا کرنے سے اس آدمی کی روح تمھارے جسم میں آجائے گی۔ پھر تم انسانوں کی آئندہ خوشیوں میں حصہ لینے لگو گی" وہ "تمھیں بھی روح دے دے گا۔ اور اس کے جسم میں بھی برقرار رکھے گا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمھاری "مچھلی کی دم" جسے ہم سب اتنا خوبصورت سمجھتے ہیں۔ زمین پر بہت بدصورت چیز سمجھی جاتی ہے۔ کوئی ٹھیک بات تو انھیں معلوم ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خوبصورتی کے لئے دو موٹے ڈنڈے بہت ضروری ہیں جنھیں وہ ٹانگیں کہتے ہیں۔"

جل پری ایک آہ بھر کر نہایت غمناک نگاہوں سے اپنی مچھلی کی دم کی طرف دیکھنے لگی۔ بوڑھی اماں نے کہا۔ آؤ خوشی منائیں اور اس تین سو سال کے عرصے میں جو ہمیں زندہ رہنے کے لئے دیا گیا ہے اٹکھیلیاں کر لیں ناچ کود لیں اور درحقیقت زندہ رہنے کے لئے یہ مدت کافی ہے۔ اس کے بعد ہمارا حشر جو کچھ ہو گا ہو جائے وہی ہمارے لئے بہتر ہو گا۔ آج شام ہم ایک درباری رقص میں حصہ لینے جا رہے ہیں۔

یہ ان نظاروں میں سے ایک نظارہ تھا جو ہم زمین پر کبھی نہیں دیکھ سکتے
رقص کے وسیع کمرے کی دیواریں اور چھت موٹے لیکن شفاف بلّور کے بنے
تھے۔ سینکڑوں دیو قامت صدف کچھ گہرے سُرخ رنگ کے اور کچھ گھاس
کے سبز رنگ کے قطاریں باندھے ہر طرف موجود تھے اور ان میں ایک ایسی نیلی
روشنی جگمگا رہی تھی۔ جس نے تمام کمرے کو منوّر کر رکھا تھا۔ بلکہ تمام سمندر میں
بھی چکا چوند پیدا ہو رہی تھی۔ لاتعداد مچھلیاں بڑی اور چھوٹی بلّور کی دیواروں
کے قریب دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے پروں میں ارغوانی
روشنی کی جھلکیاں نظر آرہی تھیں۔ اور بعض کے پر سونے اور چاندی کی طرح
دمک رہے تھے۔ ایک چوڑی سی ندی بڑے بڑے کمروں میں سے ہوتی ہوئی
بہی جا رہی تھی۔ کنواری اور بیاہی ہوئی جل پریاں اور ان کے شوہر سب
اپنی ہی موسیقی کے تال پر رقص کر رہے تھے۔ ان سب کی آوازیں اتنی شیریں
تھیں جتنی زمین پر کبھی کسی کی نہیں ہوئیں۔ ننھی جل پری ان سب سے زیادہ
شیریں آواز کے ساتھ گا رہی تھی۔ تمام مجلس تالیاں بجا بجا کر اور اپنی دُمیں ہلا
ہلا کر اسے داد دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے خود اس کا دل بھی بے انتہا
مسرور ہو گیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نہ تو زمین پر اور نہ سمندر میں مجھ جیسی شیریں

آواز کسی کی ہے۔ لیکن فوراً ہی اسے پھر اوپر کی دنیا کا خیال آگیا کیونکہ اس کے دل سے من موہنے شہزادے کی یاد جاتی ہی نہ تھی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی غم تھا کہ میری بھی روح کیوں "اُس" کی طرح غیر فانی نہیں۔ سو وہ چپکے سے اپنے باپ کے محل سے کھسک آئی۔ ادھر محل میں مسرتوں کا ایک طوفان بپا تھا اور ادھر وہ اپنے باغ میں اکیلی غمگین بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پانی میں بگل کی آواز سُنی اور اس نے سوچ لیا کہ یقیناً شہزادہ کشتی میں بیٹھا آرہا ہے، وہ شہزادہ جو میری آرزوؤں کا مرکز ہے۔ اور جس کے ہاتھوں میں میں اپنی زندگی کی تمام خوشیاں دے دینا چاہتی ہوں۔ میں اس کے لئے مشکل سے مشکل بات کر گذروں گی۔ میں ضرور غیر فانی روح حاصل کر دوں گی میری بہنیں محل میں رقص کر رہی ہیں لیکن میں سمندر کی جادوگرنی کے پاس جاتی ہوں جس سے ہمیشہ میں خوف زدہ سی رہتی ہوں۔ وہ مجھے مدد اور کوئی مشورہ ضرور دے گی۔

اور پھر جل پری اپنے باغ سے باہر نکلی اور اس سڑک پر ہولی جو منہ میں کف لاتے ہوئے گردابوں کی سمت جاتی تھی۔ اور جس کے پار جادوگرنی کا گھر تھا۔ وہ پہلے کبھی ایسی جگہ نہیں گئی تھی۔ نہ تو وہاں پھول اُگے تھے نہ گھاس

بلکہ ہر طرف چٹیل بھوری اور ریتلی زمین پھیلی تھی۔ وہاں کے پانیوں میں گرداب پن چکیوں کے کف آلودہ پہیوں کی طرح گھومتے ہر چیز کو اپنے آپ میں سمیٹتے اتھاہ سمندر کی گہرائیوں تک لے جاتے تھے۔ جادوگرنی کی مملکت تک پہنچنے کے لئے اسے ان پیس ڈالنے والے گردابوں میں سے گذرنا پڑا۔ بہت فاصلے تک یہ سڑک بلبلے پیدا کرنے والی گرم گرم کیچڑ سے گذرتی تھی۔ اس علاقے کو یہ جادوگرنی "میری نباتاتی دلدلیں" کہا کرتی تھی۔ اس سے پرے ایک عجیب و غریب جنگل کے مرکز میں اس کا مکان کھڑا تھا۔ یہاں کے تمام درخت اور پھول جاندار تھے۔ آدھے درخت اور آدھے حیوان۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے سروں والے عفریت زمین میں اُگے ہوئے ہیں۔ ٹہنیاں ان کے لمبے لمبے پتلے پتلے بازو تھے اور اُنگلیاں لچکدار کیچوؤں کی طرح ان درختوں کا ایک ایک حصہ جڑ سے لے کر چوٹی تک ہلتا تھا۔ سمندر سے جو چیز بھی ان کے قریب آتی وہ اسے زور سے پکڑ لیتے۔ کوئی چیز ان کے پنجوں سے بچ کر نہیں نکل سکتی تھی۔ جل پری یہ بھیانک منظر دیکھ کر اتنی خوف زدہ ہوئی کہ وُہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ لوٹنے ہی کو تھی کہ اسے شہزادے اور غیر فانی روح کا جس کی اسے

اس قدر تمنا تھی خیال آگیا اس کے دل میں پھر ہمت آگئی۔ اس نے اپنے
بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیئے تاکہ یہ جاندار چیزیں
انھیں پکڑ نہ لیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے سینے کے آر پار اپنے ہاتھ باندھ
لیئے اور جیسے پانی میں ایک مچھلی تیرتی ہے کود کر گولی کی طرح ان بدشکل جاندار
درختوں کے بازوؤں اور انگلیوں میں سے جو اس کے گرد پھیلے تھے ہوتی ہوئی
آگے بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ ہر جاندار درخت نے اپنے لاتعداد بازوؤں میں
ایک ایک چیز پکڑ رکھی ہے ـــــ انسانی اور حیوانی ہڈیوں کے سفید ڈھانچے
جو سمندر میں غرق ہو کر گہرے پانی میں آگئے تھے اور چپو اور جہازوں کے پرزے
ان کے لپٹے ہوئے بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ایک ننھی جل پری بھی
اُن کے بازوؤں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور یہ بات ننھی شہزادی کو اور
بھی زیادہ درد انگیز محسوس ہوئی ؎

اب وہ جنگل میں ایک دلدلی زمین پر آئی جہاں پانی کے موٹے موٹے
سانپ کیچڑ میں بل کھا کھا کر اپنے شتری رنگ کے بدشکل جسم دکھا رہے تھے
جنگل کے وسط میں ایک مکان کھڑا تھا۔ یہ سمندر میں غرق شدہ انسانوں
کی ہڈیوں سے بنایا گیا تھا۔ سمندری جادوگرنی وہیں ایک بڑے مینڈک کے

سامنے منہ کھولے بیٹھی تھی۔ اور وہ اس میں سے کچھ نکال نکال کر کھا رہا تھا۔
بالکل اس انداز سے جیسے بعض لوگ چڑیا کو اپنے منہ سے کھلاتے ہیں۔ وہ بدصورت
پن ناگوں کو "میرے ننھے چوزے" کہہ کر پکارتی تھی اور اس نے انھیں اپنے سینے
پر رینگنے کی اجازت دے رکھی تھی +

سمندری جادوگرنی کہنے لگی "میں جانتی ہوں تم کیا چاہتی ہو۔ بڑی بیوقوف
ہو۔ لیکن تم اپنی بات کر کے رہو گی میری خوبصورت شہزادی! تم غم مول لے
رہی ہو۔ تم اپنی مچھلی کی دم سے نجات پانا چاہتی ہو اور چاہتی ہو کہ اسکے بجائے
وہاں دو چھڑیاں لگ جائیں؟ —— زمین پر کے انسانوں کی طرح تاکہ شہزادے
کو تم سے محبت ہو جائے اور تمھیں غیر فانی روح مل جائے"۔ یہ کہہ کر جادوگرنی
نے کچھ مایوسی کے انداز میں اس قدر بلند آواز سے قہقہہ لگایا کہ اس کے سینے
سے تمام سانپ اور مینڈک نیچے آگرے اور زمین پر رینگنے لگے +

اور پھر تھوڑی دیر بعد جادوگرنی کہنے لگی "تم عین وقت پر آئی ہو کیونکہ کل
سورج نکلنے کے بعد میں ایک سال تک تمھاری مدد کے قابل نہ رہ سکتی تھی۔
میں تمھارے لئے ایک دوا تیار کروں گی۔ تم اسے لے کر تیرتی ہوئی سورج
نکلنے سے پہلے خشکی پر جا پہنچنا اور کنارے پر بیٹھ کر اسے پی جانا۔ پھر تمھاری

دم غائب ہو جائے گی۔ اور تمھیں بھی وہ چیز لگ جائے گی۔ جسے انسان ٹانگیں کہتے ہیں۔ اس وقت تمھیں سخت عذاب ہو گا۔ تمھیں ایسا معلوم ہو گا جیسے کوئی تلوار تمھارے جسم کو چیر رہی ہے۔ لیکن جو کوئی بھی تمھیں دیکھے گا۔ یہی کہے گا کہ تم کوئی خوبصورت ترین عورت ہو! تم اسی طرح سلیقے سے تیر سکو گی جیسے اب تیر سکتی ہو۔ کسی رقاصہ کے پاؤں تم جیسی نزاکت سے زمین کو نہ چھوئیں گے لیکن ہر قدم اٹھاتے وقت تمھیں یہی محسوس ہو گا کہ تم چاقوؤں پہ چل رہی ہو۔ ساتھ ہی تمھارا خون بھی ضرور بہے گا۔ اگر تم یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو تو میں تمھیں مدد دوں گی۔"

چھوٹی شہزادی غیر فانی روح اور شہزادے کا تصور کر کے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی: "میں تیار ہوں۔"

جادوگرنی بولی "لیکن پھر سوچ لو۔ کیونکہ جب ایک دفعہ تم انسان بن جاؤ گی۔ تو پھر کوئی طاقت تمھیں از سر نو جل پری نہیں بنا سکے گی۔ تم پانیوں میں سے ہوتی ہوئی اپنی بہنوں کے پاس یا اپنے باپ کے محل میں نہ جا سکو گی۔ لیکن اگر تم شہزادے کی محبت حاصل کر سکیں۔ اتنی محبت کہ وہ تمھارے لئے اپنے ماں باپ کو بھی بھولنے کے لئے تیار ہو۔ یہاں تک کہ

اس کی روح کو بھی تم سے محبت ہو جائے اور وہ کسی پادری سے کہے کہ "میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر ہمیں میاں بیوی بنا دو" ـــــ تو پھر تمہیں غیر فانی روح حاصل ہو سکے گی۔ لیکن جس دن وہ کسی دوسری عورت سے شادی کرے گا اس سے دوسرے ہی دن صبح کو تمہارا دل ٹوٹ جائے گا اور تم سمندر کی لہروں کے درمیان جھاگ بن کر رہ جاؤ گی"۔

جل پری کہنے لگی "میں پھر بھی تیار ہوں" اور اس کا چہرہ موت کی طرح زرد ہو گیا ۔

بوڑھی جادوگرنی بولی "لیکن تمہیں مجھے اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور میں کوئی معمولی سا مطالبہ نہیں کروں گی سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والوں میں سے کسی کی بھی اتنی شیریں آواز نہیں ہے جتنی کہ تمہاری ۔ تم سوچتی ہو گی کہ تم اس کی مدد سے بھی شہزادے کو مسحور کر دو گی۔ لیکن یہ آواز تمہیں مجھے دینی پڑے گی۔ تمہاری سب سے زیادہ دلکش چیز مجھے اپنی دوا کے لئے قیمت کے طور پر چاہئے۔ مجھے اپنا خون بھی اس میں ملانا پڑیگا تاکہ یہ اتنی تیز ہو جتنا دو دھارا خنجر"۔

جل پری کہنے لگی "لیکن اگر آواز تم نے لے لی تو میرے پاس رہیگا کیا؟"

"تمہارے پاس! ؟ تمہارے پاس خوبصورت سراپا دلکش چال اور ایک ہی نگاہ میں بہت کچھ کہہ ڈالنے والی آنکھیں۔ یقیناً تم ان سب کی مدد سے انسان کا دل چھین سکو گی۔ تمہاری جرأت اب کدھر گئی؟ ڈر گئی ہو؟ اپنی چھوٹی سی زبان باہر نکالو۔ تاکہ میں اسے کاٹ ڈالوں۔ اور پھر تمہیں زود اثر دوا دوں۔"

جل پری کہنے لگی "اچھا!"

اس کے بعد جادوگرنی نے دوا تیار کرنے کے لیے اپنا برتن آگ پر رکھا:

"صفائی بڑی اچھی چیز ہے" کہہ کر اس نے اپنی مٹھی میں سانپوں کا ایک مٹھا لیا۔ اور اس سے رگڑ رگڑ کر برتن کو صاف کرنے لگی اس نے اپنے سینے میں کوئی کانٹے کی سی چیز چبھوئی اور کچھ کالا کالا خون برتن میں جا گرا۔ اس میں سے جو بھاپ اٹھی اس نے اس قدر خوفناک شکلیں اختیار کرنی شروع کیں کہ چاہے کوئی بھی ہو ان کی طرف ذرا ڈر ہی کر دیکھے۔ ہر گھڑی جادوگرنی برتن میں کوئی نہ کوئی چیز ڈالتی۔ اور دوا ابلنے لگتی اور اس میں سے روتے ہوئے مگر مچھ کی چیخوں کی آوازیں آنے لگتیں۔ جب یہ جادو کی دوا تیار

ہوگئی تو یہ شفاف ترین پانی کی صورت اختیار کر چکی تھی ۔

جادوگرنی کہنے لگی "لو تمھاری چیز تیار ہوگئی" اس کے بعد اس نے جل پری کی زبان کاٹ ڈالی تاکہ وہ گونگی ہو جائے اور پھر کبھی نہ بول سکے نہ گا سکے ۔

جادوگرنی کہنے لگی "جب تم جنگل سے گزرنے لگو اور جاندار درختوں کی انگلیاں تمھیں پکڑ لیں تو اس میں سے کچھ قطرے ان پر چھڑک دینا۔ اس سے ان کی انگلیوں کے ہزار ہا ٹکڑے ہو جائیں گے" لیکن چھوٹی جل پری کو ایسا کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کیونکہ جب انھوں نے جل پری کے ہاتھ میں یہ چمکدار سیال شے دیکھی جو کسی ستارے کی طرح چمک رہی تھی تو وہ خود ہی مارے دہشت کے کود کر پیچھے کو جا گرے۔

پس وہ بڑی تیزی سے جنگل اور دلدلوں اور ہیبت ناک گردابوں میں سے گذر گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کے محل میں رقص گاہ کی روشنیاں بجھ چکی ہیں اور سب سو گئے ہیں۔ لیکن اس نے جرأت نہ کی کہ ان میں جائے۔ کیونکہ اب وہ گونگی ہو چکی تھی۔ اور ان سب کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا دل ٹوٹ رہا ہے۔ وہ چپکے

باغ میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنی ہر بہن کے پھولوں کی کیاری سے ایک ایک پھول لیا۔ محل کی طرف منہ کر کے ہزار مرتبہ اپنا ہاتھ چوما۔ اور گہرے نیلے پانیوں میں اوپر ابھرنا شروع کیا۔ اس وقت چمکیلا چاند روشن تھا۔۔۔۔۔ اجلا اور بلند ۔ چھوٹی جل پری نے جادو کی دوا پی لی اور اس بچاری کو یوں محسوس ہوا گویا اس کے نازک جسم کو ایک دودھارا خنجر کاٹتا چلا جا رہا ہے وہ بے ہوش ہو گئی۔ اور کسی مُردہ چیز کی طرح وہیں پڑی رہی جب سورج آ کر سمندر پر چمکنے لگا تو اُسے ہوش آ گیا۔ اسے ایک تیز چبھن محسوس ہو رہی تھی لیکن اب اس کے سامنے نوجوان اور خوبصورت شہزادہ کھڑا تھا اس کی کوئلے کی سی سیاہ آنکھیں چھوٹی جل پری پر اس انداز سے گڑی تھیں کہ جل پری نے شرم سے نگاہ نیچی کر لی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس کی مچھلی کی دم غائب ہو چکی ہے اور اس کی جگہ دو سفید سفید ٹانگیں موجود ہیں اس کے علاوہ دو چھوٹے چھوٹے پیر بھی ہیں اور دونوں ٹانگیں اور دونوں پیر اتنے ہی خوبصورت ہیں جتنے کسی حسین سے حسین ننھی دوشیزہ کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے پاس کپڑے نہ تھے۔ سو اس نے اپنے آپ کو لمبے لمبے اور گھنے بالوں میں چھپا لیا۔ شہزادے نے اس سے پوچھا "تم کون ہو اور

کہاں سے آئی ہو؟" وہ اس کی طرف اپنی دُکھ بھری ملامت آمیز گہری نیلی آنکھوں سے دیکھنے لگی لیکن بول نہ سکی۔ شہزادے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے محل میں لے گیا جیسا کہ جادوگرنی نے کہا تھا ہر قدم آگے رکھتے وقت اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ سوئیوں یا نشتروں پر چل رہی ہے لیکن یہ سب کچھ اس نے خوشی سے برداشت کر لیا اور شہزادے کے ساتھ ساتھ وہ بے تکان پانی کے بلبلے کی سی نزاکت کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کی انوکھی اور دل نشیں چال کا انداز دیکھ کر ہر شخص حیران سا رہ جاتا۔ اسے بہت جلد ریشم کا لباس پہنا دیا گیا اور وہ محل کی حسین ترین مخلوق نظر آنے لگی۔ لیکن وہ گونگی تھی۔ نہ بول سکتی نہ گا سکتی تھی۔

اب خوبصورت کنیزیں ریشم کا مطلّا لباس پہن کر شہزادے اور اس کے ماں باپ کے سامنے آگئیں اور گانے لگیں اور ایک نے تو باقی سب سے زیادہ اچھا گایا۔ شہزادے نے پہلے تالیاں بجائیں۔ اور پھر مسکرا کر جل پری کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹی جل پری کے لئے یہ ایک نہایت غمناک بات تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ میں اس کنیز سے کتنا زیادہ اچھا گا سکتی تھی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی "کاش یہ بات میرے شہزادے کو بھی معلوم ہو جائے کہ میں

نے اس کے ساتھ رہنے کی خاطر ہمیشہ کے لئے اپنی آواز دے ڈالی ہے ۔
اسکے بعد کنیزوں نے موسیقی کے تال پر خوبصورت تتلیوں کی طرح رقص کرنا شروع کیا۔ اب جل پری نے بھی اپنے پیارے پیارے گورے بازو اٹھا لئے اپنے پیروں کے اگلے سرول پر کھڑی ہوئی اور ایک بالکل ہی نرالے انداز سے رقص کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس انوکھی شان سے رقص نہیں کیا تھا۔ ہر لمحے کے بعد اس کے حسن کی کشش بڑھنے لگی کنیزوں کے گیتوں کے مقابلے میں اس کی سحر آفرین تیز نگاہیں دلوں میں زیادہ سُرعت سے اُترنے لگیں۔ سب پر ایک بے خودی طاری ہو گئی۔ سب سے زیادہ اثر شہزادے کے دل پر ہوا۔ جو اسے "میری پیاری" کہتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے تکان رقص کرنا شروع کیا تاکہ شہزادہ اور بھی زیادہ خوش ہو۔ اگرچہ ہر بار جب اس کے قدم فرش سے چھوتے تھے تو ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پاؤں میں بہت سے چاقو اُتر گئے ہیں ۔
شہزادہ اس سے کہنے لگا "تم میرے پاس ہی رہنا"...... اور اُسے اجازت مل گئی کہ وہ اس کے دروازے کے قریب ایک مخملیں گدیلے پر سو سکے۔ شہزادے نے اُس کے لئے ایک مردانہ جوڑا بھی سلوا لیا تاکہ

وہ اس کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو سکے ؂

ایک دن وہ دونوں بہنیں بھینی بھینی خوشبوؤں والے جنگلوں میں سے گذرے جہاں سرسبز شاخیں ان کے کندھوں کو چھو رہی تھیں۔ اور ننھے پرند ہرے ہرے پتوں میں بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ وہ شہزادے کے ہمراہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئی۔ اگرچہ اُس کے نازک پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ زمین پر ان کے نشان بھی بنتے جاتے تھے لیکن وہ کسی قسم کے دُکھ کا اظہار کرنے کے بجائے بار بار ہنس دیتی تھی۔ وہ اوپر چڑھتے گئے یہاں تک کہ بادل ان کے نیچے رہ گئے اور دُور سے اس طرح معلوم ہونے لگے جیسے پرندوں کے جھنڈ دُور دراز ملکوں کو جا رہے ہوں ؂

جب وہ محل میں ہوتی اور تمام لوگ سو جاتے تو وہ مرمر کی چوڑی سیڑھیوں پر جا بیٹھتی کیونکہ اُسے جلتے ہوئے پیروں کو سمندر کے پانی میں ڈبونے سے آرام محسوس ہوتا تھا اور وہ ہر اس چیز کے متعلق بھی سوچتی جو وہ گہرائیوں میں چھوڑ آئی تھی ؂

ایک شب اس کی بہنیں بازوؤں میں بازو ڈال کر تیرتی اور غمناک

گیت گاتی ہوئی وہاں آئیں۔ شہزادی نے انھیں اشارے سے بلایا۔ اور انھوں نے اس کو پہچان لیا اور اسے بتایا کہ "تم نے ہمیں بہت غمگین کر رکھا ہے"۔

اسکے بعد وہ ہر روز اس جگہ آنے لگیں اور ایک دفعہ تو اس نے دور فاصلے پر اپنی دادی اماں کو بھی دیکھ لیا۔ جو کئی سال سے سطح بحر پر نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے تاج پہنے ہوئے اپنا بوڑھا باپ بھی نظر آیا۔ انھوں نے اس کی طرف اپنے بازو پھیلائے۔ لیکن انھوں نے خشکی کے اس قدر نزدیک بھی آنے کی جرأت نہ کی جتنی اس کی بہنیں کر چکی تھیں۔

جوں جوں دن گذرتے گئے شہزادے سے اس کی محبت بڑھنے لگی۔ اور وہ بھی اس سے ایک چھوٹے بچے کی طرح محبت کرنے لگا۔ لیکن اسے اپنی بیوی بنانے کا خیال اس کے دل میں کبھی نہ آیا۔ جب تک وہ اس سے شادی نہ کر لیتا اسے غیر فانی روح حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اور جس دن وہ کسی دوسری عورت سے شادی کر لیتا اس سے دوسری صبح کو وہ گھل کر سمندر کا جھاگ بن جاتی۔

ایک دن جب شہزادے نے اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کی

خوبصورت پیشانی کو چوما تو یوں محسوس ہوا جیسے جل پری کی آنکھیں کہ رہی ہیں "کیا تمہیں مجھ سے سب سے زیادہ محبت نہیں"؟

شہزادہ کہنے لگا "ہاں تم مجھے بہت عزیز ہو کیونکہ تمہارا دل ایک بہترین دل ہے۔ اور تم مجھے بہت ہی اپنی معلوم ہوتی ہو۔ تم اس نوجوان دوشیزہ کی ہم شکل ہو جسے ایک دفعہ میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں لیکن جسے میں اب تمام عمر نہ دیکھ سکوں گی۔ میں ایک جہاز میں تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ اور لہروں نے مجھے کنارے پر ایک مقدس مندر کے قریب لا پھینکا۔ جہاں بہت سی دوشیزہ لڑکیاں عبادت کے لئے آئی تھیں۔ ان میں سے سب سے چھوٹی نے مجھے کنارے پر دیکھ لیا اور میری جان بچالی۔ میں نے صرف اسے دو ہی مرتبہ دیکھا تھا۔ اور دنیا میں صرف وہی ایک لڑکی ہے جس سے میں محبت کر سکتا ہوں لیکن تمہاری شکل بھی اُس جیسی ہے اور تم نے اس کی تصویر میرے دل سے نکال دی ہے وہ اسی مقدس مندر میں آئی تھی اور میری خوش بختی نے اِسی جگہ میرے لئے تمہیں بھیج دیا اور ہم کبھی ایک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے۔"

چھوٹی جل پری کہنے لگی "آہ وہ نہیں جانتا کہ میں نے ہی اس کی جان

بچائی تھی۔ میں ہی اسے سمندر سے اوپر اُٹھا کر اس جنگل میں لائی تھی۔ جہاں مندر کھڑا ہے۔ میں جھاگ میں بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ انسان اس کی مدد کو آگئے۔ میں نے وہ "خوبصورت دوشیزہ" دیکھی ہے جسے وہ مجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک گہری آہ بھری لیکن وہ آنکھوں میں آنسو نہ لا سکی۔" وہ کہتا ہے کہ دوشیزہ اس مندر کی رہنے والی ہے۔ وہ دنیا میں پھر واپس نہ آئے گی۔ یہ دونوں اب ایک دوسرے سے نہ ملیں گے۔" اور میں ہوں کہ شہزادے کے قریب ہوں اور ہر روز اسے دیکھتی ہوں۔ میں شہزادے کی حفاظت کروں گی اس سے محبت کروں گی۔ اور اس کیلئے اپنی زندگی قربان کر ڈالوں گی۔"

بہت جلد لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ "شہزادہ شادی کرنے والا ہے ایک ہمسایہ سلطنت کے بادشاہ کی خوبصورت لڑکی اس کی بیوی بنے گی چنانچہ اس کے لئے ایک خوبصورت جہاز بھی تیار کیا جائے گا۔" اگرچہ شہزادہ خود یہی کہتا تھا کہ "میں تو صرف بادشاہ سے ملنے جا رہا ہوں۔ لیکن لوگ جان گئے کہ دراصل وہ اس کی لڑکی سے ملنے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو بھی جانا تھا چھوٹی جل پری نے یہ

بات سنتے ہی مسکرا کر سر ہلا دیا۔ وہ اوروں کی نسبت شہزادے کے خیالات سے زیادہ واقف تھی۔

شہزادہ اس سے کہنے لگا "مجھے ایک ضروری سفر پر جانا ہے مجھے ضرور اس خوبصورت شہزادی کو دیکھنا پڑے گا۔ یہ بات میرے والدین مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ مجھے اس بات پر مجبور نہیں سکیں گے کہ میں اسے بیوی بنا کر گھر لے آؤں۔ میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ وہ مندر والی دوشیزہ کی طرح تو نہیں جو تمہارے جیسی تھی۔ اگر مجھے ضرور ہی کسی بیوی کو گھر لانے کے لئے مجبور کیا گیا تو میں بھلا تمہیں کیوں نہ چنوں گا۔ میری نہ بول سکنے والی لڑکی! تم بات نہیں کرتیں لیکن تمہاری آنکھیں مجھ سے بہت کچھ کہہ ڈالتی ہیں!" اور پھر شہزادے نے اس کا گلاب کے پھول سا منہ چوم لیا۔ اور اس کے لمبے لمبے ہوا میں لہراتے ہوئے بالوں سے کھیلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد شہزادے نے اپنا سر اس کے دل پر رکھ دیا۔ اور جل پری کو انسانی لذتوں اور غیر فانی روح کے خیال آنے لگے۔

جب وہ اس جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے جو انہیں قریب کی ہمسایہ سلطنت کے بادشاہ کی طرف لے جانے والا تھا۔ شہزادہ اس سے کہنے لگا

معصوم لڑکی تم سمندر سے ڈروگی تو نہیں"۔ اور پھر وہ اسے طوفانی اور پرسکون موسم اور سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والی عجیب وغریب مچھلیوں کی باتیں سنانے لگا۔ اور بتلانے لگا کہ غوطہ زنوں نے سمندر میں کیا کیا دیکھا ہے وہ اس کی باتیں سُن سُن کر مسکرا دیتی کیونکہ سب سے زیادہ وہ خود جانتی تھی کہ سمندر کی تہ میں کیا کیا عجائبات ہیں ؛

چاندنی رات میں جب جہاز کے تمام لوگ سو گئے۔ سوائے اس آدمی کے جو پتوار کے قریب بیٹھا کبھی کبھی چپو مار دیتا تھا۔ تو وہ عرشۂ جہاز پر آبیٹھی اور صاف پانیوں میں نظریں ڈالنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اپنے باپ کا محل اور اس میں اپنی بوڑھی دادی اماں سر پر سنہری تاج پہنے تیز رفتار جہاز کی سمت ٹکٹکی لگائے نظر آسکتی ہے ...... اور سچ مچ ہی اس کی بہنیں لہروں پر آپہنچیں اور اپنے سفید سفید ہاتھوں کو ملتے ہوئے اس کی طرف نہایت کرب آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ اس نے ان کی طرف اشارہ کیا اور مسکرانے لگی۔ اور انھیں بتانا چاہا کہ میں یہاں ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہوں لیکن اسی وقت ایک لڑکا وہاں آموجود ہوا۔ اور جب جل پری کی بہنیں اسے دیکھ کر غوطہ لگا گئیں تو اسے خیال آیا جو کچھ میں نے دیکھا ہے

وہ سمندر کا جھاگ تھا۔

دوسری صبح جہاز ایک خوبصورت شہر کی بندرگاہ میں آپہنچا جو اس بادشاہ کی ملکیت تھا جس کے گھر شہزادہ جا رہا تھا۔ گرجاؤں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بلند میناروں سے نفیری کے نغموں کی دلکش آوازیں نکل رہی تھیں جس سڑک سے وہ گذرے اس کے دونوں طرف سپاہی قطاریں باندھے ہاتھ میں جھنڈے اور چمکتی سنگینیں لئے کھڑے تھے وہاں ہر روز ایک میلہ رہتا اور ہر روز رقص ہوتے اور دعوتیں ہوتیں۔ لیکن شہزادی ابھی نہیں آئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ مقدس مذہبی درس گاہ میں بیٹھی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اور ہر وہ بات سیکھ رہی ہے۔ جو بادشاہوں کی لڑکیوں کے لئے سیکھنی ضروری ہوتی ہے آخر کار ایک دن وہ آگئی اور اس کے بعد چھوٹی جل پری کو بھی جو یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھی کہ کیا وہ سچ مچ خوبصورت ہے اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی اس نے حسن کا اس سے زیادہ مکمل نمونہ نہیں دیکھا۔ اس کا بدن نازک اور خوشنما تھا۔ اور اس کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے دو مسکراتی ہوئی آنکھیں سچائی اور پاکیزگی کے نور سے روشن ہو رہی تھیں۔

شہزادہ کہنے لگا "اچھا تو یہ تم ہو جس نے اس وقت میری جان بچائی تھی جب میں مُردہ ہو کر ساحل پر پڑا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے شرماتی ہوئی دلہن کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیئے اور اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا اور پھر جل پری سے کہنے لگا "میں بہت خوش ہوں میری تمام امیدیں بر آگئی ہیں۔ تم بھی میری خوشی سے خوش ہو گی کیونکہ تمھیں مجھ سے سچی عقیدت ہے۔"

چھوٹی جل پری نے شہزادے کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اس نے دل میں کہا کہ "میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ شادی کی صبح میرے لئے موت کا پیغام ہو گی اور میں سمندر کا جھاگ بن جاؤں گی۔"

گرجا کی تمام گھنٹیاں ٹن ٹن کرنے لگیں اور سرداروں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہر جگہ شہر میں شہزادے کی منگنی کا اعلان کر دیا۔ گرجاؤں کی قربان گاہوں پر خوشبودار تیل کی بیش قیمت مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ چھوٹے پادریوں نے اگر دان ہلانے شروع کئے اور بڑے پادری نے دولہا اور دلہن کے ہاتھ ملا دیئے اور انھیں برکت دی۔ چھوٹی جل پری جو ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی دلہن کے لبادے کا پچھلا حصّہ اُٹھا کر

اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ لیکن اس کے کان جشن کی موسیقی کے نغمے نہیں سُن رہے تھے۔ نہ اس کی آنکھوں نے اس مقدّس رسم کو ادا ہوتے ہوئے دیکھا اسے اس مہلک رات کا خیال آرہا تھا جو نزدیک سے نزدیک تر آرہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اس دنیا میں سب کچھ کھو دیا ہے۔ اسی شام دولہا اور دلہن جہاز پر سوار ہو گئے۔ توپیں گرج رہی تھیں جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اور جہاز کے وسط میں ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا جس کا کپڑا نہایت ہی قیمتی تھا اور جس پر سونے کا کام کیا گیا تھا خیمے میں دولہا اور دلہن کے رات بسر کرنے کے لئے خوش قطع اور نفیس صوفے رکھ دیئے گئے۔ جہاز کے بادبان ہوا سے بھر گئے۔ موافق ہوا چلنے لگی۔ اور جہاز پُرسکون سمندر میں نہایت ملائمت سے آگے بڑھا۔

جب اندھیرا چھا گیا تو بہت سی رنگا رنگ مشعلیں روشن کر دی گئیں اور ملاح خوشی سے عرشۂ جہاز پر ناچنے لگے۔ چھوٹی جل پری کو بے اختیار یاد آگیا کہ وہ پہلے پہل کس طرح سطح بحر پر ابھری تھی۔ اس وقت بھی ایک جہاز پر اسی طرح جشن منایا جا رہا تھا۔ وہ بھی رقص میں شریک ہو گئی اور ہوا میں یوں رقص کرنے لگی جیسے ایک ابابیل، پھرتی اور نزاکت سے

ہوا میں اپنے شکار کا تعاقب کرتی ہے۔ ہر دیکھنے والا حیران ہو ہو کر اور تالیاں بجا بجا کر اسے داد دینے لگا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی اس قدر خوش ادائی اور نفاست سے رقص نہیں کیا تھا۔ اس کے نازک پاؤں تیز چاقوؤں سے زخمی ہو گئے۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی۔ اسے اپنے دل میں چاقوؤں کے زخم سے کہیں زیادہ دردناک چبھن محسوس ہو رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ "یہ وہ آخری شام ہے۔ جب میں شہزادے کو دیکھ رہی ہوں اس شہزادے کو جس کے لئے میں اپنے گھر اور اپنے رشتہ داروں کو چھوڑا جس کے لئے میں نے اپنی خوبصورت آواز دے ڈالی لیکن شہزادے کو اس کی کچھ خبر بھی نہیں" اس نے سوچا کہ "یہ آخری شام ہے جب ہم دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لے رہے ہیں۔ تاروں بھرے آسمان اور گہرے سمندر کو اکٹھے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک لازوال رات ——— ایک ایسی رات جس میں نہ کوئی خواب آسکتا تھا نہ خیال میرا انتظار کر رہی ہو گی" چھوٹی جل پری روح سے محروم تھی اور اب وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب بھی نہ ہو سکتی تھی۔ نصف شب کے بعد بہت دیر تک جہاز پر جشن مسرت برپا رہا۔ اور چھوٹی جل پری بھی موت کا خیال دل میں چھپائے

دوسروں سے مل کر رقص کرتی رہی ہنستی رہی۔ شہزادے نے اپنی حسین دلہن کا بوسہ لیا۔ وہ اس وقت اس کے سیاہ اور چمکیلے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر شاندر خیمے میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ اور جہاز پر خاموشی چھا گئی۔ صرف پتوار ڈالنے والا آدمی جاگتا تھا۔ چھوٹی جل پری نے اپنے گورے بازو جہاز کے ایک کنارے پر سمندر کی طرف لٹکا دئے اور اس طرح جھک کر صبح کی پہلی شرمگین ادا کا نظارہ کرنے کے لئے مشرق کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے سورج کی پہلی کرن کا انتظار تھا جو اس کے لئے موت کا پیغام لانے والی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بہنیں طوفان زدہ سمندر میں باہر نکل آئی ہیں۔ وہ بھی اتنی ہی زرد رو ہو رہی تھیں جتنی وہ خود تھی —— لیکن آہ اب ان کے لمبے لمبے خوبصورت بال ہوا میں لہرا نہیں رہے تھے۔ وہ کٹ چکے تھے ؛

جل پریاں کہنے لگیں " ہم نے تمہارے لئے اپنے بال جادوگرنی کو دے دیئے ہیں تاکہ تم آج رات نہ مر جاؤ۔ اس نے ہمیں ایک چاقو دیا ہے۔ یہ ہے وہ! دیکھو اس کی دھار کتنی تیز ہے! تم سورج نکلنے سے پہلے پہلے اسے شہزادے کے دل میں بھونک دینا! جب اس کا گرم گرم خون تمہاری

ٹانگوں پر گرے گا تو وہ دونوں یکایک ایک ہو جائیں گی۔ اور ان دو موٹی چھڑیوں کے بجائے فوراً تمہاری مچھلی کی دم بن جائے گی۔ تم ایک دفعہ پھر جل پری بن جاؤ گی۔ اور مرنے سے پہلے ـــــ سمندر کا جھاگ بننے سے قبل تین سو سال تک زندہ رہ سکو گی۔ اب جلدی کرو! سورج نکلنے سے پہلے اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔ ہماری بوڑھی دادی اماں نے تمہارا اتنا زیادہ ماتم کیا ہے کہ اس کے سر کے سفید بال فرطِ رنج سے اس طرح گر رہے ہیں جیسے ہمارے جادوگرنی کی قینچی کے نیچے گرتے تھے۔ شہزادے کو مار ڈالو! جلدی کرو! کیا تمہیں صبح کی پہلی سُرخ روشنیاں نہیں نظر آرہیں؟ چند ہی لمحوں میں سُورج نکل آئے گا اور تم مر جاؤ گی۔"

اس کے بعد اس کی بہنوں نے ایک گہری اور نہایت افسردہ سانس لی۔ اور لہروں کے نیچے ڈوب گئیں۔

چھوٹی جل پری نے خیمے کا قرمزی پردہ پیچھے ہٹایا اور دیکھا کہ خوبصورت دُلہن شہزادے کے سینے پر اپنا سر رکھے سو رہی ہے۔

اس نے جھک کر شہزادے کی خوشنما پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھا جس میں پھول کی سی سُرخی لحظہ بہ لحظہ بڑھ

رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک نگاہ تیز چاقو پر اور دوسری شہزادے کے چہرے پر ڈالی۔ شہزادے کے حسین چہرے پر اس کی نظریں گڑ گئیں اس نے خواب میں آہستہ سے اپنی دُلہن کا نام لیا۔ آہ اس کے خوابوں میں بھی وہی تھی! چھوٹی جل پری کے ہاتھ میں چاقو لرز گیا۔ گھبرا کر اس نے اسے اپنے سے بہت دُور لہروں میں پھینک دیا۔ جہاں یہ گرا وہاں کا پانی سُرخ ہو گیا۔ چھینٹیں خون بن کر اوپر تک اُٹھیں۔ چھوٹی جل پری نے ایک مرتبہ پھر شہزادے پر ایک طویل اور ناتوان نیم مُردہ سی نگاہ ڈالی اور پھر یکایک اپنے آپ کو جہاز پر سے سمندر میں گرا لیا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر جھاگ میں تبدیل ہو رہا ہے۔
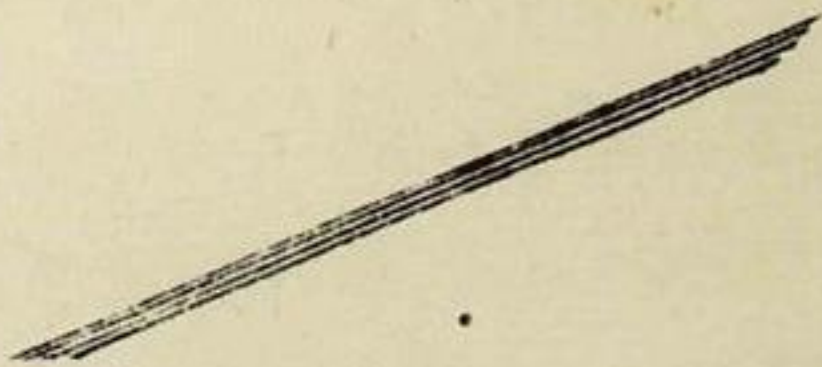
پھولوں کا رقص

پھولوں کا رقص

ننھی فیروزہ کہنے لگی "افسوس! افسوس! میرے پھول اب بالکل ہی مرگئے ہیں۔ کل شام بیچارے کتنے خوبصورت نظر آتے تھے۔ آج ان کی تمام پتیوں نے کملا کر گردنیں نیچی کر لی ہیں۔"

طالب علم قریب ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ ننھی فیروزہ کو اس سے بہت دلچسپی تھی کیونکہ وہ غضب کی دلچسپ کہانیاں سُنا سکتا تھا اور خوبصورت ترین رنگین تصویریں کہیں سے کاٹ کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ کہیں عورتوں کے رقص کی تصویریں ہوتیں، کہیں پھولوں کی اور کہیں ایسے قلعوں کی جن کے دروازے کھل بھی سکتے۔ الغرض وہ نہایت ہی خوش و خرم لڑکا تھا۔

فیروزہ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں کے گلدستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "انھیں کیا ہو گیا ہے۔ آج کیوں یہ اتنے کملا گئے ہیں؟"

طالب علم کہنے لگا "ہیں! تم نہیں جانتیں انھیں کیا ہوا ہے؟ کل تمام شب پھول رقص کی محفل میں شریک رہے ہیں، کوئی حیرانی کی بات نہیں جو یہ سر جھکا کر مزے سے اُونگھ رہے ہیں۔"

ننھی فیروزہ چلّا کر بولی "لیکن پھول تو نہیں رقص کر سکتے نا؟"

"واہ! کیوں نہیں؟ جب اندھیرا چھا جاتا ہے اور کوئی پڑا سوتا ہے تو یہ خوش ہو ہو کر اِدھر اُدھر خوب رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تقریباً ہر رات پھولوں کے رقص کی محفل ہوتی ہے۔"

"کیا لڑکیاں بھی اِن محفلوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں۔ وادی کے پھولوں کی لڑکیاں برابر وہاں آتی ہیں۔

"خوبصورت پھول کہاں رقص کرتے ہیں؟"

"کیا تم نے اکثر ہی شہر کے بڑے دروازے سے باہر ایک وسیع قلعہ نہیں دیکھا جہاں خوبصورت باغ میں ہر سمت پھول ہی پھول نظر آتے ہیں؟ کیا تم نے راج ہنسوں کو جب وہ تمہاری طرف تیر کر آتے ہیں کبھی روٹی نہیں کھلائی؟ سُن لو کہ پھولوں کی بڑی بڑی محفلیں وہیں منعقد ہوتی ہیں۔ بےشک میری بات مان لو۔"

فیروزہ کہنے لگی "کل ہی میں اور امّاں اس باغ میں گئے تھے لیکن درختوں کے تمام پتے جھڑ گئے تھے اور وہاں ایک بھی پھول نہ تھا۔ وہ کہاں گئے ہیں پھر؟ گرمیوں میں بہت نظر آیا کرتے تھے۔"

طالب علم نے جواب دیا "وہ تو قلعہ میں ہیں۔ اِدھر بادشاہ اور درباری شہر کو چلے اور اُدھر پھول دوڑ کر باغ سے قلعے میں آ گئے۔ کبھی دیکھو تو پتہ چلے کہ وہ کس قدر خوش ہوتے ہیں۔ دو حسین ترین پھول بادشاہ اور ملکہ بن کر ایک تخت پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ طُرّہ دار سُرخ سُرخ بانکے پھول صفیں باندھ کر اور گردنیں جھُکا کر باقاعدہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ امرائے دربار کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد طرح طرح کے خوبصورت پھول آتے ہیں اور ایک شاندار رقص برپا ہو جاتا ہے۔ بنفشے کے نیلے پھول اپنے ننھے بحری بھائیوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور سنبل اور زعفران سے ملکر جنھیں یہ "نوجوان خواتین" کہتے ہیں خوب رقص کرتے ہیں۔ سوسن اسدرُو اور لالہ کے پھول بوڑھی عورتیں ہوتی ہیں جو بیٹھے بیٹھے سب محفل پر ایک نظر رکھتی ہیں کہ کہیں کوئی خرابی واقع تو نہیں ہو گئی اور ہر بات ٹھیک ٹھیک اور نہایت باقاعدگی سے ہو رہی ہے۔"

ننھی فیروزہ نے پوچھا" لیکن وہاں ایسا کوئی نہیں ہوتا جو پھولوں کو پیٹے اور کہے کہ بادشاہ کے قلعے میں کیوں ناچتے ہو"؟

طالب علم نے کہا" کسی کو اس بات کا علم نہیں۔ جیل کا بوڑھا داروغہ جو رات کو قلعہ کی حفاظت کرتا ہے۔ کبھی کبھی اندر آتا ہے۔ اس کے پاس چابیوں کا ایک بڑا گچھا ہوتا ہے۔ جونہی پھولوں کو چابیوں کی جھنجھناہٹ سنائی دیتی ہے وہ دوڑ کر پردوں کے پیچھے بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں صرف اپنے سروں کو جھانکنے کے لئے ذرا سا باہر نکالے رکھتے ہیں۔ بوڑھا داروغہ آتا ہے اور آ کر کہتا ہے" ہیں؟ مجھے پھولوں کی خوشبو کیوں آ رہی ہے؟ لیکن پھول کہیں نظر نہیں آتے۔"

فیروزہ تالی بجا کر کہنے لگی" آہا ہا! کیسی عجیب بات ہے کیا میں بھی ان پھولوں کو دیکھ سکوں گی"؟

طالب علم نے کہا" کیوں نہیں۔ اب کبھی باہر جاؤ گی تو یہ بات یاد رکھنا کھڑکی میں سے تھوڑا سا جھانک کر دیکھو گی تو تمہیں سب کچھ نظر آ جائے گا۔ آج میں نے ایسا ہی اور دیکھا کہ نرگس کی ایک پتلی سی زرد کلی ایک صوفے پر بڑے آرام سے بیٹھی ہے وہ شاہی دربار کی ایک "خاتون" تھی!

فیروزہ کہنے لگی " باغِ نباتات کے پھول بھی ان ناچوں میں شریک ہو سکتے ہیں ؟ اتنی دُور دُور کے پھول بھی آجاتے ہیں ؟"

" ہاں! جب ان کا جی چاہے! وہ تو بھئی اُڑ سکتے ہیں نا۔ تم نے دیکھی نہیں وہ سُرخ سُرخ، زرد زرد، سفید سفید تتلیاں ؟ وہ پھولوں کی ہمشکل یہ پھول ہی تو تھیں کبھی۔ یہ پھول درختوں کی ڈالیوں سے جُدا ہو کر فضا میں آجاتے ہیں اور وہاں ان کی پتیاں خوب پھڑپھڑاتی ہیں۔ جیسے یہ انکے اُڑنے کے چھوٹے چھوٹے پر ہوں۔ اگر وہ اپنا فرض اچھی طرح انجام دیں تو انھیں شاخوں پر اپنے گھروں میں چپ چاپ بیٹھے رہنے کی بجائے اِدھر اُدھر اُڑتے رہنے کی اجازت مل جاتی ہے اور اسی دوران میں ان کی پتیاں اصلی پروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ باغِ نباتات کے پھول شاہی محل میں کبھی نہ گئے ہوں اور انھیں معلوم نہ ہو کہ رات کو وہاں کتنی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور کیا کیا ہوتا ہے۔ میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ نباتات کا پروفیسر جو یہاں قریب ہی رہتا ہے حیران رہ جائے گا۔ تم تو اُسے جانتی ہی ہو شاید۔ جانتی ہو نا ؟ اچھا تو اب کبھی جو تم باغ میں جاؤ ایک پھول سے چپکے سے کہہ آنا کہ قلعہ میں رقص

کی ایک بڑی محفل منعقد ہونے والی ہے۔ پھر یہی پھول باقی سب پھولوں کو بھی یہ خبر سناوے گا جو جلداز جلد قلعہ میں پہنچنے کی کوشش کریں گے جب پروفیسر باغ میں سیر کرنے آئے گا تو وہاں ایک بھی پھول نہیں ہوگا اور وہ حیران رہ جائے گا کہ اتنے پھول کہاں گئے۔"

"پر ایک پھول دوسرے پھول سے کیسے بات کرے گا؟ پھول تو نہیں بول سکتے نا؟"

"ہاں، ہاں بول تو نہیں سکتے پر اشارے، تو کر سکتے ہیں! تم نے اکثر ہی نہیں دیکھا کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی طرف سر ہلاتے ہیں اور اپنی خوبصورت پتیوں سے سرسراہٹ کی آواز نکالتے ہیں؟"

فیروزہ کہنے لگی "پر اشارے پروفیسر کی سمجھ میں آجاتے ہیں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایک صبح وہ باغ کو گیا۔ ایک گڑہل کا پھول سُرخ سُرخ گلنار کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ گلنار ایک خوبصورت دوشیزہ تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا "تم بہت حسین ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے"

پروفیسر دل میں کہنے لگا۔ یہ کیا نامعقول باتیں کر رہا ہے۔ اور اس نے اُسے چپ کرانے کے لئے ایک چپت لگا دی پھول کو بھی غصہ آگیا اس نے

بھی اپنے کانٹے جو اس کی انگلیاں تھیں پروفیسر کے ایسی چبھوئیں کہ وہ "اُف" کہہ کر رہ گیا۔ اس دن سے آج تک اُسنے کبھی گڑہل کے پھول کو چھونے کی جرأت نہیں کی۔"

فیروزہ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگی "اہا ہاہا! کتنی اچھی شرارت ہوئی!"

ایک ڈھیٹ وکیل جو یہاں کسی کام کو آیا تھا اور صوفے پر بیٹھا تھا کہنے لگا "ایک بچی کے ذہن میں ایسے وہم نہیں سما سکتے۔" وہ طالب علم کو ذرا پسند نہیں کرتا تھا اور جب طالب العلم کاغذوں سے دلچسپ اور عمدہ تصویریں کاٹتا تو یہ وکیل غصے سے بہتیرا کچھ منہ میں بڑبڑاتا رہتا۔ تصویروں میں کوئی تصویر کبھی کسی ایسے آدمی کی ہوتی جو ہاتھ میں ایک دل پکڑے ہوئے صلیب پر لٹکا ہوتا، جیسے وہ لوگوں کے دل چُراتا رہا ہے۔ کوئی تصویر کسی جادوگرنی کی ہوتی جو کسی جھاڑو کی تیلی پر سوار ہو کر اپنے شوہر کو ناک پر بٹھائے ہوئے، ہوا میں اڑتی ہوتی۔ لیکن وکیل کو طالب علم کا مذاق پسند نہ آتا تھا اور وہ جیسا کہ اس نے اب بھی کہا تھا کہہ دیتا۔ "بچوں کی سمجھ میں ایسی واہیات باتیں کیونکر آسکتی ہیں کیسی بے ہودہ باتیں کرتے ہو!"

لیکن ننھی فیروزہ کو وہ تمام کہانیاں جو طالب علم اسے سُنایا کرتا کھلونوں کی طرح اچھی معلوم ہوتیں۔ وہ بہت دیر تک انھیں کے متعلق سوچتی رہی کہ پھولوں کے سر نیچے کو جُھک آئے تھے کیونکہ وہ تمام رات ناچ ناچ کر بہت تھک گئے تھے اور شاید بیمار بھی تھے۔ اس کے بعد وہ پھولوں کو اس کمرے میں لے گئی جہاں ایک خوبصورت میز پر بہت سے کھلونے پڑے تھے۔ یہ تو ایک طرف رہے میز کی دراز بھی خوبصورت چیزوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کی گڑیا صوفیہ اپنے بستر پر سو رہی تھی ننھی فیروزہ اس سے کہنے لگی "صوفیہ سچ مچ اب اٹھو بھی اور آج دراز ہی میں گزارہ کر لو۔ بیچارے پھول بیمار ہیں اپنا بستر انھیں دے دو۔ آرام کرنے سے یہ اچھے ہو جائیں گے۔" ننھی فیروزہ نے بستر سے گڑیا اُٹھالی۔ گڑیا نے بالکل چپ ہی سادھ لی۔ مُنہ سے ایک لفظ تک نہ بولی۔ شاید وہ خفا ہو گئی تھی کہ میں بستر سے کیوں نکالی گئی ہوں۔ خیر ننھی فیروزہ نے پھولوں کو بستر میں لٹا کر لحاف اوڑھا دیا اور ان سے کہنے لگی "اب چپکے سے سو جاؤ۔ اور اچھے بنو۔" اس کے بعد اس نے ان کے لئے کچھ چائے بنائی تاکہ انکی طبیعت اچھی ہو جائے اور وہ صبح سویرے اٹھ سکیں۔ پھر اس نے چارپائی

گے اردگرد کے پردے گرا دیتے تاکہ سورج کی چمک ان کی آنکھوں پر نہ پڑے۔ تمام شام وہ طالب علم کی سنائی ہوئی باتوں پر غور کرتی رہی اور سونے سے پہلے وہ پردے اٹھا کر باغ کی طرف جھانکنے لگی جہاں اس کی اماں کے تمام پھول سنبل اور لالہ وغیرہ کھلے تھے۔ وہ ان سے آہستہ سے کہنے لگی "ہاں معلوم ہو گیا ہے مجھے! آج شام رقص کو جا رہے ہو نا؟"

ایسا معلوم ہوا کہ پھول اس کی بات سمجھے ہی نہیں۔ جواب میں انکا ایک پتہ تک نہ ہلا۔ لیکن فیروزہ کو اب بھی یقین تھا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے وہ بستر پر لیٹے لیٹے بہت دیر تک جاگتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بادشاہ کے باغ میں خوبصورت پھولوں کے رقص کا نظارہ کتنا دلچسپ ہوگا۔ "معلوم نہیں میرے پھول بھی اس وقت سچ مچ وہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سو گئی۔ رات ہی میں وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ طالب علم، پھولوں اور اس ڈھیٹ وکیل کے خواب دیکھتی رہی تھی جو طالب علم میں نقص نکالتا رہتا تھا۔

اس کے کمرے میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ لیمپ میز پر روشن تھا۔ ننھی فیروزہ کے ماں باپ سو رہے تھے۔ "خدا جانے میرے پھول صوفیہ کے بستر ہی میں لیٹے ہیں۔ ہائے مجھے کس طرح معلوم ہو۔" وہ اپنی

جگہ سے تھوڑی سی سرکی اور اس کمرے کے دروازے کی طرف غور سے
دیکھنے لگی۔ جہاں اس کے کھلونے اور پھول پڑے تھے۔ یہ تھوڑا سا کھلا
تھا۔ جب اس نے کان لگا کر سنا تو اسے معلوم ہوا کہ کمرے میں کوئی پیانو
بجا رہا ہے لیکن ایسے عمدہ اور ایسے دلکش انداز سے جیسے پہلے کبھی نہ بجا ہو۔
وہ دل میں سوچنے لگی "یقیناً اس وقت تمام پھول رقص کر رہے ہیں۔
ہائے میرا دل چاہتا ہے کہ انھیں دیکھوں۔ کبھی وہ یہیں آجائیں نا۔ لیکن وہ
اپنے ماں باپ کی نیند اچاٹ ہو جانے کے خیال سے نہ اٹھی۔ پھول بھی اندر
نہ آئے۔ اور موسیقی ایسے دلکش اور سحر انگیز انداز سے فضا میں پھیلنے لگی کہ ننھی
فیروزہ اپنے بس میں نہ رہ سکی۔ وہ اپنے چھوٹے سے بستر سے سرکی آہستہ
آہستہ دروازے کی طرف گئی اور کمرے میں جھانکنے لگی۔ اوہو! سچ مچ
ہی وہاں ایک عجیب نظارہ تھا۔ لیمپ تو کوئی جل نہیں رہا تھا لیکن
کمرہ پھر بھی روشن تھا۔ چاندنی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی جس سے
کمرہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ سنبل اور للے کے تمام پھول دو لمبی قطاروں میں
قالین پر کھڑے تھے کھڑکی میں ایک پھول بھی باقی نہ رہا تھا اور تمام
گلدان خالی ہو گئے تھے۔ پھول نہایت سلیقے سے ایک دوسرے کے

لمبے لمبے پتوں میں پتے ڈال کر چاندنی کے فرش پر چک پھیریاں لے لے کر رقص کر رہے تھے۔ ایک بڑی سی زرد نرگس پیانو بجا رہی تھی۔ فیروزہ کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یقیناً یہ وہی خاتون ہے جو اس نے موسم گرما میں دیکھی تھی کیونکہ وہ طالب علم کا یہ فقرہ اب تک نہ بھولی تھی "یہ بالکل فیروزہ کی سہیلی نزہت کی ہم شکل ہے"۔ اس وقت تو سب طالب علم کی بات پر ہنس دیئے تھے لیکن اب فیروزہ کو معلوم ہونے لگا تھا کہ وہ لمبے قد کی زرد نرگس واقعی اس نوجوان لڑکی کی ہم شکل ہے۔ پیانو بجاتے وقت اس کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس کا لمبا سا زرد چہرہ کبھی ایک طرف کو اور کبھی دوسری طرف کو جھک آتا اور ہر تھوڑے سے وقفے کے بعد دلکش موسیقی سے مست ہو کر جھوم جھوم کر نیچے اوپر ہونے لگتا۔ اس کے بعد زعفران کا ایک ارغوانی پودا میز کے مرکز میں کود پڑا۔ جہاں کھیلنے کی چیزیں پڑی تھیں اور پھر بیمار پھولوں کی چارپائی سے پردے ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پھول اسے دیکھتے ہی اچک کر اٹھ بیٹھے اور ایک دوسرے کی طرف سر ہلا کر اشارے کرنے لگے کہ ہم ناچیں گے۔ ہم ناچیں گے۔ ہم ناچیں گے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے منہ والی بدمزاج گڑیا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سر جھکا کر پھولوں کو

آداب کہا۔ اب وہ بالکل بیمار نظر نہ آتے تھے۔ اور ادھر اُدھر ناچ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے ننھی فیروزہ کو نہ دیکھا۔ اتنے میں یوں معلوم ہوا گویا کوئی چیز زور سے میز پر سے نیچے گری ہے۔ فیروزہ نے اس طرف دیکھا ایک پتلی اور چھوٹی سی چھڑی پھولوں میں ناچ رہی تھی جیسے یہ بھی ان میں سے ایک ہو۔ تاہم یہ نہایت صاف سُتھری اور ملائم تھی اس پر ایک موم کا گُڈا بیٹھا تھا۔ جس نے ایک چوڑی سی کوردار ٹوپی پہن رکھی تھی جو بالکل ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جیسی اُس وکیل کی تھی۔ چھڑی نے پھولوں کے درمیان خوب ناچنا شروع کیا۔ چھڑی کے نیچے پاؤں بھی لگے تھے جن سے زور زور کی آواز نکلتی۔ لیکن پھول اس طرح کا آواز والا رقص نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ بہت ہلکے تھے اور ان کے پاؤں سے آواز نہ نکل سکتی تھی۔ یکایک موم کا گڈا جو چھڑی پر بیٹھا تھا لمبا اور اونچا ہونا شروع ہو گیا اور مڑ کر کاغذی پھولوں سے کہنے لگا "ایک بچے کی سمجھ میں ایسی واہیات باتیں کیسے آسکتی ہیں؟ کیسے بے ہودہ خیالات ہیں۔" اس کے بعد گڈا ہو بہو کوردار ٹوپی والا زرد رُو اور تند خو وکیل بن گیا۔ لیکن کاغذ کی گڑیوں نے اس کی پتلی پتلی ٹانگوں پر ایک مُکا رسید کیا اور وہ سکڑ کر

دوبارہ چھوٹا سا گُڈا بن گیا۔ یہ خوب دلچسپ واقعہ تھا۔ فیروزہ قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔ چھڑی ناچتی گئی اور ساتھ ساتھ وکیل کو بھی ناچنا پڑا۔ اسکے لئے نہ تو بڑا بننا کام آیا اور نہ چھوٹا سا بڑی ٹوپی والا گڈا بننا۔ اُسے بہرحال خوب ہی ناچنا پڑا۔ اس کے بعد دوسرے پھول بیچ میں کُود پڑے۔ خصوصاً وہ پھول جو گڑیا کے بستر میں تھے ــــــ جنھوں نے بڑی مشکل سے چھڑی کو ناچنے سے روکا۔ اسی لمحہ میں میز کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی وہیں فیروزہ کی گڑیا صوفیہ دوسرے کھلونوں میں پڑی سوتی تھی۔ بوڑھی بدمزاج گڑیا میز کے ایک کنارے کی طرف دوڑی اور چیت لیٹ کر اس نے تھوڑا سا راستہ نکالنے کے لئے میز کی دراز دھکیلنی شروع کی۔ صوفیہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اِدھر اُدھر نہایت حیرانی سے دیکھ کر کہا "آج رات ضرور یہاں رقص ہے۔ دیکھو مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"

بدمزاج گڑیا نے کہا "تم میرے ساتھ مل کر رقص کرو گی؟"

وہ اس کی طرف مڑ کر کہنے لگی "تمھیں تو ہو میرے ساتھ ناچنے کے قابل۔ اور ہے کون؟"

اس کے بعد وہ دروازے کے سرے پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ شاید کوئی پھول مجھ سے مل کر رقص کرنے کو کہے لیکن کوئی پھول نہ آیا۔ اس کے بعد وہ "ہم۔ ہم۔ ہم" کر کے کھانسنے لگی لیکن اس کے باوجود بھی کوئی نہ آیا اب میلی کچیلی گڑیا نے اکیلے ہی ناچنا شروع کیا اور اس کا رقص بھی کوئی اتنا برا نہیں تھا۔ اب تک چونکہ کسی پھول نے بھی صوفیہ کی طرف توجہ نہ دی تھی اس لئے اس نے زور سے میز پر سے فرش پر چھلانگ لگا دی تاکہ بہت آواز پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تمام پھول سیدھے اس کے گرد آجمع ہوئے۔ خصوصاً وہ پھول جو اس کے بستر میں سو چکے تھے اور پوچھنے لگے کہ "تمہارے چوٹ تو نہیں آئی" لیکن اسے چوٹ بالکل نہ لگی تھی فیروزہ کے پھولوں نے اس قدر عمدہ بستر کے لئے گڑیا کا شکریہ ادا کیا اور اس سے بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ وہ اسے کمرے کے وسط میں لے گئے جہاں چاند چمک رہا تھا اور اس سے مل کر رقص کرنے لگے اور دوسرے تمام پھولوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ صوفیہ بڑی خوش ہوئی۔ اور کہنے لگی "پھولو۔ بے شک ابھی تم میرا بستر اپنے ہی پاس رکھو" وہ ہرگز اس وقت دراز میں لیٹنا نہ چاہتی تھی لیکن پھولوں نے جواب میں اس کا بہت

بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "ہم زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے کل صبح ہم بالکل مر چکے ہوں گے۔ تم ننھی فیروزہ سے کہنا کہ ہمیں باغ میں زرد چڑیا کی قبر کے نزدیک دفن کر دے۔ موسم گرما میں ہم پھر جاگ اٹھینگے اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آئیں گے۔"

صوفیہ پھولوں کو بوسہ دے کر کہنے لگی "نہیں پھولو تم ہرگز نہ مرنا۔"

اس کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور بہت سے پھول ناچتے ناچتے اندر آداخل ہوئے فیروزہ کچھ معلوم نہ کر سکی کہ بادشاہ کے باغ کے سوا وہ اور کہاں سے آسکتے ہیں پہلے دو خوبصورت پھول سنہری تاج پہنے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ وہ بادشاہ اور ملکہ تھے۔ گلنار اور ننھے ننھے خوشبودار پتوں والے پودے ان کے پیچھے پیچھے تھے اور محفل کے ہر رکن کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے وہ اپنے ساتھ موسیقی کا سامان بھی لائے تھے۔ پوست کے بڑے بڑے پھول۔ مٹر کی خالی پھلیاں اور کچھ پیالہ نما پھول ان کے ساز، ڈفلیاں اور طبلے تھے۔ وہ خوب زور لگا لگا کر ساز بجا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے منہ بھی سرخ ہو چکے تھے۔ نیلی سنبل اور گل

کے پودوں نے اپنی گھنگروؤں کی شکل کے پھولوں کو خوب جھنجھنایا جیسے وہ سچ مچ کے گھنگرو ہوں۔ اس کے بعد اور بہت سے پھول آئے۔ صنوبر کے نیلے پھول۔ ارغوانی دل آرام، گل بہار اور وادی کے نیلوفر۔ اب انھوں نے مل کر رقص کرنا اور ایک دوسرے کے بوسے لینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک خوبصورت نظارہ پیدا ہو گیا۔

آخر کار پھولوں نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ فیروزہ بھی نہایت آہستہ آہستہ ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی ہوئی بستر پر جا لیٹی۔ اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس کے متعلق خواب دیکھتی رہی۔ جب صبح کو وہ بیدار ہوئی تو وہ تیزی سے چھوٹی میز کی طرف لپکی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ پھول ابھی تک وہیں ہیں یا نہیں؟ اس نے چھوٹی سی چارپائی کے پردے ایک طرف ہٹائے۔ سب پھول وہیں پڑے تھے لیکن مُردہ ـــــ اُن کی حالت کل سے بھی خراب ہو گئی تھی۔ صوفیہ اسی دراز میں لیٹی تھی جہاں فیروزہ نے اُسے سُلایا تھا لیکن اس وقت وہ بہت خواب آلودہ معلوم ہو رہی تھی۔

فیروزہ کہنے لگی "تمھیں یاد ہے کہ پھولوں نے تمہیں میرے لئے کیا پیغام دیا تھا؟" لیکن صوفیہ نے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا اور نہایت

نامعقول نظر آنے لگی۔

فیروزہ کہنے لگی "تم ذرا بھی نرم دل نہیں ہو۔ پھر بھی وہ سب تم سے مل کر ناچتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے مُردہ پھولوں کو ایک چھوٹے سے ڈبے میں رکھ دیا جس پر خوبصورت پرندوں کی رنگین تصویریں بنی تھیں اور کہنے لگی۔ "یہ تمھارا خوبصورت کفن ہے۔ تھوڑی دیر میں میرے ممیرے بھائی مجھ سے ملنے آئیں گے۔ وہ تمھیں باغ میں دفن کرنے میں مجھے مدد دینگے تاکہ اگلے موسم گرما میں تم پھر اُگ آؤ اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگو۔"

اس کے ممیرے بھائی نہایت خوش مزاج لڑکے تھے۔ ایک کا نام خالد اور دوسرے کا نام ساجد تھا۔ ان کے ابّا نے انھیں ایک ایک تیر کمان لے دیا تھا۔ جو فیروزہ کو دکھانے کے لئے ساتھ لائے تھے۔ فیروزہ نے اُن کو بیچارے پھولوں کی کہانی سُنائی جو مر چکے تھے۔ بڑوں سے اجازت لیتے ہی وہ فیروزہ کے ساتھ انھیں دفن کرنے باغ کو چل دیئے۔ آگے آگے دونوں لڑکے کندھوں پر تیر کمان اُٹھائے جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے ننھی فیروزہ مُردہ پھولوں کا خوبصورت ڈبّا اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ باغ میں انھوں نے ایک چھوٹی سی

قبر کھودی۔ فیروزہ نے اپنے پھولوں کو چوم لا انھیں ڈبے میں رکھا اور مٹی میں دفن کر دیا۔ سب سے آخر میں خالد اور ساجد دونوں بھائیوں نے قبر پر ایک ایک تیر چلایا کیونکہ ان کے پاس نہ تو بندوقیں تھیں اور نہ توپیں۔

برف کا آدمی

برف کا آدمی

برف کا آدمی پکار اُٹھا "کتنی خوشگوار سردی ہے اور اس ہوا نے تو مجھ میں زندگی کی روح پھونک رکھی ہے۔ میرا تمام جسم مرمرا رہا ہے۔ اور وہ اکوئی بڑی سی سُرخ سُرخ چیز میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے"! سُرخ چیز سے اس کی مراد سورج تھی جو اب غروب ہو رہا تھا۔۔۔۔ "یہ نظارہ تو مجھے آنکھیں بھی جھپکنے نہ دے گا۔ میں ان "دو ٹکڑوں" کو نیچے نہ گرنے دوں گا۔"

اسے کھپرے کی دو تکونی آنکھیں بنا کر لگائی گئی تھیں۔ مُنہ کی جگہ ایک چھوٹی سی دندانے دار لکڑی لگی تھی جس کی نوکیں بالکل دانت معلوم ہوتی تھیں اسے چھوٹے لڑکوں نے چیخیں مارتے ہوئے ہوا میں چابک گھما گھما کر "شاں شاں" کی آوازوں اور برف گاڑیوں کی گھنٹیوں کے شور میں بنایا تھا۔

سورج غروب ہو گیا اور چودھویں کا بڑا سا گول گول صاف ستھرا چاند

گہری نیلاہٹوں کے پردے سے چمکتا ہوا باہر نکل آیا۔

برف کا آدمی کہنے لگا۔ "وہی چیز اب دوسری طرف سے نکل آئی ہے" ـــــ وہ سمجھتا تھا کہ ایک دفعہ پھر سورج اسے اپنا آپ دکھانے آیا ہے ـــــ "اہاہاہا! اب! میں نے اس کا خوب علاج کر لیا ہے۔ اب یہ تیز تیز نگاہوں سے میری طرف نہیں گھور سکتا۔ اب یہ لٹکتا رہے گا وہیں۔ اور چمکتا رہے گا۔ تاکہ میں اسے خوب غور سے دیکھ سکوں۔ کاش میں ہلنا جلنا جانتا اور ذرا اِدھر اُدھر چل پھر کر بھی دیکھتا۔ میرا جی ترس رہا ہے۔ اگر میں پھسل سکتا تو ضرور ان لڑکوں کی طرح پھسل کر برف پر دور دور تک چلا جاتا۔ سمجھ میں نہیں آتا یہاں سے کیسے ہلوں۔ بھاگنا بھی نہیں آتا۔"

صحن کا کُتّا بھونک کر کہنے لگا "دِے، دِے اُوہ!!" پہلے وہ صحن کی بجائے اندر رہا کرتا تھا اور آگ کے قریب نہ بیٹھنے سے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس کے منہ سے اب "بوؤ! واؤ! واؤ!!" کی بجائے "دِے دِے اُوہ!" نکلتا تھا۔ وہ برف کے آدمی سے کہنے لگا "سورج تمہیں یہاں سے بھگا دے گا۔ گذشتہ سرما میں میں نے دیکھا تھا کہ اس نے تمہارے پیشرو کو اور تمہارے پیشرو کے پیشرو کو بھگا دیا تھا۔ تم سب کو دور بہت دور جانا ہے۔"

برف کا آدمی کہنے لگا "دوست میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔ کیا وہی چیز جو دور بہت دور نظر آ رہی ہے مجھے دوڑنا سکھلائے گی؟ کچھ عرصہ پہلے میں نے بھی اسے دوڑتے ہوئے دیکھا تھا اور اب یہ رینگتی ہوئی دوسری سمت سے نکل آئی ہے۔"

کتّا کہنے لگا "تمہیں کچھ معلوم نہیں!۔ جو چیز تمہیں دور سے دکھائی دے رہی ہے چاند ہے اور جو تم نے پہلے دیکھی ہے وہ سورج! میں کل پھر آؤں گا اور غالباً ضرور تمہیں کنوئیں کے قریب ایک کھوہ میں دوڑ کر داخل ہونا سکھاؤں گا۔ کیونکہ میرا خیال ہے موسم بدل رہا ہے میں اپنی بائیں ٹانگ میں چبھن اور کچھ ٹیس سی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ موسم بدل جائے گا۔"

برف کا آدمی آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "میں اس کی باتیں تو نہیں سمجھا البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ناخوشگوار بات ہی بتا رہا تھا۔ وہ چیز جو تھوڑی دیر پہلے میری طرف گھور گھور کر دیکھتی تھی اور جسے یہ سورج کہتا ہے میری دوست نہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا!"

کتّا پھر بھونکا ــــ "وے، وے اوہ!!" اور اپنے بھٹ میں سونے

کے لئے رینگ کر گھس گیا۔

موسم سچ مچ ہی بدل رہا تھا۔ صبح تمام شہر پر دھند چھا گئی اور پھر تیز ہوا چلنے لگی۔ اتنی سردی ہوگئی جو لوگوں کی ہڈیاں منجمد کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب سورج نکلا تو کچھ اور ہی شاندار نظارہ دیکھنے میں آیا جھاڑیوں اور درختوں کی شاخیں پالے سے اٹی پڑی تھیں اور وہ سفید مونگے کا کوئی جنگل معلوم ہوتے تھے۔ درختوں کی ہر شاخ پر شبنم کے منجمد قطرے چمکنے لگے بہت سی اچھی اچھی شکلیں جو موسم گرما میں سبز پتوں سے ڈھپنی پڑی تھیں۔ اب صاف صاف نظر آرہی تھیں۔ جیسے لیس فیتوں کے گل بوٹے ہوں۔ ہر شاخ پر سفید نور جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ موسم گرما کے درختوں کے مانند کیمٹ کے درخت نے بھی ہوا میں جھوم جھوم کر اپنے آپ میں جان ڈال رکھی تھی۔ اور یہ کوئی عجیب خوبصورت چیز معلوم ہوتا تھا اور جن نیلی دوریوں میں سورج چمک رہا تھا۔ وہاں کی ہر چیز یوں جھلمل جھلمل کرتی نور کی شعاعیں برساتی معلوم ہوتی تھی جیسے وہاں نور پاش ہیروں کا برادہ چھڑک دیا گیا ہو زمین کا برفانی قالین یوں نظر آتا تھا جیسے اس پر الماس کی تہ بچھ گئی ہے۔ اور اس فرش سفید سے

برف سے بھی زیادہ سفید روشنی کی اَن گنت شعاعیں نکل رہی تھیں ۔

ایک نوخیز لڑکی ایک نوجوان کے ہمراہ باغ میں آئی آتے ہی پکار اُٹھی "گرمی کا موسم اس سے زیادہ خوش منظر نہیں پیش کر سکتا !"...... یہ کہکر اُس کی آنکھوں میں نور جھلملا اُٹھا ۔

نوجوان برف کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا "اور گرمیوں میں ہمیں کوئی ایسا شخص کب ملتا ہے ۔ یہ کتنا عمدہ ہے"۔

لڑکی نے مُسکرا کر برف کے آدمی کے سامنے آہستہ سے اپنا سر جھکایا اور پھر اپنے محبوب کے ساتھ برف پر چلتی ہوئی دُور نکل گئی ۔ اور برف اس کے قدموں کے نیچے خشک پتوں کی طرح چڑ چڑ کھڑ کھڑ کرتی گئی ۔

برف کا آدمی کتے سے کہنے لگا "یہ دو کون تھے ؟ تم میری نسبت یہاں زیادہ عرصے سے ٹھہرے ہوئے ہو ۔ تم انھیں جانتے ہو ۔"؟

کتا کہنے لگا "جانتا ہوں جانتا کیوں نہیں ۔ اس لڑکی نے کئی دفعہ میری پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا ہے اور اس نوجوان نے مجھے ایک دفعہ بڑی سی ہڈی بھی دی تھی ۔ میں ان دونوں کو کبھی نہیں کاٹتا ۔"

برف کا آدمی کہنے لگا "لیکن ان کا نام کیا ہے ؟"

"ایک محبوب ہے اور ایک عاشق۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ جا کر ایک ہی بھٹ میں رہنے لگیں گے اور ایک ہی ہڈی سے نوچ نوچ کر گوشت کھایا کریں گے....... وے۔! اوہ!!"

برف کا آدمی کہنے لگا۔ "کیا یہ بھی اسی نسل سے ہیں جس سے میں اور تم؟"

کتا فوراً بولا۔ "ہاں ان کا آقا ایک ہی ہے۔ جو لوگ ابھی کل پیدا ہوئے ہیں کیا جانیں۔ یہی کمی مجھے تم میں بھی نظر آرہی ہے۔ میں معمر اور تجربہ کار ہوں اور یہاں گھر میں ہر کسی کو جانتا ہوں۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب میں زنجیر سے بندھا یہاں سردی میں نہیں پڑا رہتا تھا وے، وے اوہ!!"

برف کا آدمی کہنے لگا "خیر سردی تو خوشگوار رہی ہے البتہ تم مجھے یہ سب باتیں ضرور سناؤ۔ صرف اپنی زنجیر کو یوں نہ چھنچھناؤ۔ کیونکہ جب تم ایسا کرتے ہو تو اس کی چھن چھن مجھے اپنے میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے"

"وے اوے اوہ!!" اب کتا زور سے بھونکا اور کہنے لگا۔ "لو سنو! کبھی میں چھوٹا سا اور بہت خوبصورت ہوتا تھا۔ اس وقت میں ایک مخملیں کرسی پر سویا کرتا تھا۔ اوپر آقا کے مکان میں۔ گھر کی مالکہ مجھے اپنی گود میں

بٹھایا کرتی تھی۔ سب لوگ میری ناک کے بوسے لیا کرتے اور میرے پنجے ایک بیل بوٹوں والے رومال سے صاف کیا کرتے تھے وہ سب مجھے "ایمی پیارا ایمی شیریں ایمی" کہا کرتے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد میں انکی نظر دں میں بہت برا ہوگیا اور انھوں نے مجھے نوکر کے کمرے میں بھیجدیا۔ اس طرح میں نچلی منزل میں آیا۔ تم اپنی جگہ سے اس کمرے میں نظر ڈال سکتے ہو جس کا کبھی میں مالک تھا۔ سچ کہتا ہوں کہ نوکر کا آقا میں ہی تھا۔ یہ کمرہ اوپر والے کمروں سے ذرا چھوٹا تو تھا لیکن اس میں مجھے آرام خوب ملتا تھا کیونکہ اب پہلے کی طرح مسلسل طور پر بچے مجھے پکڑتے اور ادھر اُدھر دھکیلتے نہیں رہتے تھے۔ مجھے اب پہلے کی طرح اچھی خوراک ملتی یا اس سے زیادہ اچھی۔ ایک گدیلا میرا اپنا تھا۔ ایک چولھا بھی ہوتا تھا۔ سال کے اسی موسم میں یہ دنیا کی عمدہ ترین چیز بن جاتا ہے۔ میں بالکل اس کے نیچے گھس جاتا اور وہیں پڑا رہتا آہ مجھے اب بھی اس چولھے کے خواب آتے ہیں۔ وے وے اوہ!"

برف کا آدمی پوچھنے لگا "چولھے کی شکل تو بہت اچھی ہوگی؟ کیا وہ میری طرح ہے؟"

کتا کہنے لگا "نہیں، اس کی شکل تم سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا رنگ اتنا ہی کالا ہے جتنا کسی کوّے کا۔ اور گردن لمبی سی۔ اس کا پیتل کا ایک ناب بھی ہوتا ہے۔ اس کی خوراک لکڑی ہے اور آگ اس کے منہ سے کود کود کر باہر نکلتی رہتی ہے۔ آرام لینا ہو تو اس کے ایک طرف یا اس کے نیچے بیٹھنا چاہیے۔ جہاں تم کھڑے ہو وہاں سے کھڑکی میں ایک نگاہ ڈالو تمہیں سب کچھ نظر آجائے گا۔"

برف کے آدمی نے اندر دیکھا۔ اسے وہاں کالے رنگ کی ناب والی ایک صیقل کی ہوئی چمکدار چیز نظر آئی۔ آگ اس کے نچلے حصے میں چمکارے مارتی نظر آتی تھی۔ برف کے آدمی کو اپنے وجود میں عجیب طرح کی ایک سنسنی محسوس ہوئی۔ یہ ایک عجیب و غریب چیز تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے مطلب کیا ہے۔ اسے اس کے متعلق کوئی اندازہ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو برف کے نہیں بنے ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ برف کا آدمی کہنے لگا "تم نے اسے کیوں چھوڑا۔ اتنی خوبصورت چولھا کو چھوڑنا تمہارے دل نے کیسے گوارا کیا؟" ــــ برف کے آدمی کا خیال تھا کہ چولھا ضرور مؤنث ہی ہو سکتا ہے۔

کتّے نے جواب دیا "مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ خود ہی انھوں نے دروازے سے باہر نکال مجھے یہاں باندھ دیا۔ بات یوں ہوئی کہ میں نے اپنے آقا کے سب سے چھوٹے لڑکے کی ٹانگ کو کاٹ کھایا۔ کیونکہ اس نے پاؤں کی ایک ٹھوکر لگا کر میری ہڈی کو پرے پھینک دیا تھا جو میں بڑے مزے سے کھا رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ہڈی کے بدلے ہڈی ملے، لیکن وہ سب تو مجھ سے بہت ہی خفا ہو گئے۔ اور اسی دن سے میں یہاں زنجیر سے بندھا پڑا ہوں مجھے اب ہڈی بھی نہیں ملتی۔ سُنتے نہیں میں کتنا گلوگرفتہ ہو رہا ہوں۔ وِے، وِے، اُوہ! کے سوا دوسرے کتّوں کی طرح میں کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتا۔ وِے، وِے، اُوہ!"

لیکن برف کا آدمی کچھ نہیں سُن رہا تھا۔ اسی کے قد کے برابر ایک چولھا ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا "اُف میں اپنے اندر ایک عجیب چیز سی محسوس کر رہا ہوں۔ کیا میں بھی کبھی وہاں جا سکوں گا! یہ ایک معصوم خواہش ہے اور معصوم خواہشیں یقیناً پوری ہو جاتی ہیں جہاں وہ کھڑی ہے میں وہاں جا کر اس کے آگے جھکنا چاہتا ہوں خواہ مجھے کھڑکی ہی نہ توڑنی پڑے۔"

کتا کہنے لگا تمہیں ہرگز اندر نہیں جانا چاہیئے کیونکہ اگر تم اسکے قریب گئے تو پگھل جاؤ گے"۔

برف کا آدمی کہنے لگا "نہیں میں ضرور جاؤں گا ۔ اب بھی تو میں مرک رہا ہوں"؟

تمام دن برف کا آدمی کھڑکی میں سے اندر دیکھتا رہا۔ شفق کے وقت چولھا اور بھی زیادہ دلکش نظر آنے لگا کیونکہ اس سے نرم نرم روشنی نکل رہی تھی۔ سورج یا چاند کی روشنی نہیں بلکہ یہ وہ روشنی تھی جو کسی چولھے سے اس وقت چمک چمک کر نکلتی ہے جب اس نے سیر ہو کر لکڑیاں کھائی ہوں جب چولھے کا دروازہ کھولا گیا تو آگ کی لپٹیں اچک کر اس کے منہ سے باہر نکل آئیں۔ تمام چولھوں کی یہی عادت ہے۔ آگ کی سرخ سرخ روشنی سیدھی آن کر برف کے آدمی کے چہرے اور چھاتی پر پڑی وہ کہنے لگا "اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جب یہ اپنی زبان باہر نکالتی ہے تو کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے"۔

رات لمبی تھی۔ لیکن برف کے آدمی کو مطلق اس کا احساس نہ ہوا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں مست سردی سے مرکتا ہوا لطف اٹھا رہا تھا۔ صبح ہو گئی

نوکر کے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے برف سے ڈھنپے گئے۔ یہ کسی برف کے آدمی کے دیکھنے کے لائق برف کے خوبصورت ترین پھول تھے۔ لیکن انھوں نے چولھے کو چھپا رکھا تھا۔ شیشوں پر سے برف پگھلتی ہی نہیں تھی اور اسے چولھے کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ اسے کوئی خوبصورت انسانی مخلوق تصور کرتا تھا۔ برف مرکنے لگی اور ہوائیں اس کے گرد سیٹیاں بجانے لگیں۔ یہ ایک ایسا یخ بستہ موسم تھا جس سے کوئی برف کا آدمی خوب ہی لطف اٹھا سکے لیکن وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ اسے کب کوئی چیز خوش کر سکتی تھی۔ جب اسے چولھے سے محبت ہو چکی تھی +

کتا کہنے لگا "کسی برف کے آدمی کے لئے یہ ایک نہایت خوفناک مرض ہوتا ہے میں بھی اس میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن میں نے اس سے نجات پالی وے، وے، اوہ! موسم بدل رہا ہے"

سچ مچ ہی موسم بدلنے لگا۔ برف پگھلنے لگی گرمی بڑھنے لگی اور برف کا آدمی گھٹنے لگا۔ وہ خاموش رہا اور شکایت کا کوئی لفظ تک ہونٹوں پر نہ لایا اور آخر ایک صبح وہ ٹوٹ کر زمین پر آگرا اور اب وہاں جھاڑو کے ڈنڈے کی سی کوئی چیز زمین میں گڑی تھی +

کتّا کہنے لگا "آہ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ چولھے کے لئے کیوں اسقدر مضطرب تھا — وُہ! یالنس کے ایک طرف ایک کرچھا لگا ہے جس سے چولھا صاف کیا جایا کرتا تھا۔"

برف کے آدمی کے جسم میں ایک کرچھا تھا اور اس نے اسے اس قدر بے تاب کر رکھا تھا۔

کتا بھونکنے لگا "دے، دے، اوہ! پر اب تو اس کا خاتمہ ہی ہو چکا ہے" سرما بہت جلد گذر گیا اور اب گھر میں لڑکیاں یہ گیت گاتی تھیں:۔

"تُم کے سرسبز درخت! اپنے خوشبودار گھر سے باہر نکل!

اور اے بید مجنوں اپنی نرم نرم شاخیں پھیلا لے!

گذرتے ہوئے مہینے، بہار کا شیریں موسم قریب سے قریب تر لا رہے ہیں۔

اب چنڈول آسمان کی بلندیوں میں شیریں نغمے گائے گا۔

اے خوشگوار سورج! کوئل کے گاتے گاتے نکل آ!

تاکہ ہم اپنے سروں میں اسکے گیتوں کی نقلیں کریں۔"

اور اب کبھی کسی نے برف کے آدمی کو یاد نہ کیا۔

ایک ماں

ایک ماں

چاند نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو کھڑکی سے جھانک کر یہ کہانی سنائی۔

کہنے لگا ایک دفعہ فرانک فورٹ میں مَیں ایک عمارت کو خاص طور پر غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ مکان نہیں تھا جہاں گوئٹے پیدا ہوا تھا۔ نہ یہ پرانا کونسل چیمبر تھا جس کی کھڑکیوں سے اُن بیلوں کے سینگ باہر نکلے ہوئے ہیں۔ جن کا گوشت بھون کر شہنشاہ کی رسم تاجپوشی پر لوگوں میں تقسیم کیا گیا تھا نہیں یہ معمولی حیثیت کا ایک مکان تھا۔ سادہ سا۔ اس پر سبز رنگ کیا گیا تھا۔ یہ یہودیوں کے پرانے مکانوں کے نزدیک کھڑا تھا۔ اس میں روت کی اولاد رہا کرتی تھی۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جھانکا۔ زینہ چکا چوند روشن تھا۔ خادم چاندی کے بڑے بڑے شمعدانوں میں موم بتیاں لئے

کھڑے تھے اور ایک۔ بوڑھی عورت کو جسے ایک پالکی میں بٹھا کر سیڑھیوں سے چڑھے لایا جا رہا تھا جُھک جُھک کر سلام کر رہے تھے۔ صاحب خانہ ننگے سر کھڑا تھا۔ اس نے نہایت ادب سے بوڑھی اماں کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ یہ اس کی ماں تھی جس نے نہایت شفقت سے اسے اور نوکروں کو دیکھ کر سر کو جنبش دی۔ اس کے بعد وہ اسے ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک چھوٹے سے مکان کی سمت لے گئے جو اس کی جائے سکونت تھی اس کی اولاد اس گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ اسی گھر میں خوش قسمتی نے بڑھ کر ان کے قدم لئے تھے۔ بوڑھی عورت کو یقین تھا کہ اگر میں بھی اس چھوٹے سے مکان کو جسے اب سب بھلا چکے ہیں چھوڑ کر ویران کر گئی تو قسمت خدا نخواستہ میرے کُنبے کو ویران کر جائے گی "

چاند نے کچھ اور نہ بتایا کیونکہ اس شام وہ بہت تھوڑی دیر کے لئے آیا تھا لیکن لڑکا اس تنگ گلی میں رہنے والی عورت کے متعلق بہت دیر تک سوچتا رہا۔ صرف ایک لفظ کی دیر تھی اس کے لئے دریائے ٹیمز کے کنارے ایک عالی شان مکان کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ ایک لفظ کی دیر سی آن کی آن میں اس کے لئے خلیج نیپلز کے کنارے پر ایک نہایت خوبصورت

کوٹھی بنوائی جاسکتی تھی۔

"اگر میں نے اس تنہا مکان کو چھوڑ دیا۔ جہاں قسمت نے میرے بیٹوں کو مالا مال کیا تھا تو قسمت بھی میرے بیٹوں کا ساتھ چھوڑ دیگی"

یہ ایک وہم تھا ایک ایسی قسم کا وہم کہ اگر کوئی شخص جو یہ کہانی سنے اور اسکا مطلب سمجھنا چاہے تو تشریح آئے صرف دو لفظ کافی ہوں اور وہ دو لفظ یہ ہیں:۔

ایک ماں۔

گندم کے پودے کی موت

گندم کے پودے کی موت

اکثر ہی دیکھا گیا ہے کہ رعد و برق کے ایک تیز و تند طوفان کے بعد موٹے گندم کا کھیت جھلس کر سیاہ پڑ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کی لپٹ اس پر سے گذر گئی ہے۔ دیہاتی تو کہتے ہیں کہ کھیت کی شکل بجلی بگاڑ گئی ہے لیکن میں تمھیں بتاتا ہوں کہ چڑیوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ چڑیوں نے یہ بات ایک بوڑھے بید کے درخت سے سنی تھی جو موٹے گندم کے کھیت کے قریب اُگا تھا اور اب تک وہیں ہے یہ بہت بڑا درخت ہے اور اس کی تعظیم کرنا ہر ایک کا فرض ہے۔ اگرچہ عمر کے تقاضے سے اس کے اعضا بیکار ہو چکے ہیں۔ اس کا تنا پھٹ چکا ہے اور اس کے اندر گھاس اور خار دار بوٹیاں اُگ آئی ہیں۔ یہ تھوڑا سا آگے کو جھکا ہے اور اسکی شاخیں لٹک کر زمین تک آ پہنچی ہیں جو بالکل اس کے سبز سبز بال معلوم ہوتی ہیں۔ آس پاس کے تمام

کھیتوں میں غلّہ اُگا ہے صرف بڑے بڑے یو گندم اور جو ہی نہیں بلکہ جئی بھی ـــ خوبصورت جئی جو یک کر یوں معلوم ہوتی ہے جیسے چھوٹی چھوٹی سنہری چڑیوں کا کوئی جھنڈ شاخوں پر بیٹھا ہے غلّے کے کھیت عموماً مسکراتے رہتے ہیں۔ بھاری بھاری اور عمدہ بالیں پودوں کے سر نیچے جھکا دیتی ہیں اور پودے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بہت ہی عاجز اور نیک ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہاں موٹے گندم کا بھی ایک کھیت تھا یہ کھیت بید کے درخت کے عین بالمقابل اُگا تھا۔ اس کا ایک پودا دوسرے پودوں کی طرح کسی طرح اپنا سر نیچا نہ کرتا تھا اور اکڑ کر نہایت غرور سے کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا "میں بھی اتنا ہی معزز ہوں جتنے دوسرے قیمتی پودے اور میں اوروں سے زیادہ خوش رُو ہوں۔ میرے پھول سیب کے پھولوں کی طرح خوشنما ہیں۔ کون ہے جو مجھ سے زیادہ حسین ہو؟ بتاؤ کوئی ہے؟ بتا اے بوڑھے کھوسٹ بید!!"

بوڑھے بید نے جواب میں سر کو یوں جنبشیں دیں جیسے وہ کہہ رہا ہے "ہے! ہے!! ہے!!!"

لیکن موٹے گندم کا یہ نامعقول پودا غرور سے تن کر کھڑا ہو گیا اور پھر

آپ ہی آپ بڑبڑا کر کہنے لگا۔ "نامعقول درخت! اتنا بوڑھا ہو گیا ہے۔ کہ اس پر گھاس بھی اُگ آئی ہے۔"

اس کے بعد یوں ہوا کہ ایک سخت خوفناک طوفان آیا۔ کھیتوں کے تمام پھولوں نے سہم کر یا تو اپنی پتیاں سمٹالیں یا اپنے چھوٹے چھوٹے سر نیچے جھکا دیے۔ طوفان چپکے سے ان پر سے گذر گیا۔ لیکن موٹے گندم کا پودا نخوت سے اکڑا کھڑا رہا۔ پھول بہتیرا سمجھاتے رہے کہ "ہماری طرح سر جھکا لو" مگر اس نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی۔

اس کے بعد غلّے کی بالوں نے بھی چلّا چلّا کر اس سے کہا "ہماری طرح سر جُھکا لو! جھکا لو! جھکا بھی لو!! طوفان کا فرشتہ آ رہا ہے۔ اس کے پر آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تم رحم کے لئے چیخو۔ وہ تمہیں بیخ کر زمین پر دے مارے گا۔"

لیکن موٹے گندم کا پودا بڑے اطمینان سے بولا "بھئی مجھے تو جھکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اب بوڑھا بید بھی بولا۔ کہنے لگا "اپنے پھول بند کر لو اور سر جھکا لو اور جب بادل پھٹیں تو آسمان میں مت جھانکنا۔ یہ تو آدمی بھی نہیں کر سکتے بجلی

کے ایک بار کوندنے سے آسمان کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ دیکھنے کو تو ہم اندر دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ نظارہ انسانوں کو بھی اندھا کر دیتا ہے پھر ہماری کیا بساط جو ایسی جرأت کریں ــــ ہم جو زمین کی پیداوار ہیں اور ہر بات میں اُن سے کم ہیں۔"

پودا بڑے تمسخر سے کہنے لگا کم! کم؟ سچ مچ!؟ اچھا اب تو میں آسمان میں ضرور جھانکوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے نہایت بے باکی سے اوپر دیکھا اور اپنی پُر غرور نگاہیں آسمان پر جما دیں۔ بجلی آسمان کے آر پار نہایت غضب سے بھڑکی اور تمام دُنیا کو آگ لگتی ہوئی محسوس ہوئی ....

جب یہ دہشتناک طوفان خاموش ہو چکا تو پھولوں نے اپنے جھکے ہوئے سر بارش سے دُھلی ہوئی پاکیزہ اور ساکن ہوا میں اوپر اٹھائے لیکن افسوس بیچارہ موٹے گندم کا پودا ایک بیکار شے کی طرح کھیت میں گر پڑا تھا۔ اس کا جسم بجلی نے جلا کر سیاہ کر ڈالا تھا۔

بوڑھے بید کی شاخیں تیز ہوا میں سرسرانے لگیں۔ اس کے سرسبز پتوں سے پانی کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے یوں معلوم ہوا جیسے وہ رو رہا ہے۔

چڑیاں اس سے کہنے لگیں "آس پاس کی ہر چیز اتنی مسرور ہے۔ تم کیوں روتے ہو؟ دیکھتے نہیں سورج کس طرح چمک رہا ہے اور بادل نیلے آسمان پر تیر رہے ہیں۔ کیا پھولوں اور جھاڑیوں کی خوشبو تمھیں نہیں آرہی؟ تم کیوں رو رہے ہو؟"

بید نے انھیں دیو گندم کے پودے کی خود پسندی اور غرور کا غمناک قصّہ سُنایا اور بتایا کہ اسے کس قدر دردانگیز سزا ملی ہے۔

یہ کہانی ایک شام مجھے چڑیوں نے سنائی تھی جب میں نے ان سے کہا تھا کہ "اچھی چڑیو کوئی کہانی تو سُناؤ۔"

بید مجنوں کے تلے

بید مجنوں کے تلے

زیلینڈ کا چھوٹا سا شہر کوج سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہ ایک سنسان اور بنجر علاقہ ہے۔ ارد گرد ہموار کھیت پھیلے ہیں۔ سر سبز جنگل یہاں سے بہت دور ہے۔ سمندر ہمیشہ بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن ممکن ہے اور جگہوں کے قریب سمندر یہاں کے سمندر سے زیادہ خوبصورت ہو۔ کیونکہ جب کوئی کسی جگہ بہت عرصہ رہے اور پھر وہاں سے چلا جائے تو ضرور کبھی نہ کبھی اُسے وہاں کی یاد ستاتی ہے۔ اس کے دل کو وہاں کی کسی نہ کسی چیز کی کشش ضرور کھینچتی ہے۔ خواہ وہ دُنیا کے کسی حسین ترین خطہ میں کیوں نہ رہتا ہو۔ وطن کی یاد بھی کچھ ایسی ہی درد انگیز ہے۔ اسے بھی دل کبھی بھلا نہیں سکتا۔

اس شہر کے قرب و جوار میں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے جو اپنی گود میں خوبصورت لہریں لئے سمندر کی طرف بیتابانہ دوڑتی چلی جاتی

ہے کچھ گھٹیا سے باغ لگے ہیں۔ گرمیوں میں یہ باغ بہت خوبصورت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ دو چھوٹے بچوں کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔ ان کے والدین ایک دوسرے کے ہمسائے تھے۔ بچّے انھیں باغوں میں کھیلا کرتے۔ انھیں درختوں کی باڑ لگا کر ایک دوسرے سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ وہ درختوں کی شاخوں کو ہاتھوں اور بازوؤں سے پرے ہٹاتے کودتے پھاندتے ایک باغ سے دوسرے باغ میں نکل جاتے۔ ان باغوں میں سے ایک میں شاہ بلوط کا ایک درخت اُگا تھا اور دوسرے میں ایک بوڑھا بید مجنوں۔ بچے اسی درخت کے نیچے کھیلنا پسند کیا کرتے تھے۔ انھیں اجازت تھی کہ یہاں آ کر کھیلا کریں۔ باوجودیکہ یہ درخت ندی کے بہت قریب واقع تھا اور بچوں کے ندی میں گر جانے کا بہت خطرہ تھا۔ لیکن خدا کی آنکھ ہر وقت چھوٹے بچوں کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ نہیں تو وہ کبھی محفوظ نہ ہوں۔ خود وہ بھی پانی کے بہت قریب جانے کی جرأت نہ کرتے۔

ایک لڑکا تو پانی سے بہت ہی زیادہ خوف زدہ رہتا۔ موسم گرما میں جبکہ دوسرے بچّے سمندر میں کھیلتے اور پانی کے چھینٹے اُڑاتے پھرتے۔ وہ کنارے ہی پر تنہا کھڑا رہتا۔ اور باوجود اصرار کے ان سب کا شریک نہ

ہوتا۔ وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ وہ یہ
سب کچھ صبر سے سُن لیا کرتا ایک دفعہ اس لڑکے کے ہمسائے کی چھوٹی سی
لڑکی جوانا نے خواب دیکھا کہ وہ ایک کشتی میں بیٹھی سیر کر رہی تھی کہ کینیوٹ (لڑکے
کا نام تھا) پانی میں لڑکھڑاتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ پانی اُس کی گردن تک
آگیا اور پھر سر سے اوپر تک اور ایک ہی لمحے میں وہ پانی میں ڈوب گیا"۔
کینیوٹ نے جب یہ خواب سُنا تو وہ دل میں کہنے لگا "اب ہنسی مذاق کی حد
ہو چکی ہے" جوانا کے خواب کے بعد اب وہ کس طرح پانی میں جانے کی جرأت
کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا کہ "میں پانی میں کبھی نہ آؤں گا۔" یہ خواب ہی اس
کے لئے کافی تھا۔

ان دو بچوں کے والدین بہت غریب تھے۔ اور اکثر اکٹھے بیٹھ کر
باتیں کیا کرتے۔ اس وقت موقع پا کر کینیوٹ اور جوانا باغ میں کھیلنے چلے
جاتے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بید کے درختوں کی ایک قطار لگائی گئی تھی تاکہ
یہ اس خندق سے علیحدہ رہے جو اس کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی یہ درخت
کچھ اتنے زیادہ خوبصورت نہیں تھے۔ کیونکہ ان کی چوٹیاں کاٹ ڈالی گئی تھیں
وہ نمائش اور خوبصورتی کے لئے نہیں بلکہ فائدے کے لئے لگائے گئے تھے۔

البتہ بوڑھا بید مجنوں جو باغ میں اُگا تھا بہت ہی خوبصورت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچوں کو اس کے نیچے بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔

شہر میں ایک بڑی منڈی تھی۔ جب وہاں میلہ لگتا تو عجیب و غریب چیزیں بکنے آجاتیں۔ کہیں ریشمی کپڑوں کے ڈھیر لگ جاتے کہیں کھلونوں کی دکانیں لگ جاتیں۔ کہیں طرح طرح کی مٹھائیاں اور کیک بکنے کے لئے سج جاتے غرضیکہ ایک ایک چیز میلے میں بکنے آجاتی۔ لوگوں کے جمگھٹے لگ جاتے۔ اکثر اس موقع پر خوب بارش ہو جاتی اور کسانوں کا ادنیٰ لباس بھیگ جاتا البتہ ایک چیز تھی جسے بارش بھی خراب نہ کر سکتی تھی۔ وہ شہد بھرے کیکوں اور سونٹھ ملی میٹھی روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ جن کے صندوق کے صندوق وہاں سجا کر رکھے جاتے تھے۔ بچوں کے لئے سب سے دل خوش کن بات یہ تھی کہ ان میٹھی روٹیوں اور کیکوں کا بیچنے والا جب کبھی میلے میں شرکت کے لئے اس شہر آتا کینیوٹ ہی کے والدین کے ہاں ٹھیرتا اور اکثر ہی کینیوٹ کو سونٹھ کی میٹھی روٹی دیا کرتا۔ کینیوٹ ہمیشہ اُس روٹی میں سے جوانا کو بھی حصہ دیتا تھا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ تھی کہ روٹیاں بیچنے والا عجیب و غریب باتیں سناتا تھا اور تو اور سونٹھ کی میٹھی روٹیوں کے متعلق

اُسے نہایت دلچسپ کہانیاں یاد تھیں۔ ایک شام اس نے بچوں کو ایک کہانی سُنائی جس کا اُن پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ وہ اسے کبھی نہ بھولے کہانی یہ تھی :۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میری میز پر دو سونٹھ ملی روٹیاں رکھی تھیں ایک کی شکل مرد کی سی تھی جس نے ہیٹ پہن رکھی تھی۔ دوسری ایک دوشیزہ کی ہم شکل تھی۔ جس نے عورتوں کی سی ٹوپی نہیں پہنی تھی۔ ان کے چہرے سب سے اچھی طرف تھے۔ کیونکہ یہ دونوں دوسری طرف سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ دنیا کے اکثر لوگ، دکھاوے کے لئے نہایت اہتمام سے لوگوں کے سامنے اپنی سیرت کا بہترین پہلو پیش کیا کرتے ہیں۔

روٹی کے آدمی کے جسم کی بائیں جانب جہاں دل ہوتا ہے، ایک تلخ بادام لگا تھا۔ لیکن نوجوان دوشیزہ صرف شہد کی بنی تھی۔ انھیں میز پر بطور نمونہ رکھا گیا تھا۔ وہ عرصے تک وہیں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ انھیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی محبت ایک دوسرے پر نہ جتائی۔ ظاہر ہے کہ اگر انھیں کبھی باتیں کرنا منظور ہوتا تو وہ ضرور منہ سے کچھ کہتے۔ میٹھی روٹی کی دوشیزہ دل میں کہنے لگی۔ "وہ

مرد سے پہلے اُسے بولنا چاہئے لیکن دل ہی دل میں وہ نازاں بھی تھی۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اس کی محبت کا جواب محبت ہی ہے لیکن اس نوجوان کے خیالات تو کچھ عجیب ہی تھے۔ اُس نے خواب دیکھا کہ "میں ایک بازاری لڑکا ہوں، میری جیب میں چار پیسے ہیں اور میں نے میٹھی روٹی کی دوشیزہ کو مول لے کر کھا لیا ہے"۔

وہ کئی دن بلکہ کئی ہفتوں تک میز پر پڑے رہے یہاں تک کہ وہ سخت اور خشک ہو گئے لیکن دوشیزہ کے خیالات روز بروز لطیف اور عورتوں کے سے ہوتے گئے۔ ایک دن وہ کہنے لگی "آہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ ہم اتنی مدت ایک ہی میز پر اکٹھے پڑے رہیں"۔ اتنے میں "ٹک" کی آواز پیدا ہوئی اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ نوجوان آدمی کہنے لگا "کاش اسے میری محبت کا علم ہو جاتا تو وہ اس قدر جلد نہ ٹوٹتی"!.......

"یہ ہیں وہ دونوں! اور یہ ان کی داستان ہے۔ ان کی زندگی اور ناتمام محبت کی داستان کتنی عجیب ہے! لو اب یہ تم لے لو!" یہ کہہ کر میٹھی روٹیاں اُنے جوانک کے ہاتھ میں نوجوان مرد، جو ابھی ثابت تھا دے دیا اور کینوٹ کے ہاتھ میں دوشیزہ جو ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن بچوں پر اس کہانی کا اس قدر گہرا اثر

ہوا کہ انھوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک عاشق اور اس کی محبوبہ کو کھا جائیں۔

دوسرے دن وہ نوجوان اور دوشیزہ کو گرجے میں لے گئے۔ اور گرجے کی دیوار کے تلے جو تمام سال عشق پیچاں کی بیلوں سے ڈھکی رہتی تھی بیٹھ گئے۔ انھوں نے نوجوان اور دوشیزہ کو سبز پتوں میں رکھ کر تمام بچوں کو ان کی خاموش اور ناتمام محبت کا افسانہ سنایا۔ وہ اسے "محبت" ہی کہتے تھے کیونکہ انھیں یہ افسانہ بہت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے بچوں کی بھی یہی رائے تھی لیکن جب انھوں نے مڑ کر اس عاشق اور معشوقہ پر نظر ڈالی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میٹھی روٹی کی ٹوٹی ہوئی دوشیزہ غائب ہو چکی تھی۔ اسے ایک بڑے سے لڑکے نے شرارت سے ہڑپ کر لیا تھا پہلے پہل تو لڑکوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد غالباً اس خیال سے کہ غریب عاشق اس دنیا میں تنہا نہ رہ جائے انھوں نے اسے بھی کھا لیا۔ البتہ انھوں نے اس افسانے کو کبھی نہ بھلایا۔

یہ دونوں بچے اب بھی شاہ بلوط اور بوڑھے بید کے نیچے کھیلا کرتے۔ ننھی دوشیزہ کینیوٹ کو گیت سنایا کرتی۔ اس کی آواز گھنگروؤں کی طرح تیز اور چنچل تھی۔ اس کے برعکس کینیوٹ گانا نہیں جانتا تھا۔

البتہ وہ گیتوں کے الفاظ ضرور یاد رکھتا اور یہ بھی غنیمت تھا۔ کوچ کے تمام لوگ یہاں تک کہ کیک بیچنے والے کی امیر بیوی بھی کھڑی ہو کر غور سے جوانا کے گیت سنا کرتی اور کہتی "اُف جوانا کی آواز کس قدر حسین اور پیاری ہے۔"

یہ زمانہ مسرت اور شادمانی کا زمانہ تھا۔ لیکن یہ ہمیشہ نہ رہا۔ دونوں ہمسائے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ لڑکی کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے باپ نے دوسری شادی کرنے کی ٹھان لی۔ دارالسلطنت میں اسے پیغام رسانی کی سود مند ملازمت مل گئی۔ یہ ہمسائے جب ایک دوسرے سے جدا ہوتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بچے تو مارے غم کے خوب روئے۔ لیکن ان کے والدین نے انھیں یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ "چلو مت روؤ سال میں کم از کم ایک مرتبہ تو ایک دوسرے کو خط لکھا ہی کرو گے نا۔"

اس کے بعد کینوٹ کو ایک جوتے بنانے والے کا شاگرد بن جانا پڑا۔ اب روز بروز وہ بڑا ہو رہا تھا اور اُسے یوں بیکار نہ پھرنے دیا جا سکتا تھا علاوہ ازیں اب اُسے وہاں مستقل ملازمت بھی ملنے والی تھی۔ افسوس میلے کے دن اگر وہ کوپن ہیگن ہوتا تو جوانا سے مل کر سیر کرنے میں اُسے کس قدر لطف

آتا۔لیکن وہ اب بھی کورج ہی میں تھا۔اس نے کبھی وہ بڑا شہر نہیں دیکھا
تھا۔حالانکہ وہ یہاں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔خلیج کے
پار جب آسمان صاف ہوتا۔شہر کوپن ہیگن کے میناروں کی چوٹیاں اُسے صاف
صاف نظر آجاتیں اور جس دن وہ اپنی ملازمت پر مستقل ہو گیا، اس نے دیکھا
کہ شہر کے بڑے گرجے کی صلیب دھوپ میں چمک رہی ہے۔اس کے بے تاب
خیالات جوانا کے خیالات کے ساتھ ساتھ رہنے لگے۔کیا جوانا نے بھی اُسے
یاد رکھا تھا؟ ہاں کرسمس کے موقع پر جوانا کے والدین کا ایک خط آیا جس میں
لکھا تھا کہ "یہاں ہر طرح سے خیریت ہے جوانا بھی اچھی ہے۔ اس کی آواز اب
بھی ویسی ہی خوبصورت ہے جیسی پہلے تھی اور امید ہے کہ یہی آواز عنقریب اس
کا مستقبل شاندار کر دے گی۔ اسے ایک محفلِ رقص و سرود میں ملازمت مل
گئی ہے اور اُس نے گا گا کر بہت سا روپیہ کما لیا ہے۔"

اس روپے میں سے ایک ڈالر اُس نے اپنے ہمسایوں کو بھی بھیجا تھا
تاکہ وہ اسے کرسمس کی شام کو خرچ کر کے خوشی منا سکیں اور اس کا جامِ صحت
پئیں۔یہ بات خود اُس نے خط میں لکھی تھی۔اور آخر میں کینیوٹ کو بہت بہت
سلام بھی لکھا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی نیک دل ہمسایوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حالانکہ یہ خوشخبری کس قدر دل خوش کن تھی۔ لیکن ان کے آنسو بھی تو خوشی کے آنسو تھے۔ کینیوٹ ہر وقت جوانا کی یادمیں غرق رہنے لگا۔ اور اب اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا۔ کہ خود جوانا بھی اُسے نہیں بھولی۔ جیسے جیسے اس کی شاگردی کا زمانہ ختم ہونے لگا اُسے جوانا سے زیادہ سے زیادہ محبت ہونے لگی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ جوانا کو ضرور میری بیوی بننا چاہیے۔ جب اس کے دل میں ایسے خیالات ہوتے تو ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔ ایک دفعہ جب وہ انھیں خیالوں میں غرق تھا۔ اس نے کام کرتے کرتے دھاگا اس زور سے کھینچا اور اپنے پاؤں کو دھاگے پر اس زور سے دبایا کہ اس کی انگلی پر ایک گہرا نشان پڑ گیا۔ لیکن اسے اس کی کیا پرواہ تھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں سونٹھ کی میٹھی روٹی کی دوشیزہ اور نوجوان کی طرح خاموش نہیں رہوں گا۔ اس افسانے نے اس کو اچھا سبق پڑھا دیا تھا

آخر کار ایک دن اس نے اپنا بقچہ باندھا اور کوپن ہیگن کو روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہاں ایک کاریگر موچی اس کا منتظر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ جوانا مجھ سے مل کر کتنی خوش ہو گی۔ وہ اب سولہ سال کی ہو چکی تھی اور اس

کی اپنی عمر اس وقت اُنیس سال کی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اس کے لیے یہاں سے ایک انگوٹھی لیتا جائے لیکن معاً اُسے خیال آگیا کہ اس سے کہیں بہت زیادہ خوبصورت چیزیں کوپن ہیگن میں مل سکتی ہیں۔ اُس نے اپنے ماں باپ سے اجازت لی اور موسم خزاں کے آخر میں ایک دن جبکہ بارش ہونے والی تھی اپنے شہر سے روانہ ہو گیا۔ پت جھڑ کا موسم تھا۔ اور جب وہ دارالسلطنت میں کاریگر کے ہاں پہنچا۔ تو وہ تمام بھیگ چکا تھا۔ دوسرے دن اس نے پہلی مرتبہ جوانا کے باپ کے گھر جلنے کا ارادہ کیا۔ اس نے نئے کپڑے اور نئی ہیٹ پہنی جو اس نے کورج سے خریدی تھی اور اسے بہت زیب دیتی تھی۔ اب تک تو وہ ایک معمولی سی ٹوپی ہی پہنا کرتا تھا۔

مکان اُسے آسانی ہی سے مل گیا۔ لیکن اُسے اس قدر سیڑھیاں چڑھنی پڑیں کہ اُس کا سر چکرا گیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ شہر کس قدر خوفناک ہے جس کے لوگ ایک دوسرے کے سروں پر رہتے ہیں۔

وہ ایک عالی شان محل میں جا داخل ہوا۔ جوانا کے باپ نے اس کا استقبال کیا۔ اس کی نئی بیوی کینیوٹ کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ تاہم اس نے اس سے مصافحہ کیا اور اس کو کافی پیش کی۔

جوانا کا باپ کہنے لگا۔"جوانا تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ تم تو بڑے ہو کر ایک نہایت عمدہ نوجوان بن گئے ہو۔ ابھی جوانا بھی آ کر تم سے ملتی ہے وہ ایک نہایت اچھی لڑکی ہے اور خدا نے چاہا تو وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی اب تو یہاں اس کا ایک اپنا کمرہ بھی ہے اور وہ باقاعدہ اس کا کرایہ ادا کرتی ہے۔"

جوانا کے باپ نے نہایت ملائمت سے اپنی بیٹی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جیسے کوئی اجنبی کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں اندر چلے گئے۔ اُف کمرے کی ہر چیز کتنی خوبصورت تھی! تمام کے تمام شہر کورج میں اس سے زیادہ خوبصورت کمرہ نہیں مل سکتا تھا۔ بلکہ شاید ملکہ کا کمرہ بھی اس سے زیادہ شاندار نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر طرف قالین اور نمدے بچھے تھے کھڑکیوں پر پردے لٹک رہے تھے۔ جا بجا تصویریں اور پھول ہی پھول نظر آتے تھے ایک مخمل کی کرسی بھی پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ قد آدم آئینہ لگا تھا۔

یہ سب کچھ کینوٹ نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس نے یہاں جوانا کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ وہ اب بالکل جوان ہو چکی تھی۔ کینوٹ نے اس کا جو تصور قائم کر رکھا تھا۔ اُس سے وہ بالکل مختلف اور

زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ تمام گوج میں اس جیسی حسین کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ کس قدر سلیقہ مند لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ اس کی پہلی نگاہ کچھ عجیب سی اور بیگانہ دار تھی لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ اس کے بعد وہ بے تاب ہو کر اس کی طرف اس طرح بڑھی جیسے ابھی اسے چوم ہی لے گی لیکن اس نے اسے چوما نہیں۔ اگرچہ اس کے انداز سے یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دوڑ کر اپنے عاشق کا منہ چوم لے گی۔ وہ اپنے بچپن کے دوست سے ایک دفعہ پھر مل کر بہت خوش ہوئی۔ بلکہ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ اس کے بعد اس نے کینیوٹ کے ماں باپ کے متعلق کئی سوال کئے گاؤں کی ایک ایک چیز کے متعلق کوئی نہ کوئی بات پوچھ ڈالی۔ یہاں تک کہ اس نے شاہ بلوط اور بید مجنوں کو بھی نہ بھلایا جیسے وہ بھی انسان تھے اسے میٹھی روٹی کے آدمی اور دوشیزہ اور اس کی خاموش محبت کی کہانی بھی ابھی تک یاد تھی۔ کہ کس طرح وہ میز پر پڑے رہے یہاں تک کہ انکے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہی کہانی ایک مرتبہ پھر دہرا کر وہ زور سے ہنس پڑی لیکن کینیوٹ کے رخساروں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا اور اس کے دل کی حرکت بلند اور زیادہ تیز ہو گئی .... نہیں وہ مغرور نہیں تھی کینیوٹ

نے دیکھ لیا۔ کہ اُس نے اپنے والدین کی اجازت سے لسے دن بھر وہاں ٹھیرنے کی دعوت دی ہے۔

جوانا نے چائے دانی میں سے ایک پیالی میں چائے اُنڈیل کر اپنے ہاتھ سے کینیوٹ کو دی۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب اٹھالی۔ اور بلند آواز سے پڑھ کر سُنانی شروع کی۔ کینیوٹ کو محسوس ہوا۔ جیسے یہ تمام کہانی اسی کے متعلق ہے۔ اور اس میں اسی کی محبت کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ اس کا ایک ایک حرف اس کی حالت پر صادق آرہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کینیوٹ کو ایک سادہ سا گیت گا کر سُنایا۔ جب وہ گیت گا رہی تھی۔ تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ہی دردانگیز خیالات کا اظہار کر رہی ہے آواز کے ساتھ ساتھ اُس کے دل کے خیالات بھی فضا میں بلند ہو رہے تھے کیسا اسے کینیوٹ سے محبت تھی؟ کینیوٹ کے گالوں پر آنسو ڈھلک آئے وہ انھیں ضبط نہ کر سکا۔ اس کے پاس ایک بھی لفظ نہ تھا جو وہ کہے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گونگا ہو گیا ہے۔

جب وہ رخصت ہونے لگا تو جوانا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہنے لگی "تم بہت نیک دل ہو اسی طرح رہنا بدل

نہ جانا"!

آہ یہ کس قدر مسرور شام تھی۔ اس شام کے بعد سونا ناممکن تھا۔ کینیوٹ تمام شب نہ سو سکا۔

رخصت کے وقت جوانا کے باپ نے کینیوٹ سے کہا تھا کہ "دیکھو، ہمیں بھول نہ جانا۔ اب یہ نہ کرنا کہ تمام موسم سرما غائب رہو۔ پھر ضرور آنا"۔ چنانچہ وہ اتوار کی شام کو بھی آگیا۔ کام ختم کرنے کے بعد ــــــ ان دنوں وہ موم بتیوں کی روشنی میں کام کیا کرتے تھے ــــــــــ وہ شہر میں آجاتا اور جوانا کے کمرے کی کھڑکی پر نگاہ ڈالتا ہوا آگے گذر جاتا۔ یہ اکثر روشن رہتی اور ایک شام تو اس نے اس کے چہرے کا سایہ بھی کھڑکی کے پردے پر صاف صاف دیکھ لیا۔ اس کے لئے یہ شام نہایت مسرت کی شام تھی۔ اس کے استاد کی بیوی کو اس کا ہر شام شہر میں چلے جانا ناگوار گزرتا تھا۔ وہ اپنا سر ہلا ہلا کر اس سے کہا کرتی۔ "تم خواہ مخواہ جاکر اپنا وقت ضائع کر آتے ہو"۔

لیکن اس کا استاد مسکرا کر جواب دیتا۔ "میری پیاری تم جانتی نہیں کہ وہ نوجوان ہے۔"

کینیوٹ نے دل میں سوچا کہ میں اتوار کے دن جوانا سے ملنے جاؤنگا۔

اور اسے صاف صاف بتا دوں گا کہ میں دل و جان سے تم سے محبت کرتا ہوں
تم مجھ سے شادی کرنا منظور کر لو۔ میں جانتا ہوں کہ میں فی الحال ایک غریب
بوٹ بنانے والا ہوں۔ لیکن میں بہت کام کروں گا۔ اور سر توڑ محنت سے
تھوڑے ہی عرصے میں ایک اعلےٰ کاریگر بن جاؤں گا۔ ہاں میں اب اسے ضرور
سب کچھ بتا دوں گا۔ خاموش محبت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس نوجوان اور
دوشیزہ کی کہانی سے مجھے یہی سبق ملا ہے۔

اتوار کی شام آ گئی۔ لیکن جب کینیوٹ وہاں پہنچا تو انھوں نے اسے
بتایا کہ اس شام تو ہم کسی جگہ مدعو ہیں گھر نہیں ٹھیریں گے۔

جوانا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہنے لگی "کیا تم نے
کبھی تھیئٹر دیکھا ہے؟ ایک دفعہ تو ضرور دیکھو۔ جمعرات کے دن مجھے بھی
وہاں گانا ہے۔ میں تمھیں ٹکٹ بھیجدوں گی۔ بشرطیکہ تمھارے پاس آنے
کے لئے وقت ہو۔ آیا کو معلوم ہے کہ تمھارا اُستاد کہاں رہتا ہے"

جمعرات کے دن دوپہر کے قریب کینیوٹ کو ایک سربمہر لفافہ ملا جس
پر کوئی پتہ نہیں لکھا تھا۔ البتہ ٹکٹ اس کے اندر تھا۔ شام کو اپنی عمر میں
پہلی مرتبہ کینیوٹ تھیئٹر دیکھنے گیا۔ اس نے کیا دیکھا؟ —— جوانا

ایک حسین ساحرہ بن کر کھڑی تھی۔ اُس کی شادی ایک اجنبی سے ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک کھیل تھا۔ سراسر دھوکا۔ اور یہ بات کینیوٹ کو بھی اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ اصلی بات ہوتی تو جوانا کا دل کبھی گوارا نہ کرتا۔ کہ وہ اُسے اس موقع پر مدعو کرے۔ وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح کھیل دیکھنے چلا گیا۔ اور جب تمام لوگ تالیاں بجا بجا کر جوانا کو داد دیتے تو وہ بھی "شاباش شاباش" پکار اٹھتا۔ اُس نے دیکھا کہ بادشاہ بھی جوانا کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے اور اُس کے گانے سے بے حد محظوظ ہوا ہے کینیوٹ کو اس وقت بہت خفت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اسے تو جوانا سے محبت ہو چکی تھی۔ اُسے میٹھی روٹی کی دوشیزہ کا افسانہ یاد آ رہا تھا۔ "اظہار محبت مرد کی طرف سے ہونا چاہیئے۔" آہ اس کے لئے یہ بچوں کی سی کہانی کس قدر اہم ہو رہی تھی۔ جوں ہی اتوار آیا۔ وہ پھر جوانا کے گھر گیا۔ اس وقت اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی مقدس زمین پر قدم رکھ رہا ہے۔

وہاں صرف جوانا ہی اس کے استقبال کے لئے موجود تھی۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی وہ کہنے لگی "تمہارے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابا کو تمہارے گھر بھیجوں۔ لیکن

میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج شام تم ضرور آؤ گے۔ بات یہ ہے کہ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں فرانس جا رہی ہوں۔ جمعہ کے دن روانہ ہو جاؤں گی میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ نہیں تو میں ایک اعلیٰ درجہ کی مغنیہ نہیں بن سکوں گی۔"

آہ غریب کینبوٹ! یہ سنتے ہی اُسے محسوس ہوا گویا تمام کمرہ اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کی طاقت اُسے جواب دے گئی۔ اُس کا سینہ فرطِ غم سے پھٹنے لگا۔ اُس نے آنسوؤں کو ضبط کئے رکھا۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اس بات کا کس قدر رنج و غم ہے۔

وہ اُس سے کہنے لگی "تم ایک نیک اور باوفا روح ہو!" ان الفاظ سے کینبوٹ کی رُکی ہوئی زبان کھل گئی۔ اس نے جوانا کو بتایا کہ وہ کس قدر سچے دل سے اس سے محبت کرتا رہا ہے! اور اس کی دلی آرزو ہے کہ وہ اس سے شادی کرنا منظور کرلے۔ جونہی جوانا نے یہ الفاظ سنے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے کینبوٹ کا ہاتھ نیچے گرا دیا اور نہایت غمناک الفاظ میں کہنے لگی "کینبوٹ مجھے اور اپنے آپ کو غمگین نہ کرو۔ بس ہمیشہ تمہاری بہن بنی ہوں گی۔ ایک ایسی بہن جس پر ہمیشہ تم اعتبار کر سکو۔ لیکن اس سے زیادہ

میں تمہاری کچھ نہیں ہو سکتی"۔

اس کے بعد اُس نے اپنا مرمریں ہاتھ پیار سے اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھدیا۔ اور کہنے لگی۔" اگر ہم مصائب جھیلنے کا عزم کریں تو خدا بھی ہماری مدد کرتا ہے"۔

عین اسی وقت اس کی سوتیلی ماں بھی اُس کے کمرے میں آداخل ہوئی۔ جوانا جلدی سے کہنے لگی"میرے جانے کا کینیوٹ کو بہت رنج ہوا ہے" اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گویا وہ سفر ہی کی باتیں کر رہے ہیں۔

"آؤ مرد بنو" کہہ کر جوانا نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھدیا۔" تم اب بھی پہلے کی طرح بچے ہی ہو تمہیں اب عقلمند اور معقول بننا چاہئے۔ جیسے کہ تم اس وقت تھے۔ جب ہم بچے تھے اور بید کے درخت کے نیچے کھیلا کرتے تھے"۔

کینیوٹ یہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن اب اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ دُنیا اپنے راستے سے پرے ہٹ گئی ہے۔ اس کے خیالات ایک ایسے دھاگے کی طرح تھے جو ہوا میں ادھر اُدھر اُڑ رہا ہو۔ وہ وہیں ٹھیرا رہا۔ اگرچہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ جوانا نے اُسے اور زیادہ دیر وہاں ٹھیرنے کے لئے

کہا ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ اس پر بہت مہربان تھی اور اس سے بہت اچھا سلوک کیا کرتی تھی۔ اس نے پیالی میں چائے ڈال کر اُسے دی، اور اُسے ایک گیت گا کر سُنایا۔ لیکن اب اس گیت میں وہ پہلی سی آواز اور لگن نہیں تھی۔ اگرچہ یہ گیت بھی نہایت دلکش تھا اور جوانا کی آواز بھی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کینیوٹ کو یہ گیت سن کر محسوس ہونے لگا کہ اُس کا دل ٹوٹنے والا ہے۔ وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کرنے کے لئے جوانا کی طرف نہ بڑھایا۔ جوانا نے خود اُٹھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کے رخساروں پر آنسوؤں کا ایک سیلاب بہ آیا اور آنسوؤں ہی میں مسکرا کر وہ کہنے لگی "کیا تم اپنی بہن مصافحہ نہ کرو گے؟" اس کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر "بھائی" کا لفظ دہرایا۔

یقیناً اس سے کینیوٹ کو کچھ تسلی ہوئی اور اس طرح وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

وہ جہاز میں بیٹھ کر فرانس کو روانہ ہو گئی اور کینیوٹ کوپن ہیگن کے کیچڑ والے بازاروں میں پھرا کرتا۔ ایک دن ورکشاپ کے دوسرے کاریگروں نے اُس سے پوچھا کہ "تم اتنے اُداس اُداس کیوں رہتے ہو۔ تم تو جوان ہو۔ ہمارے ساتھ مل کر ذرا سیر و تفریح کیا کرو۔" سو وہ بھی ان کے ہمراہ ایک رقص گاہ میں

چلا گیا۔ وہاں اس نے بہت سی خوبصورت لڑکیاں دیکھیں۔ لیکن ان میں سے
ایک بھی جوانا کی طرح نہ تھی۔ وہاں اس نے جوانا کو بھولنے کی کوشش کی لیکن
وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو کر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔ اُس نے
اس سے کہا تھا کہ "اگر ہم مصائب جھیلنے کا عزم کر لیں تو خدا ہماری مدد کرتا ہے"
یہ سوچ کر اس میں کچھ ہمت آگئی لیکن جب سارنگیوں کے مخزوں نغمے فضا
میں گونجنے لگے اور لڑکیوں کا رقص شروع ہوا۔ تو وہ یکایک چونک اُٹھا۔ اسے
محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ ایک ایسی جگہ آگیا ہے جہاں اسے جوانا کو نہ لانا چاہئے
تھا۔ وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی ـــــ اس کے دل میں۔ وہ وہاں سے
فوراً اٹھ کر باہر چلا آیا اور گلیوں میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس مکان کے
سامنے سے گزرا۔ جہاں جوانا رہا کرتی تھی۔ تمام مکان خالی پڑا تھا۔ اس میں
اب اندھیرا چھا رہا تھا۔ دنیا اپنے راستے پر گامزن تھی کینیوٹ کو تنہا چھوڑ کر
سرما آگیا۔ پانی جم گئے اور ہر طرف قبرستان کی سی خاموشی چھا
گئی۔ لیکن جب بہار واپس آئی اور پہلا جہاز سفر کو روانہ ہونے کے لئے
تیار ہوا تو کینیوٹ کے دل میں دنیا کی سیر کرنے کی لاانتہا خواہش پیدا ہونے لگی
اُس نے اپنا بقچہ باندھا اور سفر کو روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے جرمنی پہنچا اور

شہر بشہر پھرتا رہا۔ لیکن اُسے کہیں بھی آرام اور سکونِ دل میتسر نہ ہوا۔ جب وہ ایک عالی شان اور قدیم شہر نورمبرگ میں پہنچا تو اُسے اپنے دل پر کچھ قابو حاصل ہو گیا۔ وہاں اُس کے تکان سے چور قدموں کو کچھ آرام ملا۔ وہ وہیں رہ پڑا۔

نورمبرگ ایک عجیب و غریب اور پرانا شہر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے تصویروں کی کسی پُرانی کتاب سے کاٹ کر زمین پر رکھ دیا گیا ہے۔ گلیوں اور بازاروں نے اپنی خواہش کے مطابق اپنا اپنا راستہ لے لیا ہے۔ اور مکان قطاروں میں کھڑے رہنا نہیں چاہتے۔ مٹیوں والے مکان، منقش ستون اور مجسمے شہر کے دروازے ہی سے نظر آجاتے ہیں اور ایک ہی قسم کی چھتوں پر اژدہاؤں یا کتوں کی شکل کے پرنالے لگے ہیں جو گلیوں کے وسط تک جا پہنچے ہیں۔

کینیوٹ کا بقچہ اُس کی پیٹھ پر تھا۔ وہ میلیں منڈی میں پُرانے فواروں میں سے ایک کے قریب کھڑا تھا جس پر تاریخی اشکال یا روحانی سبق دینے والی حسین تصویریں کندہ تھیں۔ ایک البیلی اور چنچل خادمہ وہاں سے پانی کا ایک جگ بھرنے آئی۔ اس نے کینیوٹ کو تازہ اور ٹھنڈا پانی

پلایا۔ اس کے ہاتھ میں چند گلاب کے پھول تھے۔ ایک پھول اُس نے کینیوٹ کی نذر کر دیا۔ کینیوٹ نے اُسے مستقبل کے لئے ایک نیک شگون سمجھا عین اُسی وقت قریب کے ایک گرجے سے موسیقی کی صدا آنے لگی۔ موسیقی کی طرز وہی تھی جو وہ کوج کے گرجے میں سن چکا تھا۔ وہ اس بڑے کیتھیڈرل کے اندر چلا گیا۔ رنگین کھڑکیوں کے شیشوں سے سورج کی روشنی ندی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اُس کا دل دعاؤں سے لبریز ہو گیا۔ اس نے دعا مانگی اور اُس کی روح کو اطمینان و سکون میسّر ہونے لگا۔ اس کے بعد اُس نے کسی قابل اُستاد کی تلاش شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد اسے حسب دلخواہ ایک اُستاد مل گیا۔ وہ اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اور اس سے جرمن زبان بھی سیکھ لی۔

شہر کے گرد جو پرانی کھائی ہے۔ اسے اب چھوٹے چھوٹے باغوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن اونچی اونچی دیواریں اور بھاری بھاری بُرجیاں اب بھی کھڑی ہیں۔ ان دیواروں کے اندر کی طرف رسّیاں بٹنے والوں نے اپنی رسّیاں تان رکھی ہیں۔ دیوار کے شگافوں اور دراڑوں میں بڑی بڑی جھاڑیاں اُگ آئی ہیں ان کی سبز سبز شاخیں چھوٹے

چھوٹے مکانوں کی چھتوں پر چھا رہی ہیں۔ جوان کے نیچے بنے ہیں۔ انھیں مکانوں میں سے ایک میں کینیوٹ کا استاد رہتا تھا۔ جس کے ہاں وہ ملازم تھا۔ مکان کی بالائی منزل پر کینیوٹ کا کمرہ تھا۔ جس کی کھڑکی کے سامنے شاہ بلوط کا درخت اپنی شاخیں ہلاتا رہتا تھا۔ اس نے موسم گرما اور سرما یہیں بسر کیا۔ لیکن بہار آتے ہی اُس کے دل سے صبر و قرار پھر رخصت ہو گیا۔ شاہ بلوط کا درخت بہار پر تھا اور اس کے پتوں میں سے اسی خوشبو کی لپٹیں نکلنے لگیں جو کوج کے شاہ بلوط کے پتوں میں سے نکلا کرتی تھیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے وطن کے باغوں میں آ گیا ہے۔

کینیوٹ سے یہ کیونکر برداشت ہو سکتا تھا۔ اُس نے اپنے استاد کو الوداع کہی اور شہر میں کام تلاش کر لیا جہاں شاہ بلوط کا کوئی درخت نہ تھا۔ اس کا ورکشاپ کے پرانے پلوں میں سے ایک کے قریب تھا۔ ساتھ ہی ایک پن چکی تھی جس کے ارد گرد ہر وقت ایک تیز رو ندی چیختی چلّاتی چھینٹے اڑاتی منہ میں کف بھرتی گذرتی تھی۔ ندی کے قریب کے مکانوں سے آ کر ٹکراتی تھی جن کے پرانے اور سال خوردہ برآمدے ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے فضا میں لٹک رہے ہیں۔ ابھی ابھی پانی میں گر جائینگے۔

یہاں شاہ بلوط کا کوئی درخت نہ تھا۔ بلکہ یہاں تو پھولوں کا کوئی ایسا گملا تک نہیں تھا جس میں کوئی ننھا سا پودا بہار دکھا رہا ہو۔ البتہ ورکشاپ کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا بید کا درخت اُگا تھا۔ ایسا ہوتا تھا جیسے اس نے گھبرا کر مکانوں کو زور سے پکڑ رکھا ہے۔ مبادا وہ پانی میں گر جائے۔ اس نے اپنی شاخیں ندی پر پھیلا رکھی تھیں بالکل اسی انداز سے جیسے کوج کے بید نے دریا پر پھیلا رکھی تھیں۔ اس درخت میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسے دیکھتے ہی کینیوٹ کے شکستہ دل پر چوٹ سی لگتی تھی خصوصاً چاندنی راتوں میں تو وہ دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ اس شہر میں بھی نہ رہ سکا کیوں؟ شاید یہ بات اس بید کو معلوم ہوا یا شاید شاہ بلوط جانتا ہو!

اس نے نور مبرگ کو بھی خیر باد کہی اور سفر پر چل پڑا۔ اس نے کبھی کسی سے جوانا کا ذکر نہ کیا غم کو اپنے دل میں چھپائے رکھا بچپن کی دو میٹھی روٹیوں والی کہانی میں اس کے لئے گہرے مطالب پنہاں تھے اسے اب معلوم ہوا کہ میٹھی روٹی کے آدمی کے پہلو میں دل کی جگہ تلخ بادام کیوں لگا تھا۔ اس کے دل میں تلخی ہی تلخی موجود تھی اور جوانا جو اس قدر حلیم اور ملنوت تھی اسے شہد ملے کیک سے کیوں تشبیہ دی گئی تھی۔ جب وہ

ان سب باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اس کا بقچہ اس کے سینے پر آپڑا۔ اور بوجھ کی وجہ سے اُسے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اس نے اس کی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسے اپنے سامنے نصف دنیا نظر آرہی تھی۔ نصف اس کے خیالات میں چھپ گئی تھی۔ اس حالت میں اس نے نورمبرگ کو الوداع کہی۔

جب تک اُسے بلند برفانی پہاڑ نظر نہ آنے لگے۔ اس کے دل پہ سے بار نہ اُترا۔ اب اس کے خیالات بیرونی چیزوں کی طرف منعطف ہونے لگے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایلپس کے برفانی پہاڑ اسے اُڑنے والی دنیا کے دو سفید پر معلوم ہو رہے تھے۔ جو اس وقت بند تھے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جونہی دنیا اُنھیں اڑنے کے لئے پھیلائے گی تاریک جنگلوں کے خوشنما نظارے، کف در وہاں شفاف ندیاں فضا کے بستر پر لوٹتے ہوئے بادل، چکا چوند پیدا کرتے برف کے ڈھیر، جو اس وقت تک چھپے ہوتے ہیں ہویدا ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن دنیا اپنے سفید پر پھیلا کر آسمانوں کی طرف اُڑ جائے گی اور وہاں خدا کی نورآفریں نگاہ کی تاب نہ لا کر صابون کے بلبلے کی طرح پھٹ جائے گی"۔

کینیوٹ نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا۔ "کاش قیامت آجائے!"

وہ پہاڑوں کی سرزمین میں چپ چاپ گذرتا گیا۔ جو اسے پھلوں کا ایک باغ معلوم ہورہی تھی۔ کھڑکی کے برآمدوں میں سے فیتے بُننے والی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ایک دوسری کو سر کے اشارے کرنے لگیں۔ شام کا وقت تھا اور پہاڑوں کی زرفشاں چوٹیاں خون میں نہائے ہوئے سورج کی مدھم روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ اور گھنے درختوں کے نیچے سبز جھیلوں میں ان سرخیوں کا عکس لرز رہا تھا۔ اس وقت اسے خلیج کوج کا ساحل یاد آگیا اور اس کا دل نئی آرزوؤں سے آباد ہوگیا۔ لیکن اب اس کے دل میں درد دائم موجود نہیں تھا...... جہاں دریائے رائن پیچ و خم کھاتا ہوا ایک بوڑھے بید کی طرح آگے جا کر یرم نرم بن گیا تھا۔ جہاں چمکتے بادل ہر آن شکلیں بدل رہے تھے۔ جیسے یہی ان کی جائے پیدائش ہے اور جہاں قوس قزح ایک رنگ برنگ تتلی کی طرح ہلتے چلتے بادلوں میں پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہاں کینیوٹ کے دل کو کوج کی پن چکی اور چھینٹے اڑاتے منہ میں سے جھاگ اُگلتے پانیوں کی یاد آگئی۔ وہ اس خاموش فضا میں بخوشی رہ سکتا تھا۔ لیکن آخر اس بات کا کیا علاج تھا کہ یہاں بھی بید اور شاہ بلوط کے حد سے زیادہ درخت تھے۔

پس اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور پہاڑوں کے ایک بلند اور عالی شان سلسلے پر چڑھ گیا۔ اب اس کے قدم اونچے اونچے ٹیلوں اور ان پیچ در پیچ راستوں پر پڑ رہے تھے جو دور سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ابابیلوں کے لٹکتے ہوئے گھونسلے معلوم ہو رہے تھے۔ نیچے گہرائیوں میں پانی جھاگ پیدا کرتا چلا جا رہا تھا۔ بادل آوارہ پھر رہے تھے۔ وہ چلتا گیا چلتا گیا۔ گلاب کے پھولوں، بھٹ کٹیوں اور برف کے گالوں کو پیروں سے مسلتے ہوئے۔ موسم گرما کا سورج اُس پر چمک رہا تھا۔ بالآخر اس نے خطۂ شمال کو بھی آخری سلام کیا اور شاہ بلوط کے سرسبز و شاداب درختوں کے سایوں، انگور کے باغوں اور مکّی کے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے ہی آگے نکلتا گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پہاڑ اس کے اور اس کے خیالات کے درمیان حائل ہو رہے ہیں۔ اس وقت خود اس کی بھی یہی آرزو تھی۔

آخر اس کے سامنے ایک بڑا اور عالی شان شہر آگیا۔ جس کا نام میلان تھا۔ یہاں اسے ایک جرمن اُستاد ملا۔ جس نے اُسے ملازم رکھ لیا۔ اُستاد اور اُس کی بیوی جن کے کارخانے میں وہ ملازم تھا دو معمّر

اور پارسا ہستیاں تھیں۔ وہ دونوں اس خاموش مسافر کے بہت گرویدہ ہو گئے۔ جو بولتا تو کم تھا لیکن کام زیادہ کرتا تھا اور نہایت نیکی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ خود اُسے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ خدا نے اُس کے دل سے ایک بھاری بوجھ اُتار لیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اس عالیشان گرجے کی چھت پر دوبارہ اور سہ بارہ چڑھے جو سفید مرمر کا بنا تھا۔ اس کے نکیلے مینار۔ شاندار ستون، آراستہ اور ہوادار حجرے، پیش طاق، محراب اور سفید مجسمے جو ہر کونے سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے، یہاں تک کہ خود گرجا بھی اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے وطن کی برف کا بنا ہے اس کے اوپر نیلا آسمان اور نیچے شہر اور لمبارڈی کے وسیع میدان تھے۔ شمال کی طرف بلند پہاڑ کبھی نہ پگھلنے والی برف سے ڈھپنے ہوئے تھے۔ اسے کوچ کا گرجا یاد آ گیا جس کی سُرخ دیواریں عشق پیچاں کی بیلوں میں چھپی ہوئی تھیں لیکن اب اسے وطن جانے کی آرزو نہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ یہیں پہاڑوں کے اس پار وہ مرجائے اور یہیں کوئی اُسے دفن کر دے۔

اس کو وطن چھوڑے تین سال گذر چکے تھے۔ اس عرصے میں

ایک سال وہ میلان میں رہا۔

اُستاد اپنے خاموش اجنبی پر بہت مہربان تھا۔ ایک دن وہ اسے لاسکالا کے شاندار تھیٹر میں لے گیا۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جسے باہر سے ہی دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ گدیلوں والی کرسیوں کی قطاریں زمین سے بتدریج بلند ہوتی ہوئی چھت تک چلی گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر پر اطالیہ کی حسین عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان کے برق پاش حُسن سے کمرہ منوّر ہو رہا تھا۔ اور انھوں نے جو ہیرے اور جواہرات پہن رکھے تھے۔ وہ اس قدر چمک رہے تھے گویا انھیں آگ لگ رہی تھی۔ ان کے گورے گورے نازک ہاتھوں میں خوبصورت اور بیش بہا پھول تھے۔ مردوں نے شام کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا اور بعضوں کے لباس میں سونے اور چاندی کے بٹن بھی لگے تھے۔ اس قدر تیز روشنی کی گئی تھی کہ رات دن معلوم ہو رہی تھی تھوڑی دیر بعد عمارت کی فضا موسیقی کے کیف افشاں نغموں سے مسحور ہو کر وجد میں آنے لگی۔ یہاں کوپن ہیگن کے تھیٹر سے ہر چیز زیادہ خوبصورت اور شاندار نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہاں تو جوانا تھی اور کیا یہ ہو سکتا تھا کہ یہاں ۔۔۔ ایک معجزے کی طرح جب پردہ اُٹھا سامنے جوانا

ریشم کا مطلّا زرق برق لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے سر پر ایک سنہری تاج تھا۔ اس نے گانا شروع کیا۔ لیکن آسمان کی حور کی سی شیریں اور سحر آفریں آواز کے ساتھ۔ وہاں کا ذرہ ذرہ موسیقی کے نشے سے مست نظر آنے لگا اور فضا پر گویا پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ اس کے بعد وہ چند قدم آگے بڑھی اور ایک بار اس ادائے دلنشین سے مسکرائی جس سے صرف جوانا ہی مسکرا سکتی تھی۔ اس کی نگاہیں کینوٹ سے چار ہوئیں۔ آہ غریب کینوٹ! اس نے اپنے اُستاد کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور وہ زور سے پکار اُٹھا "جوانا!" لیکن اُستاد کے سوا اور کسی نے اس کی آواز نہ سنی کیونکہ چنگ و رباب کی صداؤں نے اس وقت ایک شیریں طوفان برپا کر رکھا تھا۔

اُستاد کہنے لگا "ہاں ہاں یہ جوانا ہی تو ہے" اس کے بعد اس نے ایک چھپا ہوا اشتہار نکالا اور جوانا کے نام کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا وہاں اُس کا پورا نام لکھا تھا۔ یہ سب کچھ ایک خواب نہیں تھا۔ تمام حاضرین نے تالیاں بجا بجا کر اُسے داد دی اور اُس پر ہاروں اور پھولوں کی بارش کر دی۔ اور ایک بار جب وہ چلی جاتی وہ دیوانہ وار چلّا چلّا کر اُسے پھر سٹیج پر واپس بُلا لیتے۔ اسی طرح وہ سٹیج پر آتی رہی اور جاتی رہی

آتی رہی اور جاتی رہی۔

بازار میں لوگ اس کی گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ اور اُسے بغیر گھوڑوں کے خود دور تک کھینچ کرلے گئے۔ کینیوٹ سب سے پہلی قطار میں تھا اور دوسرے لوگوں کی طرح خوشی سے چلّا رہا تھا۔ گاڑی ایک جگمگ جگمگ کرتے ہوئے مکان کے نیچے ٹھیر گئی۔ کینیوٹ بڑی کشمکش کے بعد گاڑی کے دروازے کے قریب آکر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئی۔ روشنی نے آگے بڑھ کر اس کے پیارے پیارے چہرے کو چوم لیا۔

کینیوٹ دیکھ رہا تھا کہ وہ لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مُسکرا رہی ہے اور تحسین و آفرین کے نعروں کے آگے مغلوب ہو چکی ہے کینیوٹ نے آگے ہو کر اس کی آنکھوں سے اپنی تشنہ آنکھیں ملائیں لیکن افسوس اس نے اسے نہ پہچانا۔ ایک آدمی کے سینے پر ایک ستارہ جگمگا رہا تھا اُس نے اپنا بازو اُس کی طرف بڑھا دیا اور وہ بازوؤں میں باز ڈال کر اندر چل دیئے۔ لوگ کہہ رہے تھے ان دونوں کی منگنی ہو چکی ہے اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ . . .

کینیوٹ گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں آتے ہی اُس نے اپنا سامان باندھ لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے اب فوراً اپنے وطن کی طرف چل دینا چاہئے ——— شاہ بلوط اور بید کے پاس۔ آہ بید کے درخت کے نیچے ایک لمحہ گذار کر کوئی اپنی عمر بھر کی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

بوڑھے میاں بیوی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ بہتیری منّت سماجت کی۔ لیکن وہ نہ مانا۔ الفاظ اُسے روک نہ سکے۔ انھوں نے اسے سمجھایا کہ "موسم سرما آرہا ہے پہاڑوں پر برف پڑ چکی ہے۔ ابھی نہ جاؤ۔" لیکن اس نے ان کی ایک نہ سُنی ۔ کہنے لگا "میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گاڑیوں کے راستے آسانی سے معلوم کر لوں گا"

وہ پہاڑوں پر چڑھ گیا۔ کبھی اسے کسی ڈھلوان جگہ پر اوپر کی سمت چڑھنا پڑتا۔ کبھی نیچے اُترنا پڑتا۔ یہاں تک اسے طاقت جواب دینے لگی اُس نے تھکی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی گاؤں یا جھونپڑی نظر آجائے لیکن اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اوپر آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور نیچے وادی میں ان کا عکس کانپ رہا تھا۔ نیچے بھی ایک آسمان بنا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ قدم ڈگمگانے لگے ۔ اور وہ

بیمار ہو گیا۔ وادی کی روشنیاں زیادہ سے زیادہ چمکیلی ہوتی گئیں۔ انکی تعداد بھی بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ بل جل رہی تھیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ تھوڑے فاصلے پر ضرور کوئی گاؤں ہے۔ اُس نے اپنی لحہ بہ لحہ سلب ہوتی ہوئی طاقت وہاں تک پہنچنے کے لئے صرف کرنی شروع کر دی آخر اُسے ایک حقیر سی جگہ پناہ لینے کے لئے مل گئی۔ وہ اس رات وہیں ٹھیر گیا۔ اور پھر دن بھر بھی وہیں رہا۔ اس کا تھکا ہوا جسم آرام کی بیحد ضرورت محسوس کر رہا تھا اور اس وقت وادی میں بارش ہو رہی تھی اور برف پگھل رہی تھی۔

تیسرے دن صبح سویرے ایک آوارہ مغنی بربط اٹھائے وہاں آن پہنچا اور اس نے اس کے تاروں پر وہی راگ چھیڑ دیا۔ جو کینیوٹ اپنے وطن میں سُن چکا تھا۔ کینیوٹ وہاں بھی نہ رہ سکا۔ وہ شمال کی سمت لپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ کئی دن تک نہایت تیز تیز قدم اٹھاتے چلتا رہا جیسے اُسے خدشہ ہو کہ وطن پہنچنے سے پہلے پہلے وہ سب چیزیں جنھیں دیکھنے کی اُسے اس قدر تمنّا تھی فنا نہ ہو جائیں۔ لیکن اس نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کسی پر بھی نہ کیا۔ کون اس کے الفاظ پر یقین کر سکتا تھا۔

کس کو اس کے دلی رنج کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک ایسا عذابناک درد چھپا تھا جسے شاید ہی کوئی انسان برداشت کر سکتا ہو۔ ایسا درد دُنیا کے لئے نہیں ہوتا۔ دنیا اسے کیا سمجھے۔ دوست کیا جانیں اور غریب کینیوٹ کے وہاں دوست بھی کب تھے۔ وہ تو ایک مسافر تھا جو غیر مانوس زمینوں پر سفر کرتا سمتِ شمال اپنے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

شام ہو چکی تھی وہ ایک کھلی سڑک پر چل رہا تھا۔ ارد گرد کی فضا بہت دلکش تھی۔ کھیت اور چراگاہیں ہر طرف پھیلی تھیں۔ کُہر آلود ہَوا مارے سردی کے چیخ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بید مجنوں کا درخت اُگا تھا۔ اُسے وطن کی ایک ایک چیز یاد آ گئی۔ اس کا بدن تکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ وہ بید کے نیچے سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور وہ سو گیا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب بھی اسے احساس ہے کہ بید کے درخت نے اس پر اپنی شاخیں پھیلا رکھی ہیں۔ خواب ہی خواب میں اُسے محسوس ہوا گویا گرانڈیل بید ایک بوڑھا باپ ہے جس نے

اپنے تھکے ہوئے بیٹے کو اپنے بازوؤں میں اُٹھالیا ہے تاکہ اُسے واپس گھر چھوڑ آئے ——— بچپن کے زمانے کے باغوں میں ——— کوج کے ویران کناروں پر۔

اس کے بعد اسے خواب آیا کہ در اصل یہ کوج ہی کا بوڑھا بید ہے جس نے اس کی تلاش میں تمام دنیا چھان ماری ہے۔ اب اُسے تلاش کر لیا ہے اور چھوٹے باغ میں ندی کے کناروں پر لے آیا ہے۔ وہاں جوانا اپنے حسن اور تمام شان و عظمت سمیت اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہے اور اب بھی اُس نے اپنا سُنہری تاج پہن رکھا ہے۔

اس کے بعد اس کے سامنے دو عجیب و غریب شکلیں آگئیں۔ جو بچپن کے زمانے کی نسبت اب زیادہ انسانی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اب بدل چکی تھیں۔ لیکن اُسے یاد آگیا کہ یہ وہی میٹھی روٹی کا آدمی اور دوشیزہ ہیں جنھوں نے اپنی صورت کا بہترین پہلو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور جو اس قدر بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

وہ دونوں کینیوٹ سے کہنے لگے " ہم تمہارے شکر گذار ہیں جو تم ہماری زبانوں کو حرکت دینے کا موجب ہوئے۔ ہم نے تم سے سیکھ لیا ہے

کہ خیالات کا اظہار آزادانہ طور پر کر دینا چاہیے نہیں تو ان سے کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوگا۔ اور اب ہمارے خیالات کے نتائج برآمد ہو گئے ہیں۔ ہماری منگنی ہو گئی ہے۔ عنقریب ہماری شادی ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر کوچ کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اپنی صورت کے بہترین پہلو سے وہ نہایت محترم معلوم ہو رہے تھے۔ انھیں حق حاصل تھا کہ وہ دُنیا کو اپنا یہی پہلو دکھائیں۔ انھوں نے اپنے قدم گرجے کی سمت بڑھائے کینیوٹ اور جوانا بھی بازوؤں میں بازو ڈال کر پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اس گرجے کی طرف جس کی سُرخ دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی تھیں بڑے گرجے کا دروازہ کھُل گیا۔ جب وہ ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے چوڑے راستے کی طرف پہنچے تو موسیقی کے نغموں نے ان کا استقبال کیا۔ بیٹھی روٹی کے بنے ہوئے مرد اور عورت پکار اُٹھے "پہلے ماسٹر" اور انھوں نے کینیوٹ اور جوانا کے لئے جگہ خالی کر دی۔

کینیوٹ اور جوانا قربان گاہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے یکایک جوانا کینیوٹ پر جھُک گئی۔ اور اُس کی آنکھوں سے برف کی مانند سرد

آنسو کینیوٹ کے چہرے پر آ گرے۔ وہ درحقیقت برف کے آنسو تھے۔ کیونکہ عاشق کی گرمجوشی محبت نے محبوبہ کا برف آلود سرد مہر دل پگھلا دیا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس پر مائل ہو رہی تھی۔ جونہی محبوبہ کے سرد آنسو عاشق کے تپتے ہوئے رخساروں پر گرے وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔ وہ اب بھی بید کے درخت کے نیچے موسم سرما کی شام کے وقت ایک اجنبی فضا میں بیٹھا تھا۔ اوپر سے بادل برف اور اولے نیچے گرا رہے تھے جو آ کر اس کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔

وہ پکار اٹھا "اگرچہ یہ ایک خواب تھا لیکن یہ میری زندگی کا مسرور ترین لمحہ تھا! آہ میں ایک مرتبہ پھر یہی خواب دیکھوں گا!"

اس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔ اور خواب دیکھنے لگا صبح کے وقت برف نہایت خاموشی سے گر رہی تھی۔ ہوا اپنی گود میں برف کے نرم نرم گالے لا لا کر کینیوٹ پر گرا رہی تھی۔ لیکن اب وہ سو رہا تھا گاؤں والے گرجے میں جانے کیلئے اس طرف آ نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ سڑک کے ایک طرف بید مجنوں کے نیچے ایک نوجوان لڑکا بیٹھا ہے اُس کا جسم منجمد ہو چکا ہے۔ اور روح پرواز کر چکی ہے۔

معصومیّت

معصومیّت

چاند کہنے لگا اگلے ہی دن میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی دیکھی۔ جو دنیا کی عیاری پر رو رہی تھی اسے ایک نہایت ہی خوبصورت گڑیا تحفے میں ملی تھی۔ درحقیقت یہ اتنی حسین اتنی نازک اور اتنی خوش رُو گڑیا تھی کہ یہ دنیا کے کرخت ہاتھوں کے استعمال کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس چھوٹی سی لڑکی کے بھائیوں نے —— وہ جو بڑے بڑے اور شرارتی بھائی تھے۔ گڑیا کو ایک درخت کی بہت بلند شاخوں پر پھینک دیا اور خود بھاگ گئے۔ چھوٹی لڑکی کا ہاتھ گڑیا تک نہیں پہنچتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ شاید گڑیا کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ کیونکہ اس نے بھی شاخوں میں اسکی طرف اپنے

بازو پھیلا کر منہ بسور لیا تھا۔۔۔۔ یہی دنیا کے مصائب تھے جن کے متعلق لڑکی اکثر سنتی چلی آئی تھی۔ "آہ غریب گڑیا! اندھیرا چھا رہا ہے۔ اگر رات ہو گئی تو کیا ہوگا۔ کیا میں اسے شاخوں میں تمام رات اکیلا ہی رہنے دوں۔ نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں اس کے ساتھ ہی۔ رہوں گی۔"

اب لڑکی کے دل میں عجیب و غریب وہم آنے لگے ۔۔۔۔ اس نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی بدشکل پریاں اونچی اونچی ٹوپیاں پہن کر جھاڑیوں میں بیٹھی ہیں اور بہت دور سے رقص اور موسیقی کی آوازیں آرہی ہیں۔ اسکے بعد وہ نزدیک آگئیں اور انھوں نے اس درخت کی سمت اپنی باہیں پھیلا دیں جن پر گڑیا بیٹھی تھی۔ اب انھوں نے اسکی طرف انگلیاں اٹھائیں اور اس کا مذاق اُڑا کر قہقہے لگائے۔ اُف! ننھی لڑکی دہشت زدہ ہوگئی۔ وہ آپ ہی آپ کہنے لگی "مجھے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر میں نے کبھی کوئی شرارت نہیں کی تو مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کبھی شرارت والی کوئی بات نہیں کی۔

لیکن اس کے بعد لڑکی کو ایک خیال آگیا ۔۔۔۔ اوہو! میں بیچاری بطخ پر ہنسی تھی کیونکہ وہ اپنی ٹانگ پر ایک سرخ چیتھڑا لپیٹے نہایت مضحکہ خیز

انداز سے دوڑتی پھرتی تھی۔ بیں ہنسی روک ہی نہ سکی۔ لیکن جانوروں پر ہنسنا اور ان کا مذاق اُڑانا بہت بُری بات ہوتی ہے۔

اُس کے بعد لڑکی نے اوپر گڑیا پر ایک نگاہ ڈالی اور اس سے پوچھا کیا تم نے بھی بطخ کی ہنسی اڑائی تھی؟"

اور یوں معلوم ہوا جیسے جواب میں گڑیا نے اپنے سر کو ایک جنبش دے دی ہے۔
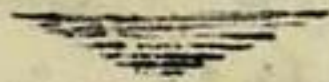
سوئی

سوئی

ایک سوئی تھی —— جس سے کپڑے رفو کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت عمدہ سوئی خیال کرتی تھی اس کا خیال تھا کہ مجھ سے پھول بھی کاڑھے جاسکتے ہیں جب انگلیاں اُسے پکڑتیں تو وہ اُن سے کہتی ”مجھے زور سے پکڑنا! کہیں نیچے نہ گرا دینا! اگر گرا دیا تو پھر میں کبھی نہ ملوں گی، میں اتنی باریک اور نفیس ہوں“ انگلیاں اس کا گول مول جسم پکڑ کر کہتیں ”خیر یہ تمھاری ہی رائے ہے نا!“ پھر سوئی اپنے پیچھے ایک لمبا سا دھاگا گھسیٹتے ہوئے کہتی ”دیکھو! میرے پیچھے پیچھے ایک ریل گاڑی آرہی ہے“ —— کیونکہ اس دھاگے میں کوئی گانٹھ نہیں ہوتی تھی اور بلا رک ٹوک دھاگا اُس کے پیچھے چلا آتا تھا۔“

اب اُنگلیوں نے سوئی کا اگلا سرا باورچی کے سلیپر پر رکھ کر اسے زور سے دبایا۔ کیونکہ اس کے اوپر کے چمڑے میں ایک شگاف ہو گیا تھا جسے

سیا جا رہا تھا۔

سُوئی کہنے لگی۔ "اُف کس قدر بھدّا کام ہے۔ میں کبھی چمڑے کے اندر نہیں گھُسوں گی۔ نہیں تو میں ٹوٹ جاؤں گی......... ہائے میں ٹُوٹی!" اور یقیناً وہ ٹوٹ چکی تھی۔ "کیا میں کہتی نہیں تھی کہ میں ٹوٹ جاؤں گی۔ میں تو جانتی تھی نا کہ میں ایسے کام کے لئے نہیں ہوں۔ میں بڑی نازک مزاج ہوں۔"

اُنگلیاں کہنے لگیں۔ "اب یہ سینے کے کام کی نہیں رہی۔" لیکن اب بھی انھوں نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ باورچی نے اس پر تھوڑی سی لاکھ گرائی اور پھر اسے اپنے رومال کے اوپر کے سرے میں اُڑس دیا۔

سُوئی بولی۔ "اچھا؟ خوب! اب میں نمائشی پن بن گئی ہوں میں اچھی طرح جانتی تھی کہ کبھی مجھے کوئی بہت بڑی عزّت حاصل ہو گی۔ بلند فطرت یقیناً بلند رُتبہ حاصل کر کے رہتی ہے۔" اور پھر آپ ہی آپ چپکے سے ہنس دی۔ سوئیاں ہمیشہ اکیلی ہی ہنستی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے آج تک کسی سُوئی کو ہنستے نہیں دیکھا۔ اب وہ بڑے غرور سے وہاں بیٹھ کر جیسے کوئی شاہی سواری میں بیٹھا ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اور پھر اپنے ہمسائے

پن سے کہنے لگی "کیا میں تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ تم سونے کے بنے ہو؟ تم اپنے سر سمیت مجھے بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے ہو۔ البتہ تمھارا قد ذرا چھوٹا ہے۔ قد بڑھانے کے لئے تمھیں بہت سی تکلیفیں برداشت کرنی پڑینگی کیونکہ ہر ایک کو لاکھ تھوڑی ہی میسّر ہو سکتی ہے۔"

جونہی اُس نے یہ الفاظ کہے۔ مارے غرور کے وہ اس طرح اوپر کو اُچھلی کہ رومال سے نکل کر سیدھی ایک نالی میں جا گری جسے باورچی صاف کر رہا تھا۔ اور جب گندا پانی اُسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ تو وہ کہنے لگی۔ "اب میں ذرا سفر کو چلی ہوں۔ مجھے پوری پوری اُمید ہے کہ میں گُم نہیں ہوں گی۔" لیکن در اصل وہ نالی میں گُم ہو چکی تھی۔ نالی میں پڑی پڑی کہنے لگی "میں اس دُنیا کے لئے ضرورت سے زیادہ نفیس اور باریک ثابت ہوئی ہوں۔ لیکن خیر میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں۔ اور یہی بات مجھے ہمیشہ تسکین دے دیتی ہے۔"

پس سُوئی نے اپنا پُر غرور رویّہ جاری رکھا اور اپنا مسخرہ پن نہ چھوڑا۔ اب وہاں سے اور بھی بہتی ہوئی چیزیں گزریں چھلکے، پیال اور پُرانے اخباروں کے کاغذوں کے ٹکڑے۔

سوئی کہنے لگی۔ "دیکھو یہ کس طرح تیر رہے ہیں۔ جانتے نہیں کہ انکے نیچے کیا پڑا ہے۔ میں یہیں ہوں اور یہیں ٹکی رہوں گی۔ وہ ایک چھلکا جارہا ہے۔ اب پیال کا ایک ٹکڑا آرہا ہے۔ کس طرح گھوم گھوم کر پیچ و تاب کھاتا چلا جارہا ہے۔ دیکھو میاں اتنی خودی اچھی نہیں! خواہ مخواہ کسی پتھر کے ساتھ ٹکرا جاؤ گے! وہ دیکھو اب ایک اخبار کے کاغذ کا ٹکڑا آیا! جو کچھ اس پر لکھا ہے لوگ مدتوں سے اسے بھلا چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی بڑے ناز نخرے دکھاتا چلا آرہا ہے۔ اور میں؟ میں یہاں چپ چاپ بڑے صبر سے بیٹھی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں میں یہاں سے نہیں ہلوں گی۔"

ایک دن سوئی کے قریب آکر کوئی چیز اتنی شان سے چمکی کہ اس نے سمجھا کہ یہ کوئی ہیرا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ٹوٹی ہوئی بوتل کا ایک ٹکڑا تھا۔ سوئی اس سے باتیں کرنے لگی۔ لیکن صرف اس لئے کہ وہ چمکدار تھا۔ اپنے آپ کے متعلق کہنے لگی "میں سینے پر لگانے والا ایک پن ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم درحقیقت ایک ہیرا ہو!"

وہ کہنے لگا۔ "ہاں۔ یہی کچھ سمجھ لو۔" اور دونوں ایک دوسرے کو

دو بڑی قیمتی چیزیں سمجھنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے دنیا اور اسکے
خود بیں لوگوں کے متعلق باتیں کرنی شروع کیں۔

سوئی کہنے لگی "میں ایک خاتون کی تلیدانی میں رہ چکی ہوں - یہ
خاتون ایک باورچن تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر پانچ پانچ انگلیاں
تھیں۔ لیکن یہ پانچوں اتنی مغرور تھیں جتنی میں نے دنیا میں کوئی چیز نہیں
دیکھی۔ حالانکہ یہ سب کی سب میری نوکر تھیں۔ پہلے مجھے تلیدانی سے باہر
نکالا کرتیں اور پھر اندر چھوڑنے جایا کرتی تھیں"

شیشے کا ٹکڑا کہنے لگا" وہ کسی اعلیٰ خاندان کی نہیں تھیں؟"

سوئی بولی" اعلیٰ خاندان!؟ واہ! البتہ مغرور بڑی تھیں۔ تینوں
بہنیں تھیں۔ ان میں بڑا اتفاق تھا۔ ہر ایک کا قد دوسری سے مختلف
تھا۔ پہلی انگلی چھوٹی اور موٹی سی تھی۔ اس کی پیٹھ میں صرف ایک ہی
جوڑ تھا۔ اور وہ صرف ایک جھکاؤ جھک سکتی تھی۔ لیکن وہ کہا کرتی تھی
کہ اگر میں کٹ جاؤں تو کوئی آدمی سپاہی نہ بن سکے۔ اس کی پڑوسن
انگلی کھٹی اور میٹھی چیزوں میں غوطے لگایا کرتی تھی۔ یا کبھی کبھی سورج یا چاند
کی طرف اشارے کیا کرتی۔ جب انگلیاں لکھتی تھیں تو اس کی مدد سے

حروف بنتے تھے۔ درمیانی انگلی سب سے لمبی تھی۔ اور دوسریوں کے سروں کی طرف اُونچی ہو ہو کر دیکھا کرتی تھی۔ اس سے اگلی انگلی نے اپنے گرد سونے کا ایک پٹکہ (انگوٹھی) پہن رکھا تھا۔ اور سب سے چھوٹی تو کسی کام کی نہیں تھی معلوم نہیں اسے فخر کس بات پر تھا۔ الغرض وہ سب کی سب شیخی باز تھیں اور شیخی باز ہی رہیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے انھیں چھوڑ دیا۔"

ٹوٹی بوتل کا ٹکڑا کہنے لگا "اور اب ہم دونوں بیٹھے چمک رہے ہیں"؛ اس دَوران میں پانی کا ایک ریلا آیا۔ یہاں تک کہ پانی نالی کے کناروں سے بھی پرے بہنے لگا شیشے کا ٹکڑا بھی ساتھ ہی کہیں بہ گیا۔ سُوئی کہنے لگی۔" اسے تو ترقی مل گئی ہے لیکن میں ابھی یہیں ہوں. میں بہت ہی باریک ہوں اور یہی صفت میرے لئے فخر کا باعث ہے اور مجھے ایسی باتوں کی پروا کیا ہے" پس وہ نہایت غرور سے وہیں بیٹھی رہی اور اس کے دل میں بہت سے ایسے خیال آنے لگے ــــ

"میں تو بلاشبہ یہ خیال کر سکتی ہوں۔ کہ میں کسی سورج کی کرن سے پیدا ہوئی ہوں۔ میں اتنی پتلی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورج کی

کرنیں پانی کے اندر مجھے ہی ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ اہاہاہا میں کتنی باریک
ہوں کہ خود میری ماں مجھے تلاش نہیں کرسکتی۔ اگر میری پرانی آنکھ
ہوتی جواب ٹوٹ چکی ہے۔ تو میں ضرور اس وقت رونے لگتی۔ لیکن
میں نہیں روؤں گی۔ رونا شرافت سے بعید ہے۔"

ایک دن دو بازاری لڑکے نالی کے پانی میں پاؤں مارتے اُدھر
آنکلے۔ وہ نالی سے پرانی کیلیں پیسے اور دوسری عجیب و غریب چیزیں ڈھونڈتے
پھرتے تھے۔ اگرچہ یہ ایک گندا کام تھا۔ لیکن انھیں اس سے بہت خوشی
حاصل ہورہی تھی۔ ایک کو جب سوئی چبھی تو وہ کہنے لگا۔

"ہیلو! تمھارے لئے بھی ایک چیز مل گئی۔"

سُوئی بڑے غصّے سے کہنے لگی۔ "میں "چیز" نہیں ہوں۔ میں ایک
نوجوان خاتون ہوں۔" لیکن اس کی آواز کسی نے نہ سُنی۔

لاکھ اُکھڑ چکی تھی اور اب سوئی بالکل سیاہ پڑ گئی تھی۔ لیکن
سیاہی لوگوں کو اور زیادہ باریک اور نفیس بنا دیتی ہے۔ سو سُوئی اپنے
آپ کو پہلے سے بھی زیادہ باریک سمجھنے لگی۔

ایک لڑکا بولا۔ "لو وہ ایک انڈے کا خول تیرتا ہوا آیا" اور پھر

لڑکوں نے اسے انڈے کے خول میں چبھو دیا۔

سوئی کہنے لگی۔ "دیواریں سفید ہیں اور میں خود کالی ہوں۔ یہ بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اب میں نظر بھی آسکتی ہوں۔ اچھا ہوا جو میں کالی ہوگئی لیکن اب میں اس دربار میں واپس جانے کے لئے زیادہ بیتاب نہیں ہونگی جس سے میں ابھی ابھی نکلی ہوں۔ نہیں تو میں ٹوٹ جاؤں گی۔" وہ سچ مچ اس دریا کے لئے زیادہ بے تاب نہ ہوئی۔ اور نہ ٹوٹی۔ اگر کوئی دریا کے لئے مضطرب ہوکر بیمار ہوجائے تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ وہ اپنا دل لوہے کا بنالے۔ اور کسی طرح اپنی قدر نہ بھولے۔ دریا کے لئے میرا اضطراب سرد پڑ چکا ہے۔ نازک مزاج لوگوں کو بڑی بڑی مصیبتیں سہنی پڑتی ہیں۔"

"تڑاخ" کی آواز پیدا ہوئی اور انڈے کے خول پر سے گاڑی کا ایک پہیہ گزر گیا۔ سوئی اندر ہی اندر جلدی سے بولی۔ "سبحان اللہ! کسی نے مجھے پیس ہی ڈالا! ہائے اللہ میں مری! میں ٹوٹی! میں اب پھر بیمار ہوجاؤں گی۔" لیکن وہ ٹوٹ نہ سکی۔ وہ چپٹی ہوکر لیٹی رہی اور پہیہ اس پر سے گذر گیا۔ اور وہ اب تک وہیں پڑی ہے۔

اس سوئی کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ در اصل یہ سوئی نہیں۔ بلکہ ایک مغرور عورت تھی۔ اور اب اس افسانے کو پڑھنے والی ہر عورت اپنے دل میں سوچے کہ کہیں یہ سوئی میں ہی تو نہیں؟ اور سوچ کر بیشک کہدے کہ نہیں میں ہرگز نہیں!

اصلی شہزادی

اصلی شہزادی

ایک شاہزادہ تھا جو کسی ایسی شاہزادی سے شادی کرنے کے انتظار میں تھا۔ جو اصلی شاہزادی ہو۔ اُس نے ایسی شاہزادی کی جستجو میں بہت سفر کئے۔ تمام دُنیا چھان ماری۔ لیکن ہمیشہ اس کے راستہ میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو جاتی۔ شاہزادیاں بے شمار تھیں۔ لیکن اس بات کا یقین کرنا کہ یہ اصلی شاہزادیاں ہیں یا نہیں؟ بہت مشکل تھا۔ ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکل آتا۔ شاہزادہ مایوس اور ناامید ہو کر گھر چلا آتا۔

آہ! اسے اصلی شاہزادی سے شادی کرنے کی کتنی آرزو تھی۔!

ایک شام شہر میں ایک زبردست طوفان آیا۔ بادل گرجے۔ بجلی

چمکی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی یہ نظارہ نہایت خوفناک تھا۔

جس وقت ہوا، بارش، بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک زوروں پر تھی کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سُنائی دی۔ بوڑھا بادشاہ خود دروازہ کھولنے کے لئے باہر نکلا۔

باہر ایک شاہزادی کھڑی تھی۔

اُف! مینہ اور طوفان نے اس کی عجیب حالت بنا دی تھی۔ اُس کا لباس اور اُس کے بالوں کی لٹیں شرابور ہو رہی تھیں اور اُن سے پانی نچڑ رہا تھا۔ یہ پانی اُس کے نازک جوتوں میں بھر بھر کر جوتوں کی ایڑیوں سے باہر نکل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کا بیان تھا کہ "میں ایک اصلی شاہزادی ہوں"۔ بوڑھی ملکہ نے دل میں کہا "بہت بہتر! ہم بہت جلد اصلیت معلوم کر لیں گے"۔ لیکن بظاہر وہ خاموش رہی۔ ملکہ سونے کے کمرے میں گئی۔ اس نے بستر اُٹھا دیا اور پلنگ پر ایک مٹر کا دانہ رکھ دیا۔ پھر اُس پر روئی کے بیس گدیلے بچھا دئے اور اُن بیس گدیلوں پر سُنبل کی روئی کے بیس نوشک اور بچھا دیئے۔

یہ تھا بستر جس میں شاہزادی نے رات بسر کی۔

علی الصبح انھوں نے اُس سے دریافت کیا کہ "رات کیسے گذری؟"

شاہزادی بولی "نہایت بُری طرح سے تمام رات میری آنکھ تک نہیں لگی۔ خدا جانے بستر میں کیا چیز تھی؟ میں کسی نہایت تکلیف دہ اور سخت چیز پر لیٹی رہی ہوں۔ میرا جسم تمام نیلا پڑ گیا ہے۔ اُف! رات سخت عذاب میں کٹی۔"

گھر کے سب لوگوں نے معلوم کر لیا کہ وہ اصلی شہزادی ہے کیونکہ اُس نے بیس توشکوں اور بیس نرم نرم گدیلوں میں سے بھی مٹر کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔

ممکن نہیں کہ ایک اصلی شہزادی کے سوا کوئی اور اتنی حساس اور نازک ہو۔ شہزادے نے اس سے شادی کر لی کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اصلی شہزادی ہے۔

مٹر کے دانے کو شاہی عجائب گھر میں رکھ دیا گیا جہاں وہ اسوقت تک موجود رہے گا۔ جب تک اُسے کوئی چرا نہ لے۔

کہتے ہیں کہ یہ ایک سچی کہانی ہے۔

تیتری کا بھائی

تیتری کا بھائی

ایک تیتری کے بھائی کو دلہن کی تلاش تھی۔ قدرتاً وہ کلیوں میں سے کسی نہایت ہی خوبصورت کلی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اکثر پھولوں کی تمام کیاریوں پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ تمام کلیاں اپنی اپنی ڈنڈوں پر چپ چاپ شرم سے گردن جھکائے بیٹھی تھیں۔ بالکل اسی طرح سے دوشیزہ لڑکیوں کو اپنی منگنی سے پہلے بیٹھنا چاہیئے۔ لیکن وہاں لاتعداد کلیاں تھیں۔ اور اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ان کلیوں میں سے کسی ایک کلی کی تلاش اسے تھکا ہی دے گی۔ تیتری کا بھائی زیادہ تکلیف نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ڈیزی کی کلیوں ہی کی طرف جا نکلا۔ اہل فرانس اس پھول کو مارگرٹ کہتے ہیں۔ اور وہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ڈیزی کی ننھی کلی

پیش گوئیاں بھی کر سکتی ہے۔ عشاق اس کی پتیاں توڑتے ہیں اور جب وہ ہر پتی توڑتے ہیں تو ساتھ ساتھ ایک سوال پوچھتے جاتے ہیں "کیا اس نوجوان یا اس دوشیزہ کو مجھ سے محبت ہے؟ بہت؟ دیوانہ وار جیسے دلی تمنا؟ تھوڑی؟ بالکل ہی نہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔ ہر کوئی یہ باتیں اپنی ہی زبان میں پوچھتا ہے۔ تیتری کا بھائی بھی مارگرٹ کے پاس یہی کچھ پوچھنے آیا لیکن اس نے اس کی پتیاں نہ توڑیں۔ اس کی بجائے اس نے ہر ایک کو ایک ایک بوسہ دے دیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ پیار سے بہت بڑے کام نکل سکتے ہیں۔

وہ مارگرٹ سے کہنے لگا۔ "پیاری مارگرٹ تم سب پھولوں میں سے زیادہ دانا عورت ہو۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میں کس کلی سے شادی کر دوں؟ کون سی کلی میری بیوی ہوگی؟ جب میں جان جاؤں گا۔ تو سیدھا اسی کلی کی طرف چلا جاؤں گا۔ اور جا کر اس سے منگنی کی بات چیت کروں گا۔"

لیکن مارگرٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خفا ہو گئی تھی کیونکہ تیتری کے بھائی نے اسے عورت کہا تھا۔ حالانکہ وہ ابھی بالکل لڑکی ہی تھی۔ ظاہر ہے کہ عورت اور لڑکی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تیتری کے

بھائی نے اس سے دوبارہ اور سہ بارہ یہی بات پوچھی۔ لیکن وہ پہلے کی طرح ہی چپ رہی۔ ایک لفظ تک نہ بولی۔ تیتری کے بھائی نے بھی زیادہ دیر تک اس کا انتظار نہ کیا۔ بلکہ اپنی عاشقی کی مہم شروع کرنے کے لئے فوراً اڑ گیا۔

بہار ابھی ابھی آئی تھی۔ اور گل چاندنی اور نرگس کی کلیاں شاداب اور معطر ہو رہی تھیں۔

تیتری کا بھائی اپنے دل ہی میں کہنے لگا۔ "یہ کتنی حسین اور چنچل لڑکیاں ہیں۔ البتہ ذرا ظاہر دار ہیں۔

پھر جیسا کہ نوجوان لڑکوں کی عادت ہوتی ہے۔ وہ ذرا زیادہ بڑی عمر کی لڑکیاں تلاش کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ "گل ہوا" کے پودوں کی طرف گیا۔ لیکن وہاں کی کلیوں سے اس کا مذاق نہ ملتا تھا۔ بنفشے کی کلیاں بڑی ہی جذباتی تھیں۔ نیبو کی کلیوں کا قد ضرورت سے بھی زیادہ چھوٹا تھا۔ اور سنگترے کی کلیوں کی تمام کا تمام خاندان عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ بعض دوسری اچھی اچھی کلیاں اگرچہ گلاب کے پھولوں کی ہم شکل تھیں لیکن ان کا اعتبار کیا۔ اگر وہ آج بہار دکھلا رہی ہیں۔ تو کل پہلی ہی آندھی سے

جھڑ جائیں گی۔ اگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ کوئی شادی کر بھی لے تو معلوم نہیں کب رنڈوا ہو جائے۔ مٹر کی کلی کو دیکھ کر وہ سب سے زیادہ خوش ہوا۔ اس کا چہرہ سُرخ و سفید تھا۔ وہ سلیقہ مند بھی تھی اور نازک اندام بھی۔ اور ایسی گھریلو دوشیزہ لڑکیوں میں سے تھی۔ جن کی شکل بھی نہایت اچھی ہوتی ہے۔ اور جو باورچی خانے کے لئے بھی مفید ہوتی ہیں۔ وہ اس سے شادی کی درخواست کرنے ہی والا تھا۔ کہ اسے ایک پھلی نظر پڑی۔ جس کے ایک سرے میں ایک مرجھا ہوا پھول اٹکا ہوا تھا۔

تیتری کا بھائی کہنے لگا۔ "یہ کون ہے"؟

ننھی بھی بولی۔ "یہ میری بہن ہے"

وہ کہنے لگا۔ "پھر تم بھی کسی نہ کسی دن اسی کی ہم شکل بن جاؤ گی؟"

اور وہاں سے سخت خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا۔

ایک جھاڑی میں "للی" کی ایک نہایت ہی شاداب اور حسین کلی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ لیکن اس کے قریب ہی اس شکل کی اور بھی بہت کی لڑکیاں موجود تھیں۔ جن کے منہ لمبے لمبے اور گال سانولے رنگ کے تھے۔ وہ کہنے لگا۔ "نہیں مجھے یہ کلی پسند نہیں۔ لیکن ان میں سے کسے

پسند کر دوں"؟

بہار گزر گئی۔ اور موسم گرما بھی اپنے آخیر کو پہنچا۔ حتےٰ کہ خزاں آپہنچی لیکن تیتری کے بھائی نے ابھی تک دلہن نہیں چنی تھی۔ کلیاں بڑے بڑے قیمتی لباس پہن کر باہر نکلنے لگیں۔ لیکن کیا فائدہ۔ ان میں جوانی کی تازہ خوشبو ہی نہیں تھی۔ دل خواہ بوڑھا ہی ہو جائے۔ اسے ہمیشہ خوشبو کی طلب رہتی ہے۔ گل داؤدی یاد دلاتے ہوئے دل میں ویسی خوشبو کہاں۔ سو اب تیتری کے بھائی پودینہ کی ایک بوٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بالکل زمین کے ساتھ لگ کر اُگی ہوئی تھی۔ تم جانتے ہو کہ اس پودے میں پھول نہیں آتے۔ صرف خوشبو ہی خوشبو ہوتی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک خوشبو ہی خوشبو — ہر پتے میں ایک پھول کے برابر خوشبو۔

تیتری کا بھائی کہنے لگا۔ "میں اسے بیوی بناؤں گا۔ اور اس نے اس سے شادی کی درخواست بھی کر دی۔ لیکن پودینے کی بوٹی نہایت خاموشی اور سرد مہری سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ اور آخر کار اس سے کہنے لگی "مرضی ہے تو میرے دوست بن جاؤ۔ اس سے زیادہ نہیں۔ میں معمر ہو چکی ہوں اور تم بھی بوڑھے ہو۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے لئے

اسی طرح رہیں گے۔ جیسے میاں اور بیوی اس عمر میں اپنا مذاق نہیں اڑانا چاہیئے۔

سو اب یوں ہوا۔ کہ تیتری کے بھائی کو کوئی بیوی نہ مل سکی۔ اس نے انتخاب میں ہی بہت وقت صرف کر دیا تھا۔ اور یہ نہایت ہی بری بات ہوا کرتی ہے۔ تیتری کا بھائی مدت العمر کنوارا ہی رہا۔

خزاں کا آخری زمانہ تھا۔ موسم ابر آلود اور برسات کا سا تھا۔ سرد ہوا بید مجنوں کے جھکے ہوئے درختوں کی پیٹھ پر سے گذر رہی تھی۔ اور وہ اس کے بوجھ کے تلے چیخ رہے تھے۔ یہ ایسا موسم نہیں تھا کہ کوئی سرد کپڑوں میں اڑتا پھرے۔ خوش قسمتی سے تیتری کے بھائی کے ساتھ یہ پیش نہ آیا۔ اتفاقاً اسے ایک جائے پناہ مل گئی تھی۔ یہ ایک کمرہ تھا۔ جسے چولھے کی مدد سے گرم کر دیا گیا تھا۔ وہاں اتنی ہی گرمی تھی جتنی گرمیوں میں ہوا کرتی ہے۔ وہ دل میں کہنے لگا۔ "یہاں میں رہ سکوں گا!"

پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "لیکن صرف "رہ سکنا" ہی کافی نہیں مجھے آزادی۔ دھوپ اور جی بہلانے کے لیئے ایک ننھی سی کلی

کی ہی ضرورت ہے۔ جو میری دوست ہو۔"

پھر وہ کھڑکی کے شیشوں کے قریب اُڑنے لگا۔ گھر والوں نے اسے بہت ہی پسند کیا۔ اسے پکڑ لیا۔ اور ایک ایسے صندوق میں ایک پن پر جما دیا۔ جہاں اور بھی بہت سی عجیب وغریب چیزیں پڑی تھیں وہ اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ اور نہ کر سکے۔

تیتری کا بھائی کہنے لگا۔"اب میں پھولوں کی طرح ایک ڈالی پر بیٹھا ہوں۔ لیکن یقیناً یہ کوئی اتنی خوشگوار بات نہیں۔ مجھے خیال کرنا چاہیے۔ کہ یہ بھی شادی ہی کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ میں یہاں مضبوطی سے جکڑ دیا گیا ہوں......" اور اس خیال سے اسے ذرا تسلی ہوئی۔

قریب ہی کے کمرے میں ایک برتن کے اندر کچھ پودے اُگے تھے۔ کہنے لگے۔"تیتری کے بھائی نے اپنے آپ کو کتنی جھوٹی تسلی دی ہے"۔

تیتری کا بھائی دل ہی دل میں کہنے لگا۔"آہ! برتنوں میں اُگے ہوئے ان پھولوں کا زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کا تو انسانوں سے بہت ہی زیادہ تعلق ہے۔"

گناہِ معصومیت

گناہِ معصومیت

چاند نے کل ایک چھوٹے سے لڑکے کو کھڑکی میں سے جھانک کر یہ کہانی سنائی:۔

کہنے لگا۔" ایک دفعہ میں مکانوں میں گھرے ہوئے ایک صحن کی طرف نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہاں ایک مرغی "دھیمی" آواز میں کڑکڑاتی ہوئی اپنے گیارہ بچوں کو ساتھ لئے اِدھر اُدھر پھر رہی تھی اور ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی ناچتی کودتی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ مرغی یکایک اتنا ڈری کہ اُس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اور وہ پَر پھیلا کر اپنے بچوں پر اوپر تک اُچھلی۔ کہیں اِدھر لڑکی کا باپ بھی آن نکلا اس نے لڑکی کو خوب خوب جھڑکا۔ خیر میں آگے نکل گیا۔ اور بات گئی

آئی ہوئی۔

دوسرے دن رات کو میں نے پھر اپنی کھڑکی سے ذرا نیچے کو جھانکا کائنات کی ہر چیز چپ ہو گئی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ننھی لڑکی سیدھی مُرغیوں کے گھر کی طرف ہو لی۔ اور پھر اُس نے کیا کیا، کہ دروازے کی زنجیر کھول کر مُرغوں مُرغیوں اور اُن کے بچوں میں جا گھسی۔ اب جو یہ ان کے پیچھے دوڑی تو یہ سب لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے۔ اور انھوں نے خوب اپنے پر پھڑپھڑائے۔ اور بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ میں نے بھی دیوار کے روزن سے یہ دردناک واقعہ دیکھ لیا۔ اور میں اوپر ہی اوپر دانت پیس کر رہ گیا۔ اور اس چلبلی لڑکی سے خفا ہو گیا۔ اور میں بہت خوش ہوا جب اُس کے باپ نے آ کر اُسے کل سے بھی زیادہ ڈانٹ بتائی۔ اور اس کا بازو زور سے پکڑ لیا۔

لڑکی کا سر نیچے جھک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دو موٹے آنسو مجھے دُور سے صاف صاف نظر آ گئے۔ باپ کہنے لگا۔ "چوہیا! تو کیا کر رہی تھی یہاں!؟"

لڑکی کہنے لگی۔ "کل میں نے جب مُرغی کو ڈرا دیا تھا میں اس کا مُنہ

چومنا چاہتی تھی۔ اور اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے یہ بات آپ کو نہ بتائی۔ مجھے ڈر آتا تھا۔

باپ نے بے اختیار معصوم لڑکی کی ننھی سی پیشانی کو چوم لیا۔ اور میں نے اپنی سب سے زیادہ سنہری کرن کو نیچے بھیجا کہ وہ جلدی سے اس کے ہونٹوں اور اس کی پیاری پیاری آنکھوں کے بوسے چُرا لائیں۔

تصویرِ غربت

تصویرِ غربت

یہ سال کی آخری شام تھی۔ سردی تو غضب کی تھی ہی ساتھ بے پناہ ژالہ باری نے بھی ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ فضا پر ہلکی ہلکی تاریکی چھا چکی تھی۔ اس سردی اور تاریکی میں ایک چھوٹی سی غریب لڑکی ننگے پاؤں اور ننگے سر گلیوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ یوں تو گھر سے آتی دفعہ اس نے سلیپر پہن لئے تھے۔ لیکن اُن کا پہننا نہ پہننا برابر تھا۔ وہ اتنے بڑے تھے۔ شاید اس کی ماں کے تھے۔ دو غضب کی تیز رفتار گاڑیوں کی جھپٹ سے بچنے کے لئے گھبرا کر جب وہ سڑک کے اس پار دوڑی۔ تو یہ بھی کہیں اندھیرے میں کھو گئے۔ ایک سلیپر تو اُسے مل ہی نہ سکا دوسرا کہیں ایک شریر لڑکے کے ہاتھ آ گیا۔ اور وہ اُسے لیکر

یہ کہتا ہوا دوڑ گیا۔ کہ میں بڑا ہو کر اپنے بچوں کے لئے اس کا جھولا بناؤ نگا"
سو اب ننھے ننھے پیروں والی ننھی لڑکی ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ اس
کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پاؤں نیلے اور لال پڑ گئے تھے
اس کی جھولی میں بہت سی دیا سلائیاں تھیں۔ ایک بنڈل اس نے
اپنے ہاتھ میں بھی پکڑ رکھا تھا۔ تمام دن کسی نے اس سے کچھ نہ
خریدا اُسے ایک پیسہ تک نہ ملا۔ اب وہ بھوک اور سردی سے بے حال کانپتی
ہوئی نہایت ہی آہستہ آہستہ گلیوں میں پھر رہی تھی۔ آہ!
غریب لڑکی! اس وقت وہ مصیبت اور کرب کی ایک مجسم تصویر معلوم
ہوتی تھی۔ اس کے لمبے لمبے گھنگریالے بالوں پر جو اس کے کاندھو
پر پریشان ہو رہے تھے۔ برف کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ لیکن اسے
اس کی کچھ پروا نہ تھی۔

مکانوں کی ایک ایک کھڑکی سے روشنی نکل رہی تھی۔ اور بھنے
ہوئے بطخ کے گوشت کی ذائقہ آمیز خوشبو ہر طرف پھیلی تھی۔ کیونکہ
آج سال کا پہلا دن تھا ــــــ وہ اس بات کو بھولی تو نہیں تھی۔ دو
مکانوں کی دیواریں ایک کونے میں آکر ملتی تھیں۔ بے چاری نے اسی میں

اپنے آپ کو گرا لیا اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے
پاؤں اپنے نیچے چھپا لئے تھے لیکن پھر بھی وہ سردی سے نہ بچ سکی۔
اس کی جرأت نہ پڑتی تھی کہ گھر جائے۔ کیونکہ اس کے پاس گھر لے
جانے کے لئے ایک پیسہ تک نہ تھا۔ اس کا باپ یقیناً اُسے پیٹتا۔ اس
کے علاوہ گھر میں بھی تو قریب قریب اتنی ہی سردی تھی۔ گھر والوں کے
پاس بھی سردی سے بچنے کے لئے صرف چھت ہی چھت تھی۔ جس میں
سے ہوا چیختی ہوئی گذرا کرتی تھی۔ حالانکہ اس ٹوٹی ہوئی چھت کی کئی
درزیں پیال اور چیتھڑوں سے بند کر دی گئی تھیں۔ اس کے ننھے ننھے
ہاتھ سردی سے برف کے مانند جم گئے تھے۔ اس نے اپنے دل میں
کہا کہ بنڈل ہی سے ایک دیا سلائی لے کر دیوار سے رگڑتی ہوں۔ اس کے
شعلے سے شاید ٹھٹھرتی ہوئی انگلیوں کو کچھ آرام آئے۔ چنانچہ اس نے
ایک دیا سلائی دیوار سے رگڑی "شاں" کی آواز پیدا ہوئی اور وہ جلنے
لگی۔ لڑکی اپنا ہاتھ اس کے اوپر لے گئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا گویا اس سے
ایک چھوٹی سی موم بتی کی طرح گرم اور چمکیلی روشنی نکل رہی ہے۔ سچ سچ
کیا ہی عجیب روشنی تھی۔ لڑکی کو یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ ایک بیل

کے پیروں والی بڑی لوہے کی انگیٹھی کے قریب بیٹھی ہے۔ آگ کس عمدگی سے جلتی تھی۔ اور اس قدر خوشگوار اور گرم محسوس ہوتی تھی۔ کہ بچی نے گرمی پہنچانے کے لئے اپنے پاؤں بھی آگے کر دیئے۔ لیکن افسوس دیاسلائی بجھ چکی تھی۔ انگیٹھی غائب تھی اور اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی تیلی کا صرف آخری سرا رہ گیا تھا۔

اس نے ایک دوسری دیاسلائی دیوار پر رگڑی۔ یہ بھی اپنے منہ سے آگ اُگلنے لگی اور جب اس کی روشنی دیوار پر پڑی تو ٹھوس دیوار ایک باریک سے پردے کی طرح شفاف ہوگئی اور سامنے کے کمرے کی سب چیزیں نظر آنے لگیں۔

اب اس نے دوسری دیاسلائی دیوار سے رگڑی۔ میز پر ایک برف کا سا سفید کپڑا بچھا تھا۔ جس پر نہایت شاندار کھانے چنے تھے وہاں بطخ کا بھنا ہوا گوشت بھی پڑا تھا جسے سیب اور کشمش ڈال کر پکایا گیا تھا۔ اور سب سے زیادہ حسین منظر وہ تھا۔ جب یہ بھنی ہوئی بطخ یکایک رکابی سے نیچے کود آئی اور فرش پر مٹک مٹک کر چلتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھی۔ حالانکہ چھری اور میز کا کانٹا ابھی تک اس کے سینے

ہی میں گرا تھا۔ لیکن اس کے بعد دیا سلائی بُجھ گئی اور ایک موٹی سی نم آلود اور ٹھنڈی دیوار کے سوا اس کی نظروں سے اور سبھی کچھ چھپ گیا۔

اس کے بعد اس نے ایک دوسری دیا سلائی جلائی اور دیکھا کہ وہ کرسمس کے ایک خوبصورت درخت کے نیچے بیٹھی ہے یہ درخت اس درخت سے بہت بڑا اور بہت زیادہ خوبصورتی سے سجا ہوا تھا جو اس نے متمول تاجر کے گھر میں شیشے کے دروازے سے جھانک کر دیکھا تھا۔ درخت کی سرسبز شاخوں پر ہزارہا شمعیں روشن تھیں اور عجیب و غریب رنگین تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ننھی نے اپنے دونوں بازوان کی طرف پھیلا دیئے اور دیا سلائی بجھ گئی۔

کرسمس کے دن جلائی ہوئی تمام شمعیں بتدریج اونچی ہونی شروع ہوئیں۔ یہاں تک کہ وہ ستاروں کی طرح معلوم ہونے لگیں۔ اس کے بعد اس نے ایک ستارہ ٹوٹتا ہوا دیکھا جو اپنے پیچھے روشنی کی ایک لمبی لکیر بناتا گیا۔ لڑکی نے دل میں کہا۔ کوئی مر رہا ہے۔ کیونکہ اس کی دادی اماں نے جواب مرچکی تھی۔ اور اُسے بہت پیار کیا کرتی تھی۔ اُسے یہی بتایا تھا کہ جب ستارہ ٹوٹتا ہے تو کوئی روح خدا کی طرف جا رہی ہوتی ہے

اس نے پھر ایک دیا سلائی دیوار پر رگڑی ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں اسکی بوڑھی دادی صاف صاف بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چہرہ نور سے چمک رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اس پر ملائمت اور پیار کے آثار نظر آتے تھے۔ لڑکی چلا کر کہنے لگی" دادی اماں مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں جانتی ہوں کہ جب دیا سلائی بجھ جائے گی۔ تو تم بھی چلی جاؤ گی تم گرم انگیٹھی، بھنی ہوئی بطخ اور بڑے شاندار کرسمس کے درخت کی طرح غائب ہو جاؤ گی "

آخر اس نے جلدی سے دیا سلائیوں کا تمام بنڈل جلانا شروع کیا اور دوپہر کے وقت سے بھی کہیں زیادہ روشنی ہو گئی۔ اس کی دادی اماں کبھی اتنی بڑی اور اتنی خوبصورت معلوم نہیں ہوتی تھی اس نے ننھی لڑکی کو اپنی باہنوں میں لے لیا اور دونوں اڑتی ہوئی زمین سے بہت اوپر ایک چمکیلی اور پُرمسرت فضا میں جا پہنچیں۔ جہاں نہ سردی تھی۔ نہ بھوک اور نہ درد و کرب، وہ اپنے خدا کے پاس تھیں۔

طلوعِ سحر کے وقت غریب لڑکی کی لاش وہیں پڑی تھی۔ اسکے رخسار زرد پڑ گئے تھے۔ چہرے پر ایک تبسّم تھا۔ اور وہ دیوار کے

ساتھ آگے کو جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ آہ وہ پرانے سال کی آخری شام کو سردی سے شل ہو کر مر چکی تھی۔ نئے سال کا سورج نکل کر اس کی ننھی سی لاش پر چمکنے لگا اس کے ایک ہاتھ میں اب بھی دیا سلائیاں پکڑی تھیں۔ بنڈلوں میں سے ایک جل چکا تھا۔ کوئی کہنے لگا۔ "بیچاری اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔" لیکن کسی کے خیال میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ وہ نئے سال کے دن کتنی کتنی خوبصورت چیزیں دیکھنے کے بعد ایک ایسی دنیا کو چلی گئی ہے جہاں شان و شوکت حکمران ہے اور جہاں غربت و افلاس کا کوئی دخل نہیں ؎

ننھے سورج مکھی کا انجام

ننھے سورج مکھی کا انجام

اب سنو! دیہات کے نواحی علاقوں میں سڑک کے کنارے
ایک مکان کھڑا تھا۔ خود تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ سامنے ایک چھوٹا سا باغ
تھا، جسے ایک سبز جنگلے نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ قریب
کی جھاڑیوں کی قطار کے پاس ہی نرم نرم سبز سبز گھاس میں سورج مکھی
کا ایک پودا اُگا۔ سورج اُس پر اسی مہربانی سے چمکنے لگا جس مہربانی سے
باغ کے دوسرے اونچے اونچے اور خوبصورت پودوں پر چمکا کرتا تھا
روز بروز وہ بڑا ہوتا گیا۔ ایک صبح دیکھا گیا کہ وہ اپنی سفید رنگ کی
چمکدار پتیاں کھولے اور اپنا نور آفریں تاج پہنے کھڑا ہے۔ ایسا تاج
جس میں پیلے رنگ کا ایک سورج اپنے گرد سفید روشنی کا ایک ہالہ

ئے جگمگا رہا تھا۔

اُسے رنج نہیں تھا کہ میں لمبی لمبی گھاس میں کیوں نہیں دکھائی دیتا۔ یا یہ کہ میں کیوں اتنا ادنےٰ اور حقیر پھول ہوں۔ نہیں نہیں اس کا دل جذباتِ تشکر سے لبریز رہتا تھا۔ وہ مُڑکر نیم گرم سورج کی طرف یا اوپر آسمان کی سمت دیکھتا رہتا۔ اور ہواؤں میں چنڈول کے گیت غور سے سُنا کرتا۔

ننھا سورج مکھی خوش تھا۔ جیسے آج چھٹی کا دن ہو۔ لیکن ابھی تو پیر ہی تھا۔ تمام بچے سکول میں اپنا اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔ وہ بھی ننھی سی سرسبز ڈالی پر بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرنے لگا۔ خوشگوار دھوپ اور اردگرد کی ہر چیز اسے سبق پڑھاتی تھی۔ خدا کتنا مہربان ہو رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کہ ننھی کوئل ان تمام خیالات کو جو خموشی سے اس کے دل کو گدگداتے رہتے تھے۔ اس قدر صاف آوازمیں گا گا کر ادا کر سکتی ہے۔ سورج مکھی کا پھول نہایت خوشی کے انداز میں سر اُٹھا کر مسرور پرند کی طرف دیکھتا۔ جو گا بھی سکتا تھا اور اُڑ بھی سکتا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر جلتا نہیں تھا۔ کہ مجھ میں

یہ دونوں خصلتیں کیوں موجود نہیں۔ وہ سوچتا۔ "میں کوئل کو دیکھ سکتا ہوں اور اُس کے گیت سُن سکتا ہوں۔ سُورج مجھ پر چمکتا ہے۔ ہوائیں مجھے چُومتی ہیں۔ میں کتنا مسرور ہوں۔ ہر چیز کو میرا کتنا خیال ہے!"

شاندار اور ترش پھولوں کے پودے اکڑ کر کھڑے تھے۔ ان پھولوں میں جتنی کم خوشبو تھی اتنے ہی زیادہ مغرور ہو رہے تھے۔ شقائق النعمان نے اپنے آپ کو یوں پھیلا رکھا تھا۔ جیسے وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ہم گلاب کے پھولوں سے زیادہ بڑے ہیں۔ لیکن چھوٹا بڑا ہونا ہی ہر بات کے کمال کی دلیل نہیں ہوتی۔ لالہ کے پھولوں کا رنگ سب سے زیادہ خوش نما تھا۔ خود وہ بھی اس بات کو خوب جانتے تھے اور اس انداز سے اکڑ کر کھڑے تھے۔ کہ سب کی نظر خود بخود ان پر آ پڑے۔ انھوں نے کبھی باہر ننھے سُورج مکھی پر نظر نہ ڈالی تھی۔ لیکن وہ انھیں دیکھا کرتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا۔ "یہ کتنے شاداب اور حسین ہیں! اتنے حسین اور شاداب کہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت پرند بھی ان سے ملنے سے نہ ہچکچائے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے قریب اُگا ہوں اور ان کے تمام حسن کو دیکھ سکتا ہوں!"

وہ ایسی باتیں سوچ رہا تھا کہ کُواُو۔اُو کرتے ہوئے ایک کوئل نیچے اُتر آئی لیکن وہ شقائق النعمان یا لالوں کے پاس نہیں۔ بلکہ سبز گھاس میں ننھے سُورج مُکھی کے پاس آپہنچی تھی وہ انتہائے خوشی سے کانپ گیا اور اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی۔ کہ وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے ننھا پرند اس کے گرد کُدک کُدک کر گانے لگا۔

"اوہ! یہ گھاس کتنی نرم ہے!

اور دیکھو یہ ننھا سا پھُول۔

کتنا خوش رُو ہے!

اس کا لباس سیمیں ہے!

اور دل زرّیں!"

ننھے سُورج مکھی کی پتیاں واقعی چاندی کی طرح چمکیلی تھیں اور اس کا زرد مرکزی حصہ سونے کی طرح جگمگاتا تھا۔ وہ کس قدر مسرور تھا۔ کبھی کوئی اس کی مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کوئل نے اپنی چونچ سے اس کا ایک بوسہ لیا۔ اور اسے گیت سُنا کر خوشگوار نیلی ہواؤں میں اُڑ گئی۔ پندرہ منٹ سے پہلے وہ ہوش میں نہ آسکا۔ کچھ خوش ہو کر اور کچھ

شرما کر اُس نے باغ کے دوسرے پھولوں پر نظر ڈالی انھوں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ اِس کی کتنی عزت افزائی ہوئی ہے۔ یقیناً انھوں نے اس کی خوشی اور سرور کا دل میں خوب اندازہ کیا ہوگا۔

لیکن لالے کے پھول حسبِ معمول اب بھی تن کر کھڑے تھے ان کے منہ سُرخ ہو رہے تھے۔ کیونکہ انھیں اس وقت سخت غصہ آرہا تھا۔ خیر ہوئی کہ اُن کے منہ میں زبانیں نہ تھیں۔ اگر بول سکتے تو گالی گلوچ سے بیچارے سورج مکھی کی خوب ہی گت بناتے ننھے سورج مکھی نے دیکھ لیا کہ وہ آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ سخت مغموم ہوا۔ اُسی وقت ایک نوکرانی ہاتھ میں ایک چمکدار تیز چاقو لئے باغ میں آئی اور یکے بعد دیگرے اس نے لالے کے سب پھولوں کو کاٹ لیا۔

"اوہ! سورج مکھی نے آہ بھر کر کہا۔ کتنا خوفناک نظارہ تھا۔ اب ان بیچاروں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوا۔"

لڑکی انھیں لے کر گھر چلی گئی اور سُورج مکھی کی جان میں جان آئی اس نے شکر کیا کہ وہ گھاس میں اُگا ہوا ایک حقیر سا خودرَو پھول تھا نہیں تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا جب سُورج غروب ہوگیا۔ وہ اپنی

پتیاں بند کر کے تمام رات روشنی اور تاریکی کے خواب دیکھنے کے لئے سوگیا۔

دوسرے دن جب مسرور پھول نے روشنی اور ہوا میں اپنی سفید سفید پنکھڑیاں بازوؤں کی طرح پھیلائیں۔ اسے کوئل کی آواز سنائی دی۔ لیکن اب اس آواز کا لہجہ نہایت مغموم تھا۔ بجائے پرند کو۔ بجا رنج ہو رہا تھا۔ اسے قیدی بنالیا گیا تھا۔ اور کھڑکی کے قریب ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اسے اپنی آزاد اور پُرمسرت سیروں کا زمانہ یاد آرہا تھا کھیت میں اُگے ہوئے غلّے کے نوجوان پودوں کی یاد اور سورج کا خیر مقدم کرنے کے لئے صاف ہواؤں میں اس کی بلند پرواز کا نقشہ اس کی آنکھوں میں تھا۔ اور وہ انہی سب باتوں کے گیت گا رہی تھی۔ وہ ایک قیدی کی طرح مغموم اور حیران ہو کر پنجرے میں کھڑی تھی۔

ننھا سورج مکھی اس کی مدد کرنے کے لئے مضطرب ہونے لگا۔ لیکن وہ کیسے اس کی مدد کر سکتا تھا۔ اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے گرد کی تمام چیزوں سے خوشگوار دھوپ اور اپنی پتیوں کے سفید حسن کو بھول گیا۔ اب اگر اُسے کسی کا خیال تھا تو صرف اُس

مجبوس کوئل کا جس کی مدد وہ نہیں کرسکتا تھا۔

اسی وقت دو چھوٹے چھوٹے لڑکے کہیں باغ میں آنکلے۔ ایک کے ہاتھ میں ایک تیز چاقو تھا۔ اسی طرح کا جس سے نوکرانی نے لالے کے پھولوں کو قتل کیا تھا۔ وہ سیدھے سورج مکھی کے پاس آٹھہرے۔ جو خیال ہی نہ کرسکا کہ انھیں کیا درکار ہے۔

ایک بولا کوئل اسے خوب پسند کرے گی اور چاقو سے سورج مکھی کے پودے کے گرداگرد اس زمین کا ایک چوکور ٹکڑا تراشا اور اس سمیت پودے کو اکھاڑ لیا۔

دوسرا لڑکا کہنے لگا "سورج مکھی کے پودے کو بیچ میں سے کھینچ لو"
سورج مکھی کانپنے لگا۔ کیونکہ اس کے لئے یہ بات موت کا پیغام تھی وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اور مٹی کے اس ڈھیلے سمیت کوئل کے پنجرے میں پہنچنا چاہتا تھا۔

کوئل اپنی کھوئی ہوئی آزادی کا نہایت المناک آواز میں ماتم کرنے لگی۔ اور یوں پھڑپھڑائی کہ اس کے پر پنجرے کی دیواروں کو ٹکرانے لگے۔ ننھا سورج مکھی ان سے کوئی بات نہ کرسکا۔ حالانکہ اس کی سب سے

بڑی خواہش یہی تھی کہ اُسے تسلّی کے دو ایک لفظ کہے۔ اسی طرح صبح گذر گئی۔

کوئل پکار کر کہنے لگی۔ پانی　پانی ...... یہاں کہیں پانی نہیں ؟ سب لوگ باہر چلے گئے ہیں۔ میرے کھانے یا پینے کے لئے کچھ چھوڑ جانا بھول گئے　میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ آگ کی طرح جل رہا ہے۔ مجھے کوئی چیز آگ یا برف کی طرح محسوس ہو رہی ہے۔ ہوا کتنی بوجل ہے۔ آہ! کیا میں مر جاؤں گی۔ خوشگوار دھوپ۔ شاداب گھاس اور خدا کی بنائی ہوئی تمام خوبصورت چیزوں کو پیچھے چھوڑ جاؤں گی"؟

اس نے اپنی پیاس کو ہلکا کرنے کے لئے چونچ مٹی کے پُرنم ڈھیلے میں گاڑ دی۔ اتنے میں اُس کی نظر سورج مکھی کے پھول پر جا پڑی اُس نے اسے دیکھ سر کو جنبش دی۔ اور اُسے ایک بوسہ دے کر کہنے لگی"۔ سو تم بھی یہاں مر جانے اور مُرجھانے کے لئے لائے گئے ہو۔ غریب پودے! باہر کی میری تمام دنیا کے عوض وہ لوگ مجھے وہ چیزیں دے گئے ہیں۔ ایک تم! اور دوسرے مٹی کا یہ ڈھیلا اس گھاس کی ایک ایک پتی میرے لئے ایک درخت ہے۔ اور تمھاری ایک ایک پتی

ایک خوشبودار پھول! آہ تمھیں دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے۔ کہ میں نے کیا کیا کچھ کھو دیا ہے۔

ننھا سورج مکھی سوچنے لگا۔ "کاش کسی طرح میں اسے تسلی ہی دے سکتا۔" وہ بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی پتیوں سے اسقدر خوشبو آرہی تھی جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ کوئل نے بھی یہ بات محسوس کرلی۔ اور اگرچہ وہ پیاس کی شدت سے بے حال ہوکر گھاس کی پتیوں کو چونچ سے توڑ رہی تھی۔ لیکن سورج مکھی کے پھول کو مجال ہے اس نے چھوا بھی۔

شام ہونے لگی۔ بیچاری کوئل کو پانی دینے کے لئے کوئی نہ آیا۔ اس نے اپنے خوبصورت بازو پھیلائے اور انتہائے درد سے پھڑپھڑانے لگی اس کے گیت پر مردنی چھاگئی۔ یہاں تک کہ اس کے سہانے گیت کی بجائے اس کی چونچ سے ایک نہایت ہی نحیف وناتواں آواز نکلنے لگی پھول کے سائے تلے اس کا ننھا سا سر نیچے ہوگیا۔ غم اور پیاس کی شدت سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور روح پرواز کرگئی۔

سورج مکھی گذشتہ شب کی طرح آج اپنی پتیاں بند کرکے سو نہ سکا۔

وہ نہایت اُداس ہو کر نیچے کی طرف جُھک گیا۔

لڑکے دوسری صبح ادھر آ نکلے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کوئل مر چکی ہے۔ وہ زور زور سے رونے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک چھوٹی سی صاف سُتھری قبر تیار کی۔ اس پر پھولوں کا ایک فرش بچھایا اور اس کی لاش ایک چھوٹے سے سُرخ صندوق میں بند کر کے دفنا دی گئی۔ جیسے وہ کوئی شہزادی تھی! جب وہ زندہ تھی انھوں نے اسے بھلا دیا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ مر چکی تھی۔ انھوں نے اس پر پھول بکھیرے اور اس کے لئے کئی آنسو بہائے۔

لیکن مٹی کے اس ڈھیلے کو سورج مکھی کے پھول سمیت گرد آلود سڑک پر پھینک دیا گیا۔ کسی نے اس غریب پھول پر توجہ تک نہ دی۔ جسے ننھی کوئل کی موت کا اس قدر غم ہوا تھا۔ اور جس نے کوئل کو تسلی دینے کی اس قدر کوشش کی تھی۔
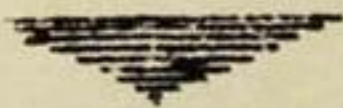
کالر

کالر

ایک آدمی تھا۔ شوقین مزاج۔ اور چیزیں تو خیر ایک طرف رہیں اس کے پاس ایک بوٹ اور ایک سُرخ نگینے والی انگوٹھی بھی تھی اور قمیص کا ایک کالر بھی —— دُنیا کا بہترین کالر۔ اور اسی کالر کے متعلق ہم ابھی ابھی ایک کہانی سُناتے ہیں۔

کالر اتنا معمر ہو گیا کہ اب اسے اپنی شادی کی فکر ستانے لگی اور ایک دن تو عجیب بات ہوئی۔ کالر نے دیکھا کہ وہ اور ایک ریشمی جراب ...... دونوں ایک ہی کپڑے دھونے کی ناند میں بالکل ایک دوسرے کے قریب پڑے ہیں۔ کالر کہنے لگا۔" سچ پوچھو تو میں نے آج تک کبھی کوئی چیز اتنی پتلی اتنی نازک اتنی صاف اور اتنی

نرم نہیں دیکھی۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ لوں ؟"

جراب کہنے لگی۔ "میں تمھیں نہیں بتاؤں گی۔"

کالر کہنے لگا۔ "جب تم گھر پہ نہ ہوتی ہو تو کہاں رہتی ہو ؟"

لیکن قدرتاً جراب شرمیلی واقع ہوئی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اس سوال کا جواب کس طرح دیا جائے۔

کالر کہنے لگا۔ "میری ننھی خاتون میں دیکھتا ہوں کہ تم بڑے کام کی ہو۔ سچ بھی خوب جاتی ہو!"

جراب کہنے لگی۔ "تم مجھ سے نہ بولو! میں نہیں جانتی کہ میں نے کب تمھیں ایسی باتیں کہنے کی جرأت دی ہے۔"

کالر کہنے لگا۔ "اوہ جب کوئی اتنا خوبصورت ہو جتنی تم ہو تو کیا خوبصورتی ہی جرأت دلانے کے لئے کافی نہیں ؟"

جراب کہنے لگی۔ "پرے ہٹو۔ میرے اتنے قریب نہ آؤ۔ تم مجھے بالکل کوئی مرد معلوم ہو رہے ہو۔"

کالر کہنے لگا۔ "ہاں میں سچ مچ ہی ایک شوقین اور معزز مرد ہوں میرے پاس ایک بوٹ جیک اور ایک سُرخ منہ والی انگوٹھی بھی ہے

لیکن یہ بات سچ نہیں تھی کیونکہ یہ چیزیں کالر کے آقا کی تھیں اور وہ محض شیخی بگھار رہا تھا۔

جراب دوبارہ بولی۔ "ایک دفعہ جو کہا ہے کہ میرے اس قدر قریب نہ آؤ۔ میں ایسی باتوں کی عادی نہیں!"

کالر بول اُٹھا۔ "رحم! رحم!"

اس کے بعد انھیں ناند سے نکالا گیا۔ کلف دی گئی اور دھوپ میں ایک کرسی پر ڈال دیا گیا۔ پھر انھیں استری کرنے کے تختے پر رکھا گیا اور ادھر استری بھی آگ بھبھوکا بنی آ گئی

کالر پکار اٹھا۔ "بیوہ خاتون! چھوٹی بیوہ! مَیں گرم ہوا جا رہا ہوں مَیں بدل رہا ہوں۔ میری شکنیں دُور ہو رہی ہیں۔ اُف تمھاری جلن میرے جگر میں سوراخ کر ڈالے گی۔ [کانپ کر] ہائے! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں!"

چپٹی استری کالر پر دوڑ لگا کر نہایت غرور سے کہنے لگی۔ "چل بے پرانے چیتھڑے!"...... کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک سٹیم انجن سمجھتی تھی جو لائن پر دوڑتا ہے اور گاڑیاں کھینچتا ہے۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد استری بولی۔ "چپ رہ، بے چلیتھڑے!"

کالر کے کنارے سے پھٹ کر کچھ دھاگے باہر نکل آئے تھے انھیں کاٹ کر یکساں کرنے کے لئے قینچی کو بلایا گیا۔

کالر پکار اٹھا۔ "اف تم کتنی بلند پایہ رقاصہ بن سکتی ہو۔ کتنی اچھی طرح اپنا پاؤں پرے سے جاتی ہو۔ میں نے کبھی کوئی اتنا حسین منظر نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی عورت بھی ایسا نہیں کر سکتی۔"

قینچی کہنے لگی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

کالر کہنے لگا۔ "تمھیں تو کوئی کاؤنٹس ہونا چاہیئے۔ خیر جو جو سامان کسی معزز آدمی کے پاس ہونا چاہیئے۔ وہ تو میرے پاس موجود ہے — ایک بوٹ جیک اور ایک انگوٹھی۔ میری آرزو ہے کہ تمھارے لئے میرے پاس زمین بھی ہو۔"

"ہیں؟ یہ مجھے کیا کہہ رہا ہے!" یہ کہہ کر غصے سے قینچی نے کالر کو اس تیزی سے کاٹ کھایا کہ وہ ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا۔ اور اسے بے کار شے ہی سمجھ کر پرے پھینک دیا گیا۔

کالر نے دل میں سوچا کہ اب یہ معاملہ انگوٹھی کے سامنے پیش کرنا

پڑے گا۔ چنانچہ ایک دن وہ سُرخ نگینے والی انگوٹھی سے کہنے لگا۔"
میری ننھی خاتون! تمہارا منہ پھُول سے بھی زیادہ سُرخ اور حسین ہے
کیا تمہارے دل میں کبھی منگنی کا خیال نہیں آیا؟"
"تمہیں معلوم ہو کہ مجھے منگنی کا خیال ہے! خیال کیوں نہیں! میں
ایک انگوٹھے سے منسوب ہو چکی ہوں۔"
کالر چلّا اُٹھا" ہیں؟ تمہاری منگنی؟....... آہ! اب تو کوئی بھی
نہیں رہا۔"
اس کے بعد اس نے نہایت فریب سے اپنی محبت کو چھپا
لیا۔
عرصہ گزر گیا۔ کالر ایک تھیلے میں بند ہو کر کاغذ بنانے کے کارخانے
میں لایا گیا۔ یہاں چیتھڑوں کی ایک بھاری جماعت اکٹھی ہو رہی تھی
اچھے اچھے چیتھڑے بُرے بُرے چیتھڑوں سے پرے ہٹ کر
بیٹھے تھے جیسا کہ قدرتاً ہونا چاہیئے۔ وہ سب کے سب بڑے باتونی
تھے۔ خصوصاً کالر تو بے حد شیخی باز تھا۔ کہنے لگا" بہت عورتوں سے محبت
کر چکا ہوں۔ کوئی چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ سچ ہے میں بڑا حسین اُد

متکبر آدمی تھا۔ میرے پاس ایک بوٹ جیک اور ایک انگوٹھی تھی جسے
مَیں نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ تم کبھی مجھے اُس وقت دیکھتے نا
جب مَیں بنایا گیا تھا۔ مجھے اپنی پہلی محبوبہ کبھی نہیں بھولے گی ـــــ وہ
ایک جراب تھی۔ اتنی پیاری اتنی عمدہ اتنی نرم! اس نے میرے
لئے اپنے آپ کو ایک ناند ہی میں گرا لیا تھا ایک بیوہ بھی تھی جو نہایت
گرم جوشی سے مجھ سے محبت کرتی تھی۔ لیکن میں نے اسے تنہا چھوڑ
دیا اور وہ غم سے سیاہ پڑ گئی۔ ایک بلند پایہ رقاصہ بھی تھی۔ اس نے تو
میرا رخسار ہی زخمی کر دیا ـــــ وہ اس قدر جذبات سے بھری تھی
ایک سُرخ گالوں والی دوشیزہ بھی مجھ پر مرتی تھی۔ مَیں نے التفات نہ
کیا اور اس کے سُرخ سُرخ رخسار غم سے کملا گئے۔ مجھے ایسے
کئی تجربات حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ غم مجھے جراب کا
ہے جو میرے لئے ناند میں کود پڑی تھی۔ میرے ضمیر میں بہت کچھ موجود
ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں سفید کاغذ بن جاؤں
اور کالر سے یہی کچھ ہوا۔ تمام چیتھڑوں کا سفید کاغذ بن گا اور کالر یہی
کاغذ کا ٹکڑا بن گیا۔ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اور جس پر یہ کہانی

لکھی ہے۔ یہ اسے سزا ملی ہے کہ اس نے کیوں شیخی بگھار کر ایسی باتیں کہیں جو سچ نہیں تھیں۔

ہمارے لئے یہ ایک تنبیہ ہے ہمیں چاہیئے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہوں اس کے متعلق سوچیں کہ کیا وہ صحیح ہے۔ کیونکہ وہ وقت آن سکتا ہے۔ جب ہمیں بھی سفید کاغذ بنانے کے لئے چیتھڑوں کے تھیلے میں ڈال دیا جائیگا۔ اور پھر اسی کاغذ پر ہماری سب کہانی لکھ دی جائے گی — کہانی کیا پوشیدہ سے پوشیدہ راز تک لکھ دے جائیں گے۔ اور یہ کوئی اتنی خوشگوار بات نہ ہوگی کہ ہم کاغذ کے ٹکڑے بن کر شیخی باز کالر کی طرح تمام دنیا میں گھومتے ہوئے ہر وہ بات جو ہم نے کی ہے ظاہر کرتے پھریں۔

محبّت

محبّت

ایک صندوق میں ایک لٹّو ایک چھوٹی سی گیند اور کچھ دوسرے کھلونے پڑے تھے۔ لٹّو گیند سے پوچھنے لگا۔ "گیند! گیند! کیا ہماری شادی ہو گی؟ اگر نہیں تو ہم کیوں اکٹھے ایک ہی صندوق میں رہتے ہیں؟" لیکن گیند نے لٹّو کی بات کا جواب تک دینے کی زحمت نہ اٹھائی کیونکہ وہ مراکو کے نفیس چمڑے کا لباس پہنے ہوئے تھی! ور ایک نوجوان دوشیزہ کی طرح اسے اپنے حُسن پر بہت غرور تھا۔

دوسرے دن ننھا لڑکا اپنے کھلونوں کے پاس آیا۔ اس نے لٹّو پر سُرخ اور زرد رنگ پھیر کر اُسے رنگین بنا دیا۔ اور اس کے مرکز

میں ایک پیتل کی ایک کیل لگادی اور اب لٹّو جب اس کے اِدِ گرد گھومتا تو عجیب شاندار معلوم ہوتا۔

لٹّو پھر گیند سے کہنے لگا۔" اب ذرا میری طرف دیکھو! اب تمہارا کیا خیال ہے اب تو ہماری نسبت ہوجائے نا؟ یہ رشتہ بہت موزوں رہے گا۔ تم اچھلتی ہو اور میں ناچتا ہوں۔ پھر ہم سے زیادہ خوش اور کون رہے گا۔

گیند کہنے لگی " ہیں! تم کن خیالوں میں ہو؟ شائد تم نہیں جانتے کہ میرے ماں باپ مراکو کے تھے اور میرا جسم سپین کے کارک کا بنا ہے"

" ہاں لیکن۔ مجھے بھی تو مہاگنی ہی کی لکڑی لگی ہے۔ خود کو توال نے مجھے تراشا تھا۔ اس کے پاس ایک اپنا خراد ہے جو اس کے لئے بہت بڑی تفریح کا سامان ہے۔

" گیند کہنے لگی۔ میں ان باتوں پر کیسے اعتبار کر دوں؟"

لٹّو نے جواب دیا۔" اگر میں تمہارے سامنے سچ نہیں بول رہا تھا تو خدا کرے مجھ سے ہمیشہ کے لئے میری گردش چھن جائے۔"

ہاں اپنے منہ میاں مٹھو بننا تو تمہیں خوب آتا ہے لیکن میں تمہاری

درخواست قبول نہیں کر سکتی۔ بات یہ ہے کہ ابابیل کے لڑکے سے میری آدھی نسبت ہو چکی ہے۔ میں جب بھی اچھل کر اوپر ہوا میں جاتی ہوں تو وہ اپنا سر گھونسلے سے نکال کر کہتا ہے۔ کرو گی؟" اور میں نے کئی دفعہ خموشی میں آپ ہی آپ کہا "ہاں"۔ اب تمہیں بتاؤ کہ ہماری آدھی نسبت اس طرح نہیں ہو گئی؟ لیکن میں تم سے بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی نہیں بھلادوں گی۔

اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی اور بات نہ کہی۔

دوسرے دن گیند کو لٹو کا نکال لے گیا۔ لٹو نے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک پرند کی طرح ہوا میں اوپر تک منظروں سے بھی پرے چلی جاتی ہے۔ اور ہر بار جب واپس آکر زمین کو چھوتی ہے تو اچھل کر پہلے سے بھی زیادہ دور تک چلی جاتی ہے یا تو وہ خود ہی ہوا میں اڑنا چاہتی تھی اور یا شاید اس لئے کہ اس کا جسم ہی سپین کے کاک کا تھا۔ نویں دفعہ جب یہ ہوا میں اڑی تو وہیں کی ہو رہی اور پھر واپس نہ آئی۔ لڑکے نے اس کی تلاش میں کونا کونا چھان مارا لیکن بے سود۔ وہ ملتی کس طرح وہ تو کہیں

چلی گئی تھی۔

لٹو کہنے لگا۔ "آہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ کہاں گئی ہے وہ ابابیل کے گھونسلے میں ہے۔ اس نے ابابیل کے لڑکے سے شادی کر لی ہے"

لٹو جتنا زیادہ اس کے متعلق سوچتا اس کی بے تابی اور بڑھتی چلی جاتی۔ اب اس کی محبت لاانتہا ہو چکی تھی۔ کیونکہ وہ اسے حاصل نہ کر سکا تھا۔ اور غضب یہ کہ وہ ایک دوسرے کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ لٹو سے یہ کسی طرح برداشت نہ ہوتا تھا۔ لٹو اب بھی اُسی طرح گردش کیا کرتا اور اس سے بھنبھناہٹ پیدا ہوا کرتی۔ لیکن اس نے گیند کا خیال کبھی نہ چھوڑا۔ جوں جوں وہ اس کا تصور کرتا اس کی شکل پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بن کر اس کے سامنے آجاتی۔

آخر اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ لٹو کی محبت بہت پرانی ہو چکی تھی وہ خود بھی اب جوان نہیں رہا تھا۔ لیکن ایک دن ایسا آیا جب وہ پہلے سب دنوں سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگا۔ اب اس پر ملمع کر دیا گیا تھا اور وہ ایک سنہری لٹو بن گیا تھا۔ اب وہ اِدھر اُدھر ناچکر اس طرح گھوما کرتا کہ اس سے زوں، زوں کی نہایت بلند آواز نکلنے

لگتی۔ اب وہ ایک دیکھنے کی چیز بن گیا تھا۔ لیکن ایک دن گھومتے وقت وہ بھی بہت اُچھلا اور کہیں غائب ہوگیا۔ انھوں نے ہر جگہ یہاں تک کہ تہ خانے میں بھی اس کی تلاش کرڈالی۔ لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ وہ تھا کہاں؟ وہ تو ایک نابدان میں جا گرا تھا جہاں ہر قسم کا ملبہ پڑا تھا کہیں گوبھی کے ڈنٹھل کہیں کیچڑ کہیں بارش کا پانی جو اوپر کے پرنالے سے گرا تھا۔

لٹو کہنے لگا "اب مجھے ذرا عمدہ جگہ ملی ہے یہاں میری صیقل بھی دُھل جائے گی۔ کیسی پُررونق جگہ ہے!" تھوڑی ہی دیر بعد اس کی نظر ایک عجیب و غریب گول سی چیز پر پڑی جو ایک باسی سیب کی ہم شکل تھی اور ایک لمبے سے گوبھی کے ڈنٹھل کے قریب پڑی تھی لیکن دراصل یہ سیب نہیں تھا بلکہ ایک پرانی گیند تھی جو کئی سال سے پرنالے میں اٹکی پڑی تھی اور جس کے ذرّے ذرّے میں پانی کی نمی سرایت کرچکی تھی۔

گیند ملمع کئے ہوئے لٹو کو دیکھ کر کہنے لگی "شکر ہے کہ میرے طبقے کا بھی کوئی فرد یہاں آپہنچا۔ جس سے میں باتیں کرسکوں گی۔ میں مراکو کی ہوں مجھے ایک نوجوان خاتون نے سیا تھا اور میرا جسم سپین کے کارک کا ہے

لیکن اب تو میری طرف کوئی دیکھنا بھی پسند نہ کرے گا۔ ایک دفعہ تو میں ابابیل کے لڑکے سے بھی منسوب ہو چکی ہوں لیکن میں پرنالے میں اُلگری اور پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ یہاں پڑی رہی۔ میرے تمام جسم میں پانی سرایت کر چکا ہے۔ یقین مانا ایک دوشیزہ کے لئے یہ ایک بہت لمبی مدّت تھی۔"

لٹو خاموش رہا اور اپنی پرانی محبّت کو یاد کرنے لگا اور جوں جوں گیند اور باتیں کرتی اُسے یاد آتا جاتا کہ یہ وہی گیند ہے۔

اسکے بعد نوکر نابدان صاف کرنے کہیں اِدھر آنکلا۔

کہنے لگا "آہا! وہ ملمع کیا ہوا لٹو!" اب لٹو کو پھر عزت اور توجہ حاصل ہو گئی لیکن ننھی گیند کے متعلق کبھی کچھ اور نہ سنا گیا۔ لٹو اپنی پرانی محبت کے متعلق ایک لفظ تک زبان پر نہ لایا کیونکہ وہ تو فوراً مردہ ہو گئی تھی۔ آہ جب کوئی چیز محبوب سے جدا ہو کر پانچ سال تک پرنالے میں پڑی رہے اور اس کے جسم میں نمی سرایت کر جائے تو پھر کوئی نابدان میں پڑ کر بھی اس سے تجدید محبت کا خیال تک دل میں نہیں لاتا۔

چاند کا گناہ

چاند کا گناہ

خوب ہوا جو اس مشہور جنگ کے بعد اس پادری کا نام میر یگنیان پڑ گیا پادری میر یگنیان ایک دراز قد دبلا پتلا اور جوشیلا آدمی تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت سے ایک خاص شان ٹپکتی تھی۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس نے کبھی کسی سے بے انصافی نہ کی تھی۔ خدا اور مذہب کے متعلق اس کے تمام اعتقادات "قطعی" تھے۔ ان میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اسے سچے دل سے یقین تھا کہ میں خدا کی مشیئت اور اس کی حکمتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔

جب وہ اپنے دیہاتی دفتر کے چھوٹے سے باغ کی پگڈنڈی پر سیر گشت کیا کرتا۔ اس کے دل میں اکثر یہ سوال اٹھتا۔ کہ "خدا نے فلاں بات آخر کیوں کی ہے؟" پھر دل ہی دل میں خدا کا تصور باندھے ہوئے دیر تک اس سوال کا جواب سوچتا رہتا۔ یہاں تک کہ اپنے ہی دل سے اسے اپنے سوال کا تسلی بخش جواب مل جاتا وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا۔ جنہیں نیکی اور عجز۔ کا احساس سیلاب کے تنکے کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ اور جو یہ فقرہ دہرانے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں۔ "خدایا تیری حکمت کے راز انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ہماری کیا اوقات جو انہیں

سمجھ سکیں"۔

اس قسم کی باتوں کے متعلق میرگنیان کچھ کہتا تو صرف یہ کہ میں خدا کا ایک بندہ ہوں۔ مجھے آقا کے ہر فعل کی وجہ معلوم ہونی چاہیئے۔ اور جو بات میری سمجھ میں نہ آئے مجھے سوچ بچار سے کام لے کر آخر کسی طرح سمجھ لینی چاہیئے"۔

وہ محسوس کیا کرتا کہ کائنات کی ایک ایک چیز کسی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی گئی ہے۔ اور جو چیز خدا نے بنائی ہے اس کے بنانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ "کیوں"؟ "اور کس لئے" ان دونوں سوالوں کے جواب کا پلڑا ہمیشہ متوازن ہو جایا کرتا تھا۔ صبح اس لئے ہی تھی کہ جب ہم بیدار ہوں۔ اسکی دلکشی سے لطف اٹھا سکیں۔ دن اس لئے بنا تھا کہ فصلیں پکیں۔ بارشوں کی غرض یہ تھی۔ کہ کھیتوں کو سیراب کریں۔ مثالیں راتوں کا پیش خیمہ تھیں۔ سونے کے لئے رات کی تاریکی ناگزیر تھی۔ اور چار دن موسم کاشتکاری کی تمام ضروریات کا پورا پورا حل تھے اس کے دل میں بھلا کیوں شک پیدا ہوتا کہ قدرت کے کام بلا ارادہ انجام پا رہے ہیں۔ اور موجودات کی ہر چیز مختلف وقتوں مختلف موسموں اور مادے کی مختلف خصوصیتوں کے اٹل اقتضا سے مجبور ہو کر خود بخود اپنے وظائفِ طبعی ادا کر رہی ہے۔

البتہ ایک بات بڑی عجیب تھی۔ وہ یہ کہ اس پادری کو عورتوں سے نفرت تھی۔ ایک غیر محسوس نفرت ایک فطری نفرت ــــــــــ نہ جانے کیوں وہ اکثر لبسوع کے یہ الفاظ دہرایا کرتا "عورت! مجھے تجھ سے کیا کام؟" اس کے بعد کہتا "سچ تو یہ ہے کہ خود خدا بھی اپنے ہاتھوں یہ مخلوق بنا کر کچھ پچھتایا ہی ہوگا۔" کسی شاعر کے قول کے مطابق عورت اس کے لئے "بارہ گُنا غلیظ بچہ" تھی اس کمینی نے دُنیا کے سب سے پہلے مرد کو اپنے جال میں پھنسایا تھا۔ اور اب تک اپنے جہنمی کاموں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی۔ اُس کے لئے یہ ایک پریشان کُن کمزور لیکن خطرناک مخلوق تھی۔ اور اسے اس کے فانی جسم سے کہیں زیادہ اسکی لطیف روح سے نفرت تھی وہ اکثر اپنے دل میں عورتوں کے احساسات کی لطافت محسوس کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میں "ناقابل تسخیر" ہوں۔ پھر بھی وہ محبت کرنے کی اس خواہش کا تصوّر کرکے، جو لوگوں کے دلوں میں پیہم خلش پیدا کرتی رہتی ہے، آتش زیر پا ہو جاتا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا نے عورت کو مرد کی آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور مرد کو احتیاطی تدابیر اختیار کئے بغیر اس کے قریب نہیں جانا چاہیئے۔ مرد کو عورت سے اتنا ہی خوفزدہ رہنا چاہیئے جتنا کمین گاہ میں چھپے ہوئے دشمن سے۔ اس کے لئے عورت ایک ایسی بلا ہے

جو ہر وقت مرد کی طرف بازو پھیلائے اور منہ کھولے کھڑی رہتی ہے ۔اس کا جال مرد کے لئے ہر وقت بچھا رہتا ہے ۔

راہبہ عورتوں کے وجود کو پھر بھی برداشت کر سکتا تھا ۔کیونکہ مقدس قسمیں کھا لینے کے بعد ان کا وجود مرد کے لئے بے ضرر ہو جاتا ہے ۔بایں ہمہ وہ ان سے بھی ذرا زیادہ سختی ہی سے پیش آیا کرتا کیوں کہ ان کے افسردہ و مردہ دلوں کی تہ میں اب بھی اسے ایک غیر فانی لطیف احساس جھلکیاں دکھاتا ہوا محسوس ہوتا اور ہر وقت یہی احساس ، باوجودیکہ وہ پادری تھا ۔ان کے دلوں سے اُس کے دل میں منتقل ہوتا رہتا اسے محسوس ہوتا کہ راہبہ عورتوں کی حلیمانہ نظروں میں تقدیس جو لطیف انبساط پیدا کر رہی ہے ۔وہ راہب مردوں کی آنکھوں کے انبساط سے کہیں زیادہ ہے ۔اسے محسوس ہوتا کہ راہبہ عورتوں کو یسوع ناصری سے جو بے انتہا محبت ہے ۔اس میں ایک ہلکا سا جنسی احساس بھی شامل ہے ۔یہ سوچ سوچ کر اسے سخت غصہ آتا ۔وہ سوچتا کہ بھلا عورت کیوں یسوع سے محبت —— جسمانی محبت کرے ۔اسے ان کے انکسار میں ، ان کی آوازوں کی ملائمت میں ، اور اُس سے جھڑکیاں کھانے کے بعد ان کی تسلیم و رضا کے آنسوؤں میں یہ قابل نفرین احساس صاف صاف نظر آ جاتا ۔جب وہ کانوینٹ سے باہر نکلنے لگتا ۔تو پہلے اپنے

لبادے کے دامن کو زور زور سے جھٹک لیتا اور پھر لپک کر دروازے سے باہر نکل آتا جیسے کسی خطرے سے بچ کر باہر بھاگا ہے۔

اس کی ایک بھانجی بھی تھی۔ جو قریب ہی ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ پادری اسے بھی راہبہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ ایک حسین اور اَلھڑ لڑکی تھی۔ ہر وقت اپنے چلبلے پن سے لوگوں کو تنگ کیا کرتی۔ جب پادری اسے مقدس ورس دینے لگتا تو وہ جواب میں ایک قہقہہ لگا دیتی۔ جب وہ ناراض ہو جاتا تو یکایک نہایت گرمجوشی سے اس کے بوسے لینے لگتی اور اسے سینے سے لگا لیتی۔ وہ بلا خواہش اپنے آپ کو اس کی آغوش سے چھڑانے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ اسے اس وقت ایک شیریں لذت بھی محسوس ہوتی اور اس کے دل میں ایک ایسی خوابیدہ سُنسنی بیدار ہو جاتی جو ہر معمّر آدمی کے دل میں بطور ایک باپ کے موجود ہوتی ہے۔

کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں سیر کرتے ہوئے اکثر ہی وہ اسے خدا کی ــــ اپنے خدا کی باتیں سنایا کرتا۔ لیکن وہ شاذ ہی ایسی باتیں سنتی۔ پادری کی باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی، بجائے وہ وفورِ مسرّت سے آسمان، گھاس اور پھولوں کی طرف دیکھنے لگتی اور اس کی آنکھوں میں مسرّت اور شوخی چمکتی ہوئی نظر آ جاتی۔ کبھی

وہ دور سے کسی تتلی کو پکڑ لاتی اور اسے پادری کے پاس لا کر کہتی "دیکھو چچا یہ کتنی خوبصورت ہے۔ میں اسے چوم ہی لوں گی"۔ اور تتلیوں یا سفید پھولوں کی کیاریوں کو "چومنے" کی یہ خواہش پادری کو سٹپٹا دیتی۔ اسے ایک الجھن سی لگ جاتی اور اس کی روح بے تاب ہو جاتی۔ اسے اس خواہش میں وہ نابکار لطیفِ احساس نظر آ جاتا جو ہمیشہ عورتوں کے دلوں میں جنم لیا کرتا ہے۔

ایک دن گرجے کے داروغے کی بیوی نے جو اس کے گھر کی منتظم تھی نہایت رازداری سے اسے بتایا کہ خود اس کی بھتیجی ــــ کا بھی ایک عاشق ہے۔

یہ سن کر پادری کے دل میں جوشِ غضب کی ایک وحشتناک لہر دوڑ گئی اس وقت وہ شیو بنا رہا تھا۔ اور صابن کا جھاگ ابھی اس کے منہ ہی پر تھا تھوڑی دیر بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

جب وہ کچھ سوچنے اور دوبارہ بولنے کے قابل ہوا تو چلا اٹھا "تم غلط کہتی ہو میلنی! تم جھوٹ کہہ رہی ہو!"

دیہاتی عورت نے اپنا ہاتھ دل پر رکھ لیا۔ اور کہنے لگی "موسیو لی کیورے! اگر میں جھوٹ کہہ رہی ہوں تو مجھے میرا خدا سمجھے۔ لیکن میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ کہ جب آپ کی بہن سو جاتی ہیں تو وہ اٹھ کر اپنے عاشق سے ملنے چلی جاتی ہیں وہ دریا

پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ کوئی مشکل بات تو ہے نہیں۔ دس اور بارہ بجے شب کے درمیان وہاں چلے جایئے۔ اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھئے؟

پادری نے اپنی ٹھوڑی کو ملنا چھوڑ دیا۔ اور کمرے میں اِدھر اُدھر تیز تیز چکر لگانے لگا۔ کیونکہ جب اسے کسی اہم مسئلے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ یہی کیا کرتا تھا۔ جب اس نے دوبارہ شیو بنانے کی کوشش کی تو ناک سے لیکر کان تک اس نے تین جگہ سے اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔

غصے اور غضب کی حالت میں اُس نے تمام دن خموشی میں گذار دیا۔ کہ محبت کی لاانتہا قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کی زاہدانہ طبیعت کے جوش میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ ایک باپ ایک استاد اور روحوں کے ایک محافظ کی حیثیت سے اسے ایک بچی نے بے وقوف بنا دیا تھا۔ اُلو بنا دیا تھا۔ اس کے غرور کو اس وقت وہی صدمہ پہنچا جو اُن والدین کو پہنچتا ہے جن کی لڑکی کسی دن یکایک ان پر یہ راز منکشف کرتی ہے کہ اس نے انہیں بتا دیئے بغیر خود ہی اپنے لئے شریک زندگی منتخب کر لیا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے کچھ پڑھنا چاہا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ لمحہ بہ لمحہ اسکی بے تابی بڑھنے لگی۔ جب گھڑیال نے دس بجائے۔ تو اس نے ماہر

جانے کے لئے بلوط کی لکڑی کی رعب دار چھڑی اٹھائی رات کو جب وہ بیمار دل کی عیادت کے لئے جایا کرتا تھا۔ یہ چھڑی ہمیشہ اس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اس نے موٹی چھڑی پر مسکرا کر ایک نگاہ ڈالی۔ اس نے اسے اپنے مضبوط دیہاتی ہاتھ میں زور سے پکڑ رکھا تھا۔ اور نہائت تہدید آمیز انداز سے اسے ہوا میں گھما رہا تھا۔ آخر یکایک اس نے اسے اوپر کو اٹھایا اور دانت پیس کر زور سے ایک کرسی پر دے مارا۔ کرسی کی پشت کے دو ٹکڑے ہو کر زمین پر آ گرے۔

اس کے بعد اس نے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولا۔ دہلیز تک پہنچا تھا کہ چاندنی رات کے دلفریب نظارے کو دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔ اس کے قدم وہیں کے وہیں جم گئے۔ آج تک اس نے چاندنی کو اس قدر دلکش انداز سے کھلے نہیں دیکھا تھا۔

قدرت نے اسے ایک بلند پرواز روح عطا کر رکھی تھی —— ایسی روح جو خواب دیکھنے والے شاعروں۔ یعنی آقایانِ کلیسا کے شایان شان ہے۔ زرد زرد رات کے پر عظمت اور پرسکون حسن نے اس کے دل کو مسحور کر لیا۔ اور اس کا سب جوش یہاں آ کر سرد پڑ گیا۔

اس کے چھوٹے سے باغ کے پژمردہ درخت قطاروں میں کھڑے نرم نرم چاندنی

میں تہا رہے تھے۔ ان کے پتلے پتلے چوبی اعضاء کو چھدرے چھدرے پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کے سائے اپنی قطاروں سے ذرا پرے روش پر پڑ رہے تھے۔ دیوار پر چڑھی ہوئی "ہنی سکل" کی دیو قامت بیل شہد کی سی میٹھی سانسیں لے رہی تھی۔ جن کی خوشبو روشن اور دلکش رات کی فضاؤں میں کسی عطر افشاں سورج کی طرح گھومتی پھرتی تھی۔

باوری لمبی لمبی سانسیں لے کر دیوانہ وار عطر آلود ہوا کے گھونٹ بھرنے لگا۔ اسی طرح جیسے کوئی شرابی شراب کے گھونٹ پیتا ہے۔ خود حیرت و انبساط سے اسکی چال مدہم پڑنے لگی۔ اور اسے اپنی بھابی کا قصہ تقریباً بھول ہی گیا۔

جب کھلی فضا آئی تو وہ اپنی تجویز کا خاکا سوچنے کے لئے پھر ٹھہر گیا۔ اس وقت اسکی روح محبت سے بسی ہوئی تخیلیوں میں ڈوب چکی تھی۔ خاموش رات کا لطیف اور خمار آلود سحر اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ مینڈک ایک ساتھ ملکر ہوا میں اپنے راگ بلند کر رہے تھے۔ دور دراز کی کوئلوں کے جوشیلے گیت سحر فشاں چاندنی کی موہنی میں اضافہ کر رہے تھے ——— ایسے گیت جو دماغ میں خیال نہیں بلکہ خواب آسا مناظر کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ اور دل میں ایک

ایسی ارتعاش آفرین روشنی بن کر داخل ہوتے ہیں۔ جو انساں کو بوسوں کی لذت سے آشنا کر دیتی ہے۔

پادری نے اپنا چلنا جاری رکھا۔ اس کی ہمت نہ جانے کیوں ایسے جواب دے رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یکایک اسکی جرأت مُردہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد بالکل ختم ہو جانے والی ہے۔ اس وقت اس کے دل میں کہیں بیٹھ جانے کی بے پناہ خواہش پیدا ہو گئی تاکہ وہ خدا اور اسکی مخلوق کا نظارہ دیکھ کر غور کرے اور پھر اسکی تعریف کرے۔

نشیبی زمین پر بہتے ہوئے ننھے دریا کے پیچ در پیچ راستوں سے چنار کی ایک لمبی سی قطار بیٹی ہوئی تھی۔ ٹیڑھے ترچھے دریا کو فضا میں لٹکتی نفیس دھند اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھے۔ چاند کی کرنیں اس سفید دھند کے آرپار نکل کر اپنے ننھے جسموں پر ایک سیمیں غازہ ملے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

پادری پھر ٹھہر گیا۔ ایک زبردست اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے جوش نے سے اپنی روح کی گہرائیوں میں غرق کر دیا۔ شک کی ایک نیم اضطراری کیفیت نے اس پر غلبہ پا لیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے دل میں جس قسم کے سوالات پہلے اُٹھا کرتے ہیں۔ اب اسی طرح کا ایک نیا سوال جنم لے رہا ہے۔

اس چاندنی سے کیا مطلب ؟ رات سونے ، مدہوش ہو جانے ، آرام کرنے اور تمام باتوں کو بھول جانے کے لئے ہے۔ اسے دن سے زیادہ سحر طراز کیوں بنایا گیا ہے ؟ اس کا منظر کیوں نمود سحر اور غروب آفتاب سے زیادہ دلکش ہے۔ اور یہ سست اور دلکش ستارہ سورج سے زیادہ موہنا کیوں ہے ؟ یہ کیوں کہہ رہا ہے۔ کہ میں روشنی کے منبع اعظم کی بہت ہی نازک اور نرالی چیزوں کو منور کرنے کے لئے بنایا گیا ہوں۔ یہ سب کے سب نظاروں کو روشن کرنے کے لئے کیوں آسمان پر آیا ہے ؟

اور یہ شیریں گلو کوئلیں دوسری مخلوق کی طرح اس وقت کیوں آرام نہیں لیتیں یہ کیوں وحشت انگیز سایوں کے قریب بیٹھی اپنا پُرالم راگ الاپ رہی ہیں۔ دنیا پہ یہ نصف پردہ کیوں پڑا ہے ؟ یہ دل کی دھڑکنیں ، روح کی جنوں انگیزی اور جسم کے لطیف احساسات آخر کیوں ہیں ؟ دلکشی کا طوفان کیوں برپا ہے ؟ جب کہ مخلوق اسے دیکھتی نہیں بلکہ اپنے اپنے بستر پہ سو رہی ہے۔ یہ شاعرانہ نظارے جو شاعری کی روح کی خوراک ہیں۔ آسمان پہ سے زمین پر کیوں برسائے جا رہے ہیں ؟ پادری کی سمجھ میں کسی طرح یہ باتیں نہ آئیں۔

لیکن اس کے بعد چراگاہ کی زیریں جانب دو سائے جگمگاتی ہوئی دھند میں بھیگے ہوئے درختوں کی محراب دار چھت کے نیچے ایک دوسرے کے پہلو بہ

پہلو چلتے ہوئے نمودار ہوئے۔

مرد کا قد بلند تر تھا۔ اور اس نے اپنا بازو اپنی محبوبہ کی گردن میں حمائل کر رکھا تھا۔ ان کے یکایک نمودار ہونے سے بے جان نظارے میں جان سی پڑ گئی۔ اور نظاروں نے انہیں گویا خدا کی طرف سے خاص انہیں کے لئے بنائے ہوئے کسی تصویر کے چوکھٹے کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔

وہ دونوں ایک معلوم ہو رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پُر سکون اور خاموش رات انہیں کے لئے بنائی گئی ہے۔ وہ پادری کے سوال کا زندہ جواب بن کر —— ایسا جواب جو پادری کے آقا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ اس کے قریب آپہنچے۔"

پادری مضطرب ہو کر وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے انجیل کی کوئی کہانی زندہ ہو کر اس کے سامنے آگئی ہے۔ جیسے وہ روت اور بوئز کو محبت کرتے دیکھ رہا ہے۔ انجیل کے بڑے بڑے نظاروں میں سے آقا کی خواہش کی تکمیل کا ایک مقدس نظارہ کتابِ مقدس میں سے بولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ میں "غزل الغزلات" نغمے بیدار ہونے لگے اسے دلسوز چیخوں کی آواز اور روح کی پکار سنائی دینے لگی۔

آخر وہ اپنے آپ سے کہنے لگا "خدا نے ایسی راتیں شاید اس لئے بنائی ہیں کہ انسان کی محبّت پر حُسنِ فطرت غازہ ملا جائے"۔

اس نے ہم آغوش ہوتے ہوئے عاشق اور محبوبہ کو جو باہوں میں باہیں ڈالے چار ہے تھے وہیں چھوڑا۔ حالانکہ ان میں سے ایک اس کی بھانجی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا میں آقا کی حکم عدولی کروں؟ کیا خدا محبّت کی اجازت نہیں دیتا۔ جب کہ وہ صاف صاف اس نشان سے اپنی اجازت اور رضامندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

وہ شرمندہ اور پشیمان ہو کر گھر لوٹا بالکل اسی طرح جیسے کوئی آدمی اس مندر میں جا داخل ہونے کا اسے کوئی حق نہ ہو۔

الیگزینڈر

ایلگزینڈر

اس دن بھی حسبِ معمول چار بجے کے قریب ایلگزینڈر مار مبلی کے چھوٹے سے مکان کے سامنے تین پہیوں والی "مریض کی گاڑی" لے کر آموجود ہوا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب ہر روز وہ اپنی بیمار اور بوڑھی مالکہ کو چھ بجے تک اس گاڑی میں بٹھا کر سیر کرایا کرتا تھا وہ اس ہلکی سی گاڑی کو بیرنگ پہیوں کے سہارے کسی ایسی موزوں جگہ گھما کر دیتا جہاں اس قوی ہیکل عورت کو تھام کر بہ آسانی اُتارا جا سکے۔ یہ فرض ادا کرنے کے بعد جب وہ اندر جاتا تو فوراً اسے ایک فوجی کی بھاری اور خشم آلود آواز سنائی دیتی ——— اس پر گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ یہ صاحب خانہ جوزف مار مبلی کی آواز ہوتی تھی جو فوج میں سابق کپتان رہ چکا تھا۔

اس وقت دروازوں کے زور سے بند ہونے، کرسیوں کے گرنے اور تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ اس کے بعد خاموشی چھا جاتی۔ چند لمحوں کے بعد ایلگزینڈر میڈم مار مبلی کو بمشکل تمام تھامے ہوئے دروازے میں آموجود ہوتا۔ کیونکہ سیڑھیاں اُترنے

سے بوڑھی خاتون تھک جاتی تھی۔ جب بہت دوڑ دھوپ کے بعد وہ کرسی نما گاڑی میں بیٹھ جاتی تو الیگزینڈر اسے دھکیلتے ہوئے دریا کی طرف لے جاتا۔

وہ ہر روز قصبہ سے اسی طرح گزرا کرتے تھے۔ راستے میں لوگ اس معمر خاتون کے علاوہ اس کے بوڑھے نوکر کو بھی سلام کیا کرتے اور خیریت پوچھتے۔ کیونکہ جہاں لوگوں کے دلوں میں اس عورت کی بے انتہا عزت تھی۔ وہاں لوگ اِس کے نوکر کی مجتہدانہ، سفید ریش کو دیکھ کر اسکا بھی بیحد احترام کرتے تھے۔

جولائی کا تپتا ہوا سورج بازاروں میں بے انتہا شدت سے چمک رہا تھا چھوٹے چھوٹے مکان دھوپ میں تنور بن رہے تھے۔ دیواریں زمین پر سائے گرا رہی تھیں۔ جو دور تک قطار بناتے چلے گئے تھے یہیں فرش پر کچھ کتے بھی سو رہے تھے۔ الیگزینڈر کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ جلد جلد گاڑی درختوں کی اس دو رویہ قطار کی طرف جا رہا تھا۔ جو دریا کی طرف جاتی تھی۔

میڈم مار میلی اپنی سفید چھتری کے نیچے اونگھ رہی تھی۔ اور چھتری کی نوک الیگزینڈر کے بے حس چہرے کے سامنے اِدھر اُدھر ہل جل رہی تھی۔

وہ لیموں کے درختوں کی دو رویہ میں پہنچے۔ یکایک سائے میں آجانے سے خاتون پوری طرح جاگ اُٹھی۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے کہنے لگی "اچھے الیگزینڈر، اتنی تیزی

سے گاڑی نہ چلاؤ! تم تو گرمی میں اپنے آپ کو ہلاک ہی کر ڈالو گے۔"

نرم دل عورت نے انتہائے خود غرضی میں یہ نہ سوچا کہ اب وہ اس لئے آہستہ آہستہ جانا چاہتی ہے۔ کہ اب دھوپ کی بجائے لیموں کے درختوں کا ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ آگیا ہے۔ سڑک کے قریب ہی بید کے درختوں کے جھنڈوں میں دریا بل کھاتا چلا گیا تھا پانی چٹانوں سے ٹکرا کر چھینٹے اڑا رہا تھا۔ بہاؤ کے یکایک پیچ و خم کھا جانے سے فضا میں دھیمے دھیمے سروں کی بارش ہو رہی تھی جو نمناک ہوا کی تازگی میں ملکر روش تک پہنچتی تھی۔

جب میڈم مار مبلی اس ٹھنڈی اور سرسبز جگہ سے کافی لطف اندوز ہو چکی۔ تو کہنے لگی "اب میری طبیعت کو کچھ سکون میسر ہوا ہے۔

الیگزینڈر کہنے لگا "درست ہے بیگم صاحبہ!"

الیگزینڈر کو ان کی ملازمت اختیار کئے پچیس سال گزر چکے تھے۔ پہلے تو وہ کپتان مار مبلی کا اردلی رہا۔ اس کے بعد بھی وہاں سے جانے کو اس کا جی نہ چاہا۔ چنانچہ وہ ایک ادنٰے ملازم کی حیثیت سے وہیں رہ پڑا۔ اب چھ سال سے وہ ہر روز سہ پہر کے وقت اپنی مالکہ کو مریضوں کی گاڑی میں بٹھا کر سڑکوں پر سے گزرتا شہر کے ارد گرد چکر لگاتا نظر آیا کرتا۔

ان قدیم اور وفادارانہ خدمات اور پھر روزمرہ کی رفاقت نے بوڑھی خاتون اور نوکر کے

درمیان، ایک رشتۂ موانست قائم کر دیتا تھا وہ گھر کے تمام معاملات پر اس طرح بحث کیا کرتے گویا وہ ایک ہی رتبے کے دو آدمی ہوں۔ ان کی گفتگو کا اہم موضوع کپتان کی بدمزاجی ہوا کرتا تھا۔ کپتان اپنی ملازمت کے طویل زمانے میں بہت کچھ ترقی کر سکتا تھا لیکن اسکی بدمزاجی اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔

میڈم مارمیلی نے دوبارہ بات شروع کی۔

"ہاں یقیناً" "آج اُٹھتے ہی اس نے کسی منحوس کا منہ دیکھا ہوگا جب سے اس نے فوج کی ملازمت ترک کی ہے۔ وہ کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔"

سر کے اشارے سے الیگزینڈر نے اپنی مالکہ کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اور کہنے لگا بیگم صاحبہ یہ کہیے کہ ہر روز وہ اُٹھتے ہی کسی نہ کسی منحوس کا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ فوج سے ریٹائرڈ ہونے سے پہلے بھی ان کی یہی حالت تھی اور اب بھی یہی ہے۔ اسی لئے ہر روز ہماری شامت آئی رہتی ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ لیکن اس آدمی کی قسمت بہت بُری ہے۔ بیس سال کا تھا کہ فوج میں داخل ہوا۔ وہاں کوئی بہادری کا کارنامہ دکھایا اور کچھ ترقی پائی۔ اس کے بعد بیس سال لیکر پچاس سال کی عمر تک زیادہ سے زیادہ کپتان کے عہدے تک پہنچ سکا۔ حالانکہ اس عمر میں وہ کرنیل بن سکتا تھا۔"

بہر حال یہ ان کا اپنا قصور ہے اگر اسقدر سخت مزاج نہ ہوتے تو ان کے افسر انہیں زیادہ پسند کرتے اور ان کو ترقی دینے کی انتہائی کوشش کرتے۔ سخت طبیعت ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہمیں ترقی کرنی ہے۔ تو ہمیں لوگوں کو خوش رکھنا پڑیگا۔"

میڈم کہنے لگی "لیکن ہم سے جو سلوک ہوتا ہے۔ ہم خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا اپنا قصور ہے یہی بات ہے نا کہ ہم خود اس کے —— پاس رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی بات اور ہے وہ اس کی پروا کیوں کریں"۔

میڈم سوچ رہی تھی۔ کئی سال سے ہر روز وہ اپنے شوہر کے جور و ستم کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ جس سے اُسے شادی کئے اب مدتیں گزر چکی تھیں۔ اس نے اس سے محض اس لئے شادی کی تھی کہ وہ ایک خوش رُو افسر تھا جسے اوائل عمر میں بہت ترقی مل گئی تھی۔ اس کا مستقبل شاندار نظر آرہا تھا۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا۔ انسان زندگی میں کیسی عجیب غلطیاں کرتا ہے۔

وہ نرمی سے کہنے لگی "الیگزینڈر! تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ تم بھی بنچ پر بیٹھ کر آرام کرلو۔"

یہ چھوٹا سا بنچ ٹوٹا ہوا تھا۔ درختوں کی دو رویہ قطار میں مسافروں کے آرام کے لئے رکھا گیا تھا جب وہ اس راستے سے دریا پر آتے تھے۔ تو الیگزینڈر تھوڑی دیر کے لئے یہاں

مجھ کو ستایا کرتا تھا۔

وہ اپنی پنکھے کی شکل کی سفید اور نفیس ڈاڑھی کو ایک انداز غرور سے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسے زور سے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اور آہستہ آہستہ نیچے کی طرف ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ڈاڑھی کی نوک اس کے پیٹ تک چلی گئی تھی۔ اور وہ اسے کھینچ کھینچ کر چند منٹ کے لئے یوں سیدھی کر دیتا تھا جیسے وہ اسے پیٹ کے ساتھ باندھ دینا چاہتا ہے اور اس کی طوالت کی خاص طور پر نمائش کرنا چاہتا ہے۔

میڈم مارمیلی کہنے لگی۔

"میرا کیا ہے میں نے خود ہی تو اس سے شادی کی تھی۔ اب مجھے اس کا ظلم و ستم بھی برداشت کرنا چاہیئے۔ لیکن جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے۔ کہ تم کیوں اسکا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بیچارے الیگزینڈر؟"

وہ اپنے کاندھوں کو ایک عجیب سی حرکت دیکر کہنے لگا "بیگم صاحبہ کیا پوچھتی ہیں۔ آپ جانے دیجئے۔"

وہ کہنے لگی۔ "میں نے کئی دفعہ اس بات پر غور بھی کیا ہے۔ میں تھے تو اس سے شادی کر لی تھی اور مجھے تو مجبوراً اس کے ساتھ رہنا پڑا ہے۔ میں کچھ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ جب میں نے اس سے شادی کی تم ان کے اردلی تھے۔ لیکن تم بھی اس وقت سے

ہمارے ساتھ رہ رہے ہو۔ جو تم سے اسقدر بُرا سلوک کرتے ہیں اور اتنی کم تنخواہ دیتے ہیں حالانکہ تم بھی دوسروں کی طرح ہمیں چھوڑ کر اپنی زندگی سنوار سکتے تھے۔ شادی کر لیتے۔ بچوں سے جی بہلاتے اور اپنا علیحدہ گھر آباد کر لیتے۔

"بیگم صاحبہ بات کچھ اور ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈاڑھی یوں کھینچنا شروع کی جیسے یہ کوئی گھنٹی ہے۔ جو اس کے دل میں بج رہی ہے۔ اور وہ اسے کھینچ کھینچ کر پرے پھینک دینا چاہتا ہے۔ اس کی متبرک نگاہیں اس کی حیرانی و سراسیمگی کا صاف پتہ دے رہی تھیں۔

میڈم ماربلی نے پھر اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔

"تم دیہاتی تو نہیں ہو۔ تم تو تعلیم یافتہ ہو ——————"

وہ بڑے فخر سے کہنے لگا۔" ہاں میں نے اور سیری کی تعلیم حاصل کی تھی۔"

"پھر تم نے ہماری ملازمت کیوں کی اور اپنی زندگی تباہ کیوں کرتے رہے۔"

"اس لئے —————— اس لئے کہ یہ میری ایک فطری کمزوری تھی

"فطری کمزوری سے کیا مطلب؟"

بات یہ ہے کہ جب مجھے کسی سے اُنس ہو جائے۔ تو میں ہمیشہ کے لئے اُسی کا ہو جاتا ہوں۔ بس یہی وجہ ہے؟"

میڈم ہنس پڑی۔

"چھوڑو تم کبھی مجھے یقین نہ دلا سکو گے کہ کپتان مارمبلی کی مہربانی اور نرم دلی نے تمہیں ہمیشہ کے لئے اس سے وابستہ کر دیا ہے۔"

الیگزینڈر نے بے تابی سے اپنے آپ کو بنچ پر ایک حرکت دی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ گھبرا سا گیا ہے۔ اس کی گھنی مونچھوں میں کچھ الفاظ اٹک کر رہ گئے۔ آخر وہ بول ہی اٹھا۔

"بیگم صاحبہ کپتان مارمبلی نے مجھے اپنے آپ سے وابستہ نہیں کر رکھا۔ میڈم مارمبلی نے مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیا ہے۔"

بوڑھی خاتون جس کے حسین چہرے پر برف کے سے سفید اور گھنگریالے بال راج ہنس کے پروں کے تاج کی طرح چمک رہے تھے۔ اور جنہیں وہ ہر روز وہ بڑے اہتمام سے سنوارا کرتی تھی چونک اٹھی اور اپنے نوکر کی طرف تعجب کی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیا ہے۔ غریب الیگزینڈر تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟"

بوڑھے نوکر نے پہلے فضا پر ایک نگاہ ڈالی۔ پھر دوسری طرف دیکھا۔ اور اس کے

بعد دُور فاصلے تک نگاہیں دوڑا کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے اس سے زبردستی کسی شرمناک راز کا افشا کرایا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک سپاہی کی سی بہادری کے ساتھ بولا۔

"بات یوں ہوئی کہ جب میں نے پہلے پہل لفٹینٹ کا خط میڈم مار مبلی کو دیا تو وہ میری طرف دیکھ کر ایک ساحرانہ انداز کے ساتھ مسکرا پڑی اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک فرانک بھی دیدیا۔ میری قسمت کا وہیں فیصلہ ہو چکا تھا۔"

یہ بات میڈم کی سمجھ میں اچھی طرح نہ آئی اور وہ کہنے لگی "ہاں ہاں ساری بات مجھے ٹھیک طرح سمجھا دو میں نہیں سمجھی!"

ایک ایسے مجرم کی طرح جسے یقین ہو چکا ہو کہ اب اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کر لینے کے سوا چارہ نہیں الیگزینڈر بولا۔

"مجھے میڈم مار مبلی نے ہمیشہ کے لئے مسحور کر لیا۔"

میڈم نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ اپنے نوکر کی طرف دیکھا۔ وہ ایک راست باز معقول مہربان حلیم الطبع اور حساس عورت تھی۔ سب کچھ سمجھ گئی۔

ایک ہی لمحے میں اس نے اندازہ کر لیا کہ اس بدقسمت آدمی نے کتنی زبردست قربانی کی ہے۔ اور ہر وقت میرے قریب رہنے کے لئے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے۔ لیکن

مجھ سے اپنی محبت کا کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

وہ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی "چلو واپس" ——— وہ خفا نہیں ہوگئی تھی۔

الیگزینڈر اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی کی پشت کے گرد چکر لگا کر ہتھے کی طرف آگیا۔ اور گاڑی کو دھکیلتا ہوا قصبہ کی طرف چل دیا جب وہ مکان کے قریب پہنچے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ کپتان مارمبلی ان کی طرف آرہا ہے۔

جونہی وہ اپنی بیوی کے قریب پہنچا وہ اس انداز سے گویا وہ خواہ مخواہ لڑائی مول لینا چاہتا ہے۔ کہنے لگا۔

"آج کیا پکا ہے؟"

"ایک چوزہ اور ساگ!"

"چوزہ! چوزہ!! اور چوزہ!! اب اس پر لعنت بھی بھیجو گے! میں تمہارے کافی چوزے کھا چکا ہوں۔ کیا تم ہر روز مجھے ایک ہی چیز دیتے جاؤ گے؟"

میڈم کچھ بیزاری سے کہنے لگی "پیارے تم جانتے ہو نا کہ ڈاکٹر نے اور چیزیں منع کر دی ہیں۔ تمہارے معدے کے لئے یہی ایک بہترین غذا ہے۔ اگر تمہارا

معدہ خراب نہ ہوتا تو میں تمہیں ہزار چیزیں دے سکتی تھی!"

کپتان۔ الیگزینڈر کے سامنے نہایت مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"اگر میں بیمار ہوا ہوں تو یہ سب اس عقل کے اندھے کا قصور ہے۔ جو پینتیس سال سے مجھے اپنی غلیظ اور بدمزہ خوراک کھلا کھلا کر میرے معدے میں زہر بھر رہا ہے۔

میڈم مارمیلی نے جلدی سے مڑ کر بوڑھے نوکر کی طرف دیکھا اور دونوں کی مایوس نگاہیں آپس میں مل گئیں۔

باپ بیٹا

باپ بیٹا

دیہاتی وضع کی یہ حویلی بھی قریب کے انہیں مکانوں کی ہمشکل تھی۔ جن میں کبھی دیہات کی ایک نیم جنگجو قوم آباد تھی۔ اب ان گھروں میں متمول زمینداروں نے رہائش اختیار کر لی تھی، اس عمارت کے روبرو ایک بڑا سا صحن تھا، جس میں جابجا سیب کے درخت نظر آتے تھے۔ داروغہ شکار اور کچھ لڑکے خالی بوریاں اُٹھائے ادھر آرہے تھے۔ درختوں سے بندھے ہوئے کتے ان کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگے۔ ان کے گلے سے عجیب عجیب منحوس اور ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگیں۔

کھانا کھانے کے ایک وسیع وعریض کمرے میں جو باورچی خانہ بھی تھا ہومانٹ، اسکا بیٹا، موسیو برمونٹ، اور موسیو مبنڈارن بیٹھے تھے۔ شکار کا موسم ابھی ابھی شروع ہوا تھا، اور اس موسم میں آج پہلی مرتبہ وہ شکار کھیلنے کے لئے روانہ ہونے والے تھے، تھوڑا تھوڑا کھانا کھانے کے بعد اس وقت ہر آدمی شراب کا ایک گھونٹ پی رہا تھا۔

ہومانٹ، کو اپنی جائداد اور زمین پر بڑا ناز تھا۔ وہ اس وقت مہمانوں کے سامنے

شیخی بگھار رہا تھا، کہ میرے جنگل میں بڑا شکار ہے۔ اور آج ہم وہاں سے "مالا مال" ہو کر آئیں گے، وہ صحیح معنوں میں ایک نارمن تھا۔ اور ان عظیم الہیئت قوی الجثہ اور سرخ و سپید چہرے والے آدمیوں میں سے تھا۔ جو ببول سے لدا چھکڑا ایک دم اپنے کندھوں پر اُٹھا سکتے ہیں۔ اس کی شخصیت بھی عجیب تھی۔ نیم دیہاتی اور نیم شہری وہ ایک امیر، بارسوخ اور مطلق العنان آدمی تھا۔ لوگ اس کا نام عزت سے لیا کرتے تھے، پہلے تو اس نے اپنے لڑکے کو تعلیم دلانی شروع کی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یکایک اسے مزید تعلیم حاصل کرنے سے روک لیا، اسے خدشہ تھا کہ کہیں زیادہ تعلیم یافتہ ہو کر وہ "مہذب" نہ بن جائے اور کھیتی باڑی سے دلچسپی لینا چھوڑ دے،

سیزر ہونانٹ' کا قد بھی اپنے باپ جیسا ہی تھا، البتہ جسم ذرا سا ہلکا تھا، وہ ایک ہونہار لڑکا تھا، باپ کی دل و جان سے عزت کیا کرتا، مہذب اتنا کہ لوگ بے اختیار اسکی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے طبیعت میں حد درجہ قناعت تھی، باپ کی ہر رائے اور ہر خواہش کا احترام کرنا ہی اسکا مذہب تھا۔

برمونٹ کا قد چھوٹا سا اور جسم توانا تھا، سرخ رخساروں پر گہرے سُرخ رنگ کی پتلی پتلی رگوں کا جال بچھا تھا، یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کے رخسار ایک جغرافیائی نقشہ ہیں، جن پر کسی دریا کے چھوٹے چھوٹے معاونوں اور ننھی ننھی ندیوں کی تصویر کھینچ کر

دکھائی گئی ہے، وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا "اچھا یہ تو بتاؤ یہاں کہیں خرگوش بھی ملیں گے"؟

ہوماٹ نے جواب دیا "واہ! بھئی جتنے چاہو! اور پسپئیر کے قریب گڑھوں میں تو بہت ملیں گے۔"

موسیو مونڈارن جو ایک خوش طبیعت، تنومند اور زرد رُو آدمی تھا، کہنے لگا "ارے بھائی یہ مہم کہاں سے شروع ہو گی؟"

"دادیوں کی سمت بڑھے چلو وہاں سے تیتروں کو کھلی جگہ بھگا لائیں گے اور پھر یکایک ان پر ٹوٹ ہی پڑیںگے۔"

ہوماٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ دوسرے آدمی بھی اُٹھ بیٹھے، سب نے کونے سے اپنی اپنی بندوقیں اُٹھائیں ٹھٹھرتے ہوئے قدموں کو ذرا گرم کرنے کے لیے زور زور سے کئی مرتبہ زمین پر ہتوڑے کی طرح پاؤں مارے اور چل پڑے کتّے زنجیروں کو جھٹکے دے دے کر غصّے سے ہوا میں پنجے مارنے لگے گویا وہ ہوا کو چیر پھاڑ ڈالنا چاہتے ہیں۔

وہ جنگل کے اس حصّے کی طرف چل دیئے جہاں جا بجا گڑھے اور خندقیں پائی جاتی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی گھاٹی میں آپہنچے گھاٹی کیا تھی درختوں کے پتوں اور گھاس سے ڈھنپتی ہوئی ناقص اور ناقابلِ کاشت زمین کا ایک لمبا سا قطعہ

جس میں جا بجا خندقیں اور گڑھے پائے جاتے تھے۔ شکار کے لئے یہ موزون ترین جگہ تھی۔

چاروں شکاری مناسب جگہوں پر کھڑے ہو گئے، ہوٹاٹ دائیں سمت، اس کا لڑکا بائیں سمت، اور دونوں مہمان مرکز میں دارو غہ شکار اور قلی شکار کے تھیلے لیکر اُن کے پیچھے آکھڑے ہوئے، اب وہ پہلے نشانے کے منتظر تھے۔ ان کے دلوں کی حرکت تیز ہو چکی تھی اور ان کی محتاط انگلیاں اپنی اپنی بندوق کی لبلبی پر تھیں۔

یکایک بندوق کی آواز نے سکوت کو توڑا، ہوٹاٹ نے بندوق چلا دی تھی، سب چونکنے ہو گئے، نگاہیں اوپر اٹھیں، تبتروں کے ایک برق رفتار جھول میں سے ایک تیتر جھاڑیوں سے ڈھنتی ہوئی ایک خندق میں آگرا تھا پر جوش شکاری لمبے لمبے ڈگ بھرتا خاردار جھاڑیوں کو ہاتھوں سے پرے ہٹاتا بے تحاشا ایک ہی سمت میں دوڑنے لگا۔ اور آن واحد میں جھاڑیوں میں غائب ہو گیا،

یکایک پھر بندوق چلنے کی آواز آئی۔

موسیو پر موتٹ خوش ہو کر کہنے لگا "ہا! ہا! لو اس اتو نے جھاڑیوں میں سے کوئی خرگوش مارا ہے"

سب گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ پر نظریں گاڑے بیتابی سے ہوٹاٹ کے جواب کا

انتظار کرنے لگے، موسیو مونڈارن تالی بجا کر کہنے لگا "- ارے پکڑ لیا-؟"

جب ہوٹماٹ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو بینر ایک قلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "- جوزف جاؤ ذرا ابا کی مدد کرو- ہمیں اپنی قطار سے ادھر ادھر نہیں ہونا چاہئے- ہم یہیں تمہاری آمد کے منتظر ہیں"

جوزف، جس کا بدن سوکھی چھڑی کا ہمشکل تھا- اور جس کے اعضاء کے جوڑ سوجکر گانٹھوں کے مانند صاف نظر آرہے تھے، لومڑی کی طرح آسان راستہ تلاش کرتا ہوا آہستہ آہستہ خندق کی طرف چلدیا، تھوڑی دیر بعد یکایک وہ چلا اٹھا "دوڑو! دوڑو! جلدی آؤ حادثہ ہو گیا!"

وہ سب جھاڑیوں کو گھومتے پھاندتے آگے دوڑے ہوٹماٹ اپنے پہلو پہ بیہوش پڑا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا رکھا تھا، اُف کسقدر خوفناک نظارہ تھا! اس کے پیٹ سے فوارے کیطرح خون کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں، کتان کی واسکٹ میں چھرّوں نے ایک بڑا شگاف کر ڈالا تھا جس میں سے خون نکل نکل کر گھاس پر بہ رہا تھا، حادثہ یوں پیش آیا کہ ہوٹماٹ زخمی تیتر کو پکڑنے کیلئے تیزی سے آگے بڑھا گھبراہٹ میں بندوق اس کے ہات سے گر کر چل گئی جس سے اس کے پیٹ کی انتڑیاں چھلنی ہو کر رہ گئیں اسے کھینچ کر خندق سے باہر نکالا گیا، کپڑے اتارنے سے معلوم ہوا کہ اس کا پیٹ بری

طرح سے پھٹ چکا ہے اور انتڑیاں باہر نکل آئی ہیں۔ پٹی باندھ کر وہ اسے گھر اٹھا لائے جہاں ڈاکٹر اور پادری کو فوراً بلا لیا گیا۔

ڈاکٹر پہنچا تو اس نے سیزر کی طرف دیکھ کر جو کرسی پر پڑا سسکیاں لے رہا تھا، مایوسی سے سر ہلایا اور کہنے لگا "میرے کمسن بچے! اطوار بے طور نظر آ رہے ہیں۔"

زخم کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ پہلے تو مریض کی انگلیوں کو جنبش ہوئی، اس کے بعد اس نے منہ کھولا اور پھر آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد ایک دکھ بھری اور ناتوان سی نگاہ ڈالی یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے یوں وہ کوئی بھولی ہوئی بات یاد کر رہا ہے۔ یا کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بڑبڑا کر کہنے لگا۔

"میرے خدا! میرا خاتمہ ہو گیا!"

ڈاکٹر اس کا ہات پکڑ کر کہنے لگا "نہیں نہیں چند دنوں تک آپ اچھے ہو جائینگے صرف آرام کی ضرورت ہے۔"

ہوماٹ کہنے لگا "نہیں میرا خاتمہ قریب ہے، میری بوٹی بوٹی ہو گئی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔"

فقرہ ختم کرتے ہی وہ پھر بولا "اگر مناسب ہو تو میں اپنے بیٹے سے چند باتیں کر لوں؟"

سینرز بچوں کی طرح رو رہا تھا، بے اختیار پکار اُٹھا "ابّا پیارے ابّا"

باپ ذرا حوصلہ مندی کے انداز میں بولا "ادھر آؤ یہ رونے کا وقت نہیں، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، میرے قریب بیٹھ جاؤ، مجھے ایک مختصر سی وصیت کرنی ہے، تبھی میرے دل کا بار ہلکا ہوگا.......... حضرات! تھوڑی دیر کے لئے آپ ذرا باہر تشریف لے جائیے"۔

"میرے بچے سنو! خدا کے فضل سے اب تمہاری عمر چوبیس سال ہے، اب تم سے کوئی بات کہنے میں کوئی حرج نہیں، بہرکیف بعض باتیں کوئی اتنی پیچیدہ تو ہوتی نہیں مگر ہم انہیں بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ تمہاری اماں کو سدھارے سات سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ میری عمر اس وقت پینتالیس ۴۵ سال ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

بیٹا ہکلاتے ہوئے کہنے لگا "ہاں ابا"

سو تمہاری والدہ کو فوت ہوئے سات سال ہو چکے ہیں۔ لیکن میں نے اب تک شادی نہیں کی، پر مجھ جیسا آدمی پینتیس سال کی عمر میں بیوی کے بغیر کس طرح رہ سکتا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟

"بالکل ٹھیک ہے ابّا"۔

ہوٹاٹ کے گال زرد پڑ چکے تھے۔ چہرہ کھنچ رہا تھا، بڑی مشکل سے ہلکورا لے کر کہنے لگا۔

"او خدایا! مجھے سخت عذاب ہو رہا ہے...... اچھا تو میرے بچے تم سمجھ گئے ہو گے، انسان تنہا زندگی بسر کرنے کیلئے پیدا نہیں کیا گیا، لیکن میرا دل گوارا نہیں کرتا تھا، کہ تمہاری اماں کے بعد کسی اور کو اس گھر میں لاؤں۔ میں نے اس سے یہی وعدہ کیا تھا۔ سمجھے"

"ہاں ابا"

"اچھا تو میں نے...... میں نے...... ایک لڑکی......

سے تعلقات پیدا کر لئے، روئن میں ریو دی ریپرلن نمبر ۱۸ کی تیسری منزل میں وہ رہتی ہے، پہلا دروازہ چھوڑ کر دوسرا اسی کے مکان کا ہے، میں تمہیں ایک ایک بات بتا رہا ہوں کوئی بات مت بھولنا، ہاں تو میرے لئے یہ نوجوان لڑکی ہمیشہ ہی نہایت پیاری مخلص اور حقیقی بیوی ہی رہی ہے۔ میرے پیارے بیٹے سمجھ گئے ہو؟"

"ہاں ابا۔"

"اچھا تو مرنے سے پہلے مجھے ایک بہت بڑا فرض انجام دینا ہے۔ میں اس کیلئے کوئی ایسا بندوبست کر جانا چاہتا ہوں جس سے اسے روزمرہ کی معمولی معمولی ضروریات پورا کرنے کے لئے حاجتمند نہ رہنا پڑے میرے بچے تم سمجھ گئے ہو گے"۔

"ہاں ابّا"

"میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے، نہایت ہی اچھی لڑکی لیکن تمہارا اور تمہاری ماں کی یاد کا پاس کرتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ ہم تینوں یہاں رہا کرتے تھے، میں نے اسے یہاں نہ بلایا، ہو سکتا تھا کہ میں اسے یہاں لے آتا اور اس سے شادی کر لیتا......... سنو! ذرا غور تو کرو میرے بچے! میں کچھ جائداد اس کے نام لکھ سکتا تھا......... لیکن میں نے یہ نہیں کیا میرے دل نے......... بات یہ ہے کہ ایسی باتیں لکھی نہیں جاتیں......... حقیقی وارثوں کے لئے ایسی باتیں مضر ثابت ہوتی ہیں، جھگڑے پڑ جاتے ہیں۔ اور خاندان پر تباہی آجاتی ہے، دیکھو کبھی قانونی دستاویزوں کی طرف رجوع نہ کرنا۔ ایسی باتوں کا مطلق خیال نہ کیا کرنا، اگر میں امیر ہوں تو محض اسی لئے کہ ایسی باتوں سے مدت العمر بچتا رہا ہوں، میرے بچے سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں ابّا"

"ذرا غور سے سنو......... میرے اور قریب آجاؤ......... میں نے کوئی وصیت نامہ نہیں لکھا......... میرا جی ہی نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ میں جانتا ہوں۔ کہ تم بڑے رحمدل ہو، خدا کے فضل سے تم لالچی نہیں، کنجوس نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب مجھے کسی ایسی بات کا خیال آتا بھی تھا۔ میں اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کرتا تھا

کہ جب میرا آخری وقت آئے گا، تو میں خود ہی اپنے بچے سے سب کچھ منوالونگا،
اور اس سے التجا کرونگا، کہ وہ اس لڑکی کو نہ بھولے........... یاد رکھنا.......

کاروالائن ڈونٹ ریو دی لیپرلن نمبر ۱۸، تیسری منزل دائیں طرف دوسرا دروازہ، بھولنا مت میرا آخری وقت آرہا ہے، تم سیدھے وہیں چلے جانا، دیکھنا اُسے کبھی کوئی تکلیف نہ ہو تمہارے پاس بہت کچھ ہے، تم خدا کے فضل سے بآسانی اسے ہر طرح کی مدد دے سکتے ہو شکر ہے کہ میں تمہیں امیر چھوڑ رہا ہوں، سنو! تم ہر روز اسے گھر نہیں پاؤ گے، وہ مادام موریو کے ہاں کام کرتی ہے، جمعرات کے دن چلے جانا، اسے ہر جمعرات میرا ہی انتظار رہتا ہے، چھ سال سے متواتر ہر جمعرات میں اس کے گھر جاتا رہا ہوں۔ آہ غریب لڑکی! بیچاری رو رو کر اپنا حال برا کر لیگی میرے بچے میں نے سب بات صاف صاف تم سے کہہ دی ہے، کیونکہ میں تم کو اچھی طرح جانتا ہوں، ہر آدمی سے ایسی باتیں نہیں کہی جاتیں، نہ تو وکیل سے نہ پادری سے دنیا میں ایسی باتیں اکثر ہوتی ہیں، ہر ایک جانتا ہے، لیکن آدمی ان کا ذکر اس وقت تک نہیں کرتا جب تک کہ ان کا وقت نہ آجائے، کسی اور کو تو اس راز سے آگاہی نہیں۔ ایسی باتیں اگر کوئی کرسکتا ہے۔ تو اپنے ہی گھرانے میں، کیونکہ اپنے گھرانے کے کسی رکن سے کوئی بات کرنا اپنے ہی دل سے کوئی بات کہنے کے مترادف ہے۔ سمجھ گئے ہو، میرے بیٹے؟"

"ہاں ابا"

"وعدہ کرتے ہو؟"

"ہاں ابا"

"قسم کھاتے ہو؟"

"ہاں ابا۔"

میرے پیارے بچے کہیں میرے یہ لفظ بھول نہ جانا، یہ لفظ نہیں التجائیں ہیں منتیں ہیں، اور میرے نزدیک ان کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے"

"ابا میں نہیں بھولوں گا"

"تم خود اس کے پاس چلے جانا میں چاہتا ہوں کہ تم ہر بات کے متعلق اچھی طرح تسلی کر لو"

"بہت بہتر ابا"

"اور پھر تم دیکھو گے......... تم دیکھو گے کہ وہ کیا کہتی ہے، میں تمہیں اس کے متعلق کچھ اور نہیں بتا سکتا۔ اچھا تو اب تم حلفاً کہتے ہو کہ میری سب باتیں مانو گے؟"

"ہاں ابا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کی ہر بات مانوں گا"

"میرے بچے تم راستی پر ہو، اب ذرا میرے سینے سے لپٹ جاؤ، خدا تمہارا حافظ

دناصر ہو۔ اب بینشک دوسروں کو بھی بلالو۔"

بیز زرو رہا تھا، ہچکیاں لیتے ہوئے وہ باپ کے سینے سے لپٹ گیا۔ اس کے بعد وہ روایتی فرمانبرداری سے مجبور ہو کر جلد ہی دروازہ کھولنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پادری اپنا سفید مخصوص سفید لباس پہنے ہات میں خوشبودار تیل لئے اندر آداخل ہوا،

مریض ناتواں کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں، اس نے اب نہ تو آنکھیں کھولنی چاہیں نہ کسی کی بات کا جواب دینا چاہا نہ کسی جنبش یا حرکت سے اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔

وہ کافی باتیں کر چکا تھا، اس سے زیادہ کیا کرتا اس کے علاوہ اب اس کا دل مطمئن ہو چکا تھا، وہ اطمینان و سکوت کی موت مرنا چاہتا تھا، اس نے پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا ضروری نہ سمجھا تھا، بیٹے ہی سے سب کچھ کہہ ڈالا تھا جو بہرحال بقول اس کے اسی کے گھرانے کا ایک رکن تھا۔

دوست اس کے بستر کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے، ملازموں نے گھٹنے ٹیک رکھے تھے۔ آخری رسوم ادا کر دی گئیں، پادری نے مرنے والے کے گناہ بخش دیئے۔ اس کا چہرہ پتہ دے رہا تھا کہ اسکی روح بلندیوں کیطرف پرواز کر چکی ہے۔

منگل کے دن نصف شب کے قریب چار گھنٹے کی مسلسل عذاب ناک حرکتوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

• • •

(۲)

شکار کا موسم اتوار کو شروع ہوا تھا، منگل کے دن پینولے کو دفنا دیا گیا۔ قبرستان سے واپس آنے کے بعد سیزر نے باقی تمام دن روتے روتے گزار دیا۔ اس رات وہ بمشکل ہی سو سکا ہو گا، صبح اُٹھا تو عجیب حالت تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا، کہ اب میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیسے کروں۔

شام تک وہ یہی سوچتا رہا کہ میں اپنے بابا کی آخری خواہش کے مطابق کل ہی اس لڑکی کے پاس جاؤنگا، جس کا نام کارولائن ڈونیٹ ہے، اور جو یودی لیپرلن نمبر ۱۸ میں تیسری منزل پر رہتی ہے، اور جس کے مکان کا دروازہ عمارت شروع ہوتے ہی دوسرا ہے وہ کارولائن ڈونیٹ کا نام اور یہ تمام پتہ دن بھر دل ہی دل میں دہراتا رہا، اس انداز سے جیسے کوئی دعا مانگ رہا ہو، اس وقت اس کے سوا اُسے کوئی اور بات یاد نہ تھی، نہ وہ کسی اور مسئلے کے متعلق کچھ سوچنا چاہتا تھا، ——— یہ الفاظ اس کی روح اور دماغ کے گوشے گوشے پر تسلّط پا چکے تھے۔

دوسرے دن آٹھ بجے کے قریب اس نے سائیس کو گھوڑے پر زین وغیرہ ڈالنے کے لئے کہا، اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک عظیم الہیئت گھوڑے پر چڑھ کر بڑی سڑک پر این ولے سے روئن روانہ ہو گیا، اس نے ایک لمبا سا سیاہ کوٹ اور ریشمی ہیٹ پہن رکھا تھا، پتلون

کے پائنچوں پر کلپ لگا رکھے تھے، موجودہ حالات کے پیش نظر آج اس نے اپنے سیاہ لباس کو گرد و غبار سے بچانے کے لئے اپنا خوشنما ڈھیلا بلاؤس نہیں پہنا تھا، جو دوران سفر میں آسانی سے اُتار اور پہنا جا سکتا ہے، آج اس نے اس لمبے کوٹ پر ہی اکتفا کی تھی،

دس بجے کے قریب وہ روئین پہنچ گیا، حسبِ معمول ایک ہوٹل میں جا ٹھہرا، پہلے پہل اپنے ایک آشنا زمیندار کے گھر گیا، زمیندار اس کی بیوی اور پانچوں بیٹوں نے اس سے اظہار تعزیت کیا، انہوں نے پہلے ہی سے یہ افسوسناک خبر سن لی تھی، اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، باپ کی اتنی دولت ہاتھ آجانے پر انہیں اس کی بہت خوشامد منظور تھی۔

انہوں نے اسے کھانے کی دعوت بھی دی، لیکن اس نے اسے نامنظور کر کے انہیں مایوس کر دیا۔

سیبزر نے اپنی ہیٹ سے گرد جھاڑی، کوٹ اور بوٹ پر برش کیا، اور کیبر دلائن ڈونیٹ کا مکان تلاش کرنے روانہ ہو گیا اسے جرأت نہ پڑتی تھی، کسی سے اس کے مکان کا پتہ پوچھے، مبادا یہ سربستہ راز کھل جائے،

اسے کسی طرح پتہ نہ ملا، آخر اسے ایک پادری ملا جس کے پیشہ درانہ زہد و اتقا پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے اسی سے مدد چاہی۔

معلوم ہوا کہ یہاں سے اس کا مکان صرف ایک سو قدم کے فاصلے پر دائیں سمت کے دوسرے بازار میں ہے، وہ گھبرا رہا تھا اُسے اپنی سبکی محسوس ہو رہی تھی، یہ سوچ سوچکر کہ میں اس عورت کے سامنے جا رہا ہوں، جو میرے باپ کی داشتہ رہی ہے،

صدیوں سے اس خاندان کو اخلاق اور شرافت کی تعلیم دی جاتی رہی تھی، جسکا اثر بیٹے پر ہونا لازمی تھا، بچپن ہی سے وہ فاحشہ عورتوں کے قصے سنتا چلا آیا تھا اسے معلوم تھا کہ جو آدمی ایسی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں، خود وہ بھی ان کی حرکات کو نفرت ہی سے دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ایک سادہ مزاج دیہاتی آدمی تھا نیکی کے متعلق اسکے تصورات محدود تھے۔ اسی قسم کے تمام خیالوں نے اس کے دماغ میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ وہ سخت شرمندہ ہو رہا تھا۔ اور اس وقت اسے ملنے سے ہچکچا رہا تھا۔

آخر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا "میں تو ابا سے وعدہ کر چکا ہوں مجھے اُسے پورا کرنا چاہیئے"، سو اس نے اٹھارہ نمبر کے مکان کا دروازہ جو تھوڑا سا پہلے سے ہی کھلا تھا، کھولا آگے تاریک سیڑھیاں تھیں، تین سیڑھیاں چڑھا تو ایک اور دروازہ آگیا، اور ایک کے بعد پھر دوسرا، گھنٹی بجانے کی رسی لٹک رہی تھی، اس نے اسے کھینچا، اور وہ بجنے لگی، ساتھ اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا، دروازہ کھلا اس کے روبرو ایک خوش پوشاک خاتون کھڑی تھی، جس کا چہرہ تو گندمی تھا، لیکن گال گلاب کے پھولوں کی طرح خوشنما، دو

خوبصورت آنکھیں حیرانی سے اسے تک رہی تھیں۔

وہ نہیں جانتا تھا، کہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے اسے ابھی اس حادثے کا علم نہیں ہوا تھا، وہ تو اس وقت اس کے باپ کی منتظر تھی۔ تبھی شاید وہ اسے اندر نہ لے گئی۔

کوئی تیس سیکنڈ تک وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ بالآخر وہ بولی

"فرمائیے"

سیبزر کہنے لگا "میں ہوئاٹ کا بیٹا ہوں"

وہ چونک گئی، اس کے رخسار زرد پڑ گئے، اور وہ گھبرا کر کچھ اس انداز سے جیسے وہ پہلے سے اسے جانتی ہے، کہنے لگی،

"آپ موسیو سیبزر ہیں؟"

سیبزر نے جواب دیا "ہاں"

"اچھا تو......؟"

"ابا نے آپ کی طرف ایک پیغام بھیجا ہے"

وہ مضطرب ہو کر کہنے لگی "ہیں پیغام"؟

اس کے بعد وہ اسے اندر لیجانے کے لئے دروازے سے پرے ہٹ گئی، سیبزر دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے چلا گیا۔

اندر چار، پانچ سال کا ایک چھوٹا سا لڑکا چولھے سے ذرا پرے زمین پر بیٹھا ایک بلّی سے کھیل رہا تھا، کھانا گرم رکھنے کیلئے چولھے پر جو برتن پڑا تھا، اس سے سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

وہ سیزر سے کہنے لگی "بیٹھ جائیے۔"

وہ بیٹھ گیا، کچھ وقفے کے بعد وہ بولی "اچھا تو کیا بات ہے؟"

سیزر کی زبان گنگ ہو گئی، اس کی نظریں میز پر جو کمرے کے وسط میں پڑی تھی، گڑ گئیں، دو بڑوں ایک بچے کے لئے اس پر برتن پڑے تھے۔ اب وہ کرسی کی طرف جس کی پیٹھ چولھے کی جانب تھی دیکھنے لگا، دیوانوں کی طرح کبھی اس کی نگاہیں کسی طشتری پر جم جاتیں، کبھی میز پوش اور گلاسوں پر اور کبھی وہ ابھی ابھی کھلی ہوئی سرخ و سپید شراب کی بوتلوں کی طرف دیکھنے لگتا، یہ کرسی جس کی پشت چولھے کی طرف تھی اس کے باپ کے لئے یہاں رکھی گئی تھی، انہیں اسی کا انتظار تھا، کانٹے کے قریب اسی کی روٹی پڑی تھی۔ سیزر جان چکا تھا، کہ یہ میرے ہی باپ کے لئے رکھی گئی ہو گی، کیونکہ روٹی کا چھلکا دور کر دیا گیا تھا، دانت کمزور ہونے کی وجہ سے ہوٹاٹ ویسی ہی روٹی کھایا کرتا۔ سیزر نے نگاہیں اوپر اُٹھائیں، تو دیکھا کہ ایک دیوار پر اس کے باپ کی تصویر لٹکی ہے، یہ تصویر پیرس کی نمائش میں اتروائی گئی تھی، اس کی دوسری نقل آئن والے کے بڑے کمرے

میں بستر کے سامنے ٹنگی تھی.

نوجوان عورت نے پھر پوچھا "اچھا مو سیو کہو پھر"! وہ میز پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی، تشویش و اضطراب سے اس کا چہرہ موت کی طرح زرد پڑ چکا تھا، وہ اس کے منہ سے الفاظ سننے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے،

میز رجی کڑا کر کے کہنے لگا "مس ڈونیٹ اتوار کو آبا جان کا انتقال ہو گیا"

وہ ان خوفناک اور بوجھل الفاظ کے نیچے کچھ یوں دبی کہ جنبش تک کرنے کی سکت نہ رہی جہاں بیٹھی تھی، وہیں کی رہیں رہ گئی، چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد وہ کچھ غیر معمولی سے لہجے میں بول اٹھی "نہیں یہ ممکن نہیں"!

اس کے بعد اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ اپنا چہرہ ہاتوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اپنی ماں کو روتے دیکھ کر بچے کی توجہ بھی ادھر ہو گئی، اور وہ بھی اپنی پر شور آواز میں رونے لگا۔

جب اس نے سوچا کہ یہ نیا غم یہ اجنبی ہی اپنے ساتھ لایا ہے تو اس نے اپنے آپ کو میز پر گرا لیا، ایک ہات سے اس کی پتلون کا ایک سرا پکڑ لیا، اور دوسرے سے اس کی پنڈلیوں کو اپنی مٹھیوں سے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا، میز سخت پریشان تھا، اس کے

دل کا درد لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا، کتنا دردناک نظارہ نظر رو تھا —— وہ

ایک ایسی عورت کے قریب بیٹھا تھا، جو اس کے باپ کا ماتم کر رہی تھی، اور ایک ایسے معصوم بچے کو دیکھ رہا تھا، جو اپنی ماں کی مدافعت کر رہا تھا، اُن کے جذبات اس کے دل میں منتقل ہو گئے اور اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو گئیں، اپنے آپ پر قابو حاصل کرنے کیلئے اب اس نے باتیں شروع کر دیں۔

بیبز ر کہنے لگا " یہ حادثہ اتوار کی صبح کو آٹھ بجے پیش آیا"

اس کے بعد اس نے تمام واقعہ تفصیل سے سنا دیا، سادہ لوح دیہاتیوں کی طرح معمولی معمولی بات کہہ سنائی، بچے نے اب بھی مار پیٹ جاری رکھی تھی اب وہ میبزر کی پنڈلیوں کو پاؤں کی ٹھوکریں مار رہا تھا۔

جب وہ یہاں پہنچا کہ "ابا کو مرتے وقت تمہاری بہت فکر تھی، وہ تمہارے لئے سخت پریشان تھے، تو ڈونیمٹ نے یکایک چہرے سے دونوں ہات اٹھالئے اور کہنے لگی "معاف کرنا میں تمہاری باتیں پوری توجہ سے نہیں سن رہی تھی، ذرا سب واقعہ پھر سے دھرا دو تو تمہیں تکلیف تو ہو گی"۔

میبزر نے پہلے ہی لفظوں سے پھر قصّے کا آغاز کیا، یہ حادثہ اتوار کی صبح کو آٹھ بجے پیش آیا.......

وہ ہر بات کو تفصیل سے بیان کر رہا تھا، باتیں کرتا کرتا اکثر ٹھہر جاتا تھا، وہ ایک ایک لفظ کو بڑی توجہ سے سن رہی تھی، ہر نئی وحشتناک بات کو اپنی ہی جنس کی طرح شدت سے محسوس کر رہی تھی، بار بار دہشت سے کانپ جاتی۔ اور اکثر کہہ اٹھتی، "اُف توبہ!"

لڑکے نے جب دیکھا کہ "میری اماں کو اب بالکل کوئی تکلیف نہیں تو اس نے اپنی مار پیٹ بند کر دی اور ماں کا ہات پکڑ کر سب باتیں اس غور سے سننے لگا، گویا۔ وہ انہیں بخوبی سمجھ رہا تھا۔

جب یہ المناک کہانی ختم ہو گئی، تو بیزر کہنے لگا۔

"اب ہم ابا کی خواہش کے مطابق کوئی تصفیہ کر لیتے ہیں انہوں نے بہت کچھ چھوڑا ہے، میرے پاس روپے کی کمی نہیں، میں نہیں چاہتا کہ آپ کو کوئی تکلیف ہو۔"

وہ بات کاٹ کر کہنے لگی، "ابھی نہیں، ابھی نہیں، ابھی ایسی باتیں نہ کرو، آہ میرا دل ——— کسی دوسرے دن سہی، آج نہیں، سنو اگر میں نے تمہاری پیشکش قبول کر لی ——— ہاں تو میرے لئے نہیں ہو گی ——— نہیں، نہیں خدا کی قسم یہ اس بچے کے لئے وقف ہو گی، اس کے علاوہ جو کچھ بھی تم دو گے اسی کے نام جمع کرایا جائیگا۔"

سیبزر حقیقت کو پہنچ گیا، اور کہنے لگا۔ "اچھا تو یہ ———

یہ ــــــــــ ان کا ــــــــ بیٹا ہے"

وہ کہنے لگی" ہاں تو"

سیزر نے اپنے بھائی پر تکلیف و ترحم کی دوگونہ کیفیت سے لبریز نظریں ڈالیں"
اس نے پھر رونا شروع کر دیا تھا، سیزر خاموش تھا، اور عرصے تک خاموش رہا
آخر گھبرا کر کہنے لگا۔

"اچھا تو مادام ڈذیٹ اب میں جاتا ہوں، آپ کب اس موضوع پر گفتگو کرنا
چاہیں گی؟"

وہ کہنے لگی" آہ! ابھی مت جاؤ! خدا کے لئے ابھی مت جاؤ، مجھے اور ایمیلی کو
تنہا نہ چھوڑتے جاؤ، میں فرطِ رنج سے مر جاؤں گی، دنیا میں میرا کوئی نہیں، اس بچے کے
سوا کوئی نہیں، آہ! موسیو کیا یہ المناک حقیقت نہیں، بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ!! ابھی یہاں
سے نہ جاؤ، مجھے اور باتیں سناؤ، مجھے بتاؤ کہ وہ گھر پر اپنا وقت کیسے گزارا کرتا تھا

سیزر کو اپنے باپ کی باتیں ماننے کی عادت تو ہو ہی چکی تھی، چپکے سے وہیں
بیٹھ گیا،

وہ چولھے کے سامنے جس پر ابلتے ہوئے سالن کی دیگچی رکھی تھی، اس کی کرسی
کے قریب ایک اور کرسی گھسیٹ لائی، ایمیلی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور سیزر سے

اس کے باپ کے متعلق طرح طرح کے سینکڑوں سوال پوچھ ڈالے، ایسے ایسے سادہ سوال جو اس کی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے تھے، بیبزر کو یقین ہو گیا کہ اس لڑکی کو اس کے باپ سے دلی محبت تھی۔

بیبزر نے اس حادثہ کے متعلق پھر گفتگو شروع کر دی اور پھر سے وہی باتیں سنا سنا کر اپنی قدرتی سادہ روی سے ان پر رائے زنی شروع کر دی جب اس نے یہ کہا کہ اباّ کے پیٹ میں اتنا بڑا شگاف ہو گیا تھا، کہ اس میں آدمی اپنی دونوں ہتھیاں ڈال سکتا تھا۔ تو ڈونیٹ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھر آئے، اس کے غم و اندوہ سے بیبزر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا وہ بھی زار زار رونے لگا، رونے سے دل اکثر صاف ہو جاتا ہے لیمیلی کی پیشانی بیبزر کے بالکل قریب آگئی تھی اس نے جھک کر اس کا بوسہ لے لیا۔

ماں ذرا ہوش سنبھل کر کہنے لگی "آہ! غریب بچہ یتیم ہو گیا۔"

بیبزر کہنے لگا "اور میں بھی"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔

یکایک گھریلو عورت کے "عملی دماغ" میں جیسے خانہ داری کے متعلق اپنے ہر فرض کا احساس ہوتا ہے، ایک خیال دوڑ گیا، وہ کہنے لگی "موسیو بیبزر آج صبح شاید

تم نے کچھ کھایا بھی نہ ہوگا۔"

"نہیں مادام۔"

"اوہ! تمہیں تو بھوک لگ رہی ہوگی؟"

"آپ کا شکریہ مجھے بھوک نہیں، سخت پریشان ہوں۔"

ڈونیٹ کہنے لگی، غم واندوہ کے باوجود ہمیں دنیا میں زندہ رہنا پڑتا ہے، انکار نہ کرو، اگر تم کچھ کھا لو تو شاید تھوڑا عرصہ اور یہاں ٹھہر سکو، جب تم چلے جاؤ گے تو نہیں معلوم میں کیا کروں گی۔"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان گیا، آگ کی طرف بیٹھ کر کے اس نے کچھ گوشت کھایا، اور سرخ شراب کا ایک گلاس پیا۔ لیکن اس نے ڈونیٹ کو سفید شراب کی بوتل نہ کھولنے دی، کئی دفعہ اس نے اپنے بھائی کا منہ رومال سے صاف کیا، جیسے بار بار وہ یخنی پی کر آلودہ کر لیتا تھا۔

جب وہ اٹھ کر چلنے لگا، تو اس نے پھر لڑکی کو مخاطب کیا اور کہا "مادام اس معاملے کے متعلق آپ کب مجھ سے گفتگو کرنا چاہیں گی۔

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو، تو اس کے لئے آئندہ جمعرات کا دن ہی مناسب رہے گا۔"

نہیں جمعرات کا دن میرے لئے ٹھیک ہے۔"

"تم دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاؤ گے نا، یہیں کھانا!"

اُس کے لئے میں وعدہ نہیں کرتا۔"

"نہیں کھانا کھاتے وقت آدمی ذرا آسانی سے باتیں کر سکتا ہے۔"

"اچھا تو یوں سہی میں پھر بارہ بجے آجاؤنگا۔

سیزر نے ایمیلی کا منہ چوما اور مادام ڈونیٹ سے ہات ملاکر چلا گیا۔

۳

سیزر کو ایک ہفتہ کی مدت ایک سال معلوم ہورہی تھی، اس نے کبھی اس قدر تنہائی محسوس نہیں کی تھی، یہ تنہائی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی، اب تک تو وہ اپنے باپ کے ساتھ سائے کی طرح رہا تھا، اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا اور دیکھتا رہتا کہ آیا نوکر اس کے احکام کی صحیح طور پر تعمیل کر رہے ہیں، اگر تھوڑے عرصے کیلئے بھی وہ اس سے جدا ہوتا تو کم از کم کھانے کے وقت ضرور گھر آموجود ہوتا تھا، انھوں نے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر کئی راتیں گذاری تھیں، اپنے اپنے پائپ پیتے ہوئے گھوڑوں گایوں اور بھیڑوں کے متعلق باتیں کی تھیں، ہر صبح بڑی محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کرتے رہے

تھے۔

اب ہر لمحہ اسے مادام ڈونیٹ کی یاد ستانے لگی، اس کی یاد سے اسے ایک مسرت حاصل ہوتی تھی، وہ ایک اعلیٰ خاتون کی طرح حلیم اور نیک دل تھی، اس کے باپ نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا، یقیناً وہ ایک نہایت ہی اچھی لڑکی تھی، اس نے سوچ لیا تھا کہ میں اس معاملے میں کافی فراخدلی کا ثبوت دونگا بچے کے لئے ہر سال اسے کم از کم دو ہزار فرانک دیا کرونگا آئندہ جمعرات کو اس سے ملاقات کرنے اور اس کے مستقبل کے لئے کچھ انتظام کرنے کے خیالوں سے اسے بے انتہا خوشی حاصل ہو رہی تھی، اگرچہ بھائی کا خیال۔ اپنے باپ کے بیٹے کا خیال۔ پانچ سال کے ایک معصوم بچے کا خیال اسے اذیت دے رہا تھا لیکن اس کے دل میں اس کے لئے ہمدردی ضرور تھی۔ اگرچہ اس ناجائز بچے کے نام کے ساتھ اس کے باپ کا نام کبھی منسوب نہ ہو سکتا تھا البتہ اس کے دل میں یہ خیال ضرور تھا۔ کہ چونکہ یہ بھی ایک طرح ہمارے ہی گھر کا رکن ہے۔ اسی لئے ہو سکتا ہے کہ میں اسے وہیں بلالوں تاکہ مجھے اپنے باپ کی یاد آیا کرے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اسے اسی طرح مادام ڈونیٹ کے پاس رہنے دوں۔

جمعرات کی صبح کو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے دل سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا تھا، باپ کی موت کے بعد بھی اسے اس قدر اطمینان میسر نہیں ہوا تھا، جب وہ

مادام ڈونیٹ کے کمرے میں داخل ہوا تو گذشتہ جمعرات کی طرح اب بھی بالکل اسی طرح میز پر کھانا چنا تھا فرق صرف یہ تھا۔ کہ اسی مرتبہ روٹی پر سے چھلکا نہیں اتارا گیا تھا۔

اس نے نوجوان خاتون سے مصافحہ کیا۔ اور ایمیلی کے دونوں رخساروں پر پیار کیا۔ اب یہ مکان اسے تقریباً اپنا ہی گھر معلوم ہو رہا تھا۔ اگرچہ اب بھی اس کے دل سے پوری طرح غم کا بوجھ نہیں اترا تھا۔ مادام ڈونیٹ دُبلی ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، گویا اس جانکاہ حادثے کا صدمہ اس نے اب محسوس کیا ہے، پہلے پہل اسے اپنے نقصانِ عظیم کا صحیح اندازہ نہ ہوا تھا۔ اب وہ سیبزر سے ضرورت سے زیادہ عزت اور محبت کے ساتھ پیش آ رہی تھی۔ اور حد سے زیادہ عجز اور انکسار ظاہر کر رہی تھی سیبزر نے اس سے مہربانی کا سلوک کیا تھا۔ وہ نہایت اضطراب سے اس کی منتظر رہی تھی۔ اور اس مہربانی کے جواب میں اپنی تمام تر توجہات اور جذبات التفات اس کی طرف مبذول کرنا چاہتی تھی۔

وہ کھانا کھا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اسی موضوع پر باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اسے اتنے روپے کی ضرورت نہ تھی۔ جتنا وہ اسے پیش کر رہا تھا۔ یہ بہت ہی زیادہ رقم تھی۔ ضرورت سے کہیں بہت زیادہ۔ اپنے لئے۔ تو وہ کافی روپیہ کماتی تھی، صرف وہ یہ چاہتی تھی کہ جب ایمیلی بڑا ہو تو اپنے اخراجات کے لئے ضرور اس کے پاس کوئی قلیل سی،

رقم ہو۔ لیکن بیبزر اپنی ہی بات پر ڈٹا رہا بلکہ ان ایام ماتم میں اس نے مناسب سمجھا کہ علاوہ برین اسے ایک ہزار فرانک کا مزید تحفہ بھی پیش کرے۔

جب بیبزر نے کافی ختم کر لی تو وہ کہنے لگی "تم پائپ پیتے ہو؟"

وہ کہنے لگا "ہاں میرے پاس اپنا پائپ موجود ہے۔"

اس کے بعد اس نے اپنی جیب کو ٹٹولنا شروع کیا لیکن وہ اسے کہیں گھر ہی پر بھول آیا تھا، وہ پریشان ہو ہی رہا تھا کہ ڈونیٹ الماری سے اس کے باپ کا پائپ نکال لائی اس نے اسے ہاتھ میں لیتے ہی پہچان لیا۔ سونگھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "کتنا اچھا پائپ ہے" اور تمباکو بھر کر پینے لگا اس کے بعد اس نے ایمیلی کو گھٹنوں پہ بٹھا لیا اور کہنے لگا "آؤ تمہیں گھوڑے پر بٹھاؤں۔ ماں نے میز پوش اٹھایا اور جھوٹے برتن اٹھا اٹھا کر الماری میں رکھنے شروع کر دیئے تاکہ بیبزر کے جانے کے بعد انہیں صاف کر دے۔

تین بج چکے تھے۔ وہ نہایت بے دلی سے اٹھا۔ اس کا یہاں سے جانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

"مادام ڈونیٹ اخدا حافظ! مجھے آپ سے مزید واقفیت حاصل کر کے بہت مسرت ہوئی ہے۔"

ڈونیٹ کے دل پر ایک گہرا اثر ہو رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے شرمائی ہوئی کھڑی تھی، باپ کا خیال آتے ہی اس نے بیٹے کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

ڈونیٹ کہنے لگی، کیا ہم پھر بھی کبھی ایک دوسرے سے ملیں گے؟" بیرز نے جواب دیا "کیوں نہیں، بشرطیکہ تمہیں اس سے کچھ خوشی ہوتی ہو" بیرز "مجھے تم سے مل کر یقیناً خوشی ہو گی، اگلی جمعرات کو ——— اگر تمہارے لئے یہ دن موزوں ہو"

"بہت بہتر مادام ڈونیٹ"

"مجھے امید ہے کہ تم بلا پس و پیش کھانا بھی یہیں سے کھاؤ گے"

"آپ مجھ پر اتنی نوازش کر رہی ہیں کہ میں اپنے آپ میں انکار کی جرأت نہیں پاتا"

"اچھا تو پھر یہ بات پوری طرح طے ہو گئی تاکہ آئندہ جمعرات کا دن بارہ بجے یعنی آج ہی کے دن"

"ہاں مادام ڈونیٹ ——— جمعرات کے دن ——— بارہ بجے"

بیداری

بیداری

اس کی شادی ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ لیکن وہ "وال ڈی سارتے" سے کبھی باہر نہ گئی تھی۔ یہاں اس کے شوہر نے سوت کے کارخانے قائم کر رکھے تھے۔ وہ یہاں نہایت پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور وہ اپنے درختوں میں گھرے ہوئے مکان میں بہت خوش تھی۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ان درختوں کو "قلعہ کی دیواریں" کہتے تھے۔

اگرچہ موسیو ویر عمر میں اپنی بیوی سے بہت بڑا تھا۔ لیکن اس میں یہ خوبی ضرور تھی کہ وہ ایک نہایت ہی مہربان شوہر تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے دل میں کبھی اس سے غداری کرنے کا خیال نہ آیا تھا۔

اس کی ماں وہاں آتی اور ہر موسم گرما سارتے ہی میں بسر کرتی اور پت جھڑ کے آغاز پر موسم گرما گذارنے کے لئے واپس پیرس روانہ ہو جاتی۔

ہر موسم خزاں میں جین کو کھانسی کی شکایت ہو جاتی۔ کیونکہ اس تنگ وادی میں بہتے

ہوئے دریا کے پاٹ پر سال میں پانچ ماہ کہر چھایا رہتا، پہلے پہل تو چراگاہوں پر ہلکی ہلکی دھند کے بادل معلق نظر آتے اور تمام نشیبی علاقہ ایک ایسی جھیل کی طرح معلوم ہونے لگتا جس کی سطح پر مکانوں کی چھتیں نظر آرہی ہوں، پھر سفید سفید بخارات کا ایک مد و جذر دکھائی دینے لگتا اور وادی کوئی طلسماتی وادی معلوم ہونے لگتی جس میں آدمی روحوں کی طرح چلتے جلتے نظر آتے، اور اگر کوئی شخص دوسرے سے دس گز بھی پرے ہوتا تو اس کی شکل دکھائی نہ دیتی درخت دھند میں لپٹے ہوئے نظر آتے اور ان سے لگاتار پانی کے قطرے ٹپکتے رہتے۔

قریب کی پہاڑیوں سے گذرنے والے لوگ جب اس گہری اور اداس وادی پر نظر ڈالتے تو انہیں موسیو دلبر کے کارخانوں کے دُود کش دھند سے باہر نکلے ہوئے دکھائی دیتے دن رات ان میں سے سیاہ دھوئیں کی دو لمبی لمبی قطاریں نکلتی رہتیں۔ وادی کے آباد ہونے کا یہی ایک ثبوت تھا ورنہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام وادی دھنی ہوئی روئی سے ڈھنپی پڑی ہے۔

اس سال جب اکتوبر کا مہینہ آیا۔ تو ڈاکٹروں نے نوجوان عورت کو موسم سرما پیرس میں اپنی ماں کے ساتھ گذارنے کا مشورہ دیا کیونکہ وادی کی آب و ہوا اس کے گرد و سینے کے لئے خطرناک تھی، چنانچہ وہ پیرس چلی گئی، کم و بیش ایک مہینے کے عرصے تک وہ ہر وقت اپنے گھر کے خیالوں میں کھوئی رہتی، وہ اپنے آپ کو ایک ایسے درخت کے مانند محسوس کرتی جو جڑوں سے

اکھیڑ کر کسی دوسری جگہ رکھ دیا گیا ہو، اسے اپنے گھر کا ساز و سامان جو اسے بہت عزیز تھا بھولے سے نہیں بھولتا تھا۔

لیکن وہ رفتہ رفتہ اپنے نئے طرزِ زندگی سے مانوس ہونے لگی۔ نت نئی ضیافتیں، شام کی دعوتیں اور رقص کی محفلیں اب اسے بہت پسند آنے لگیں۔

اس سے پہلے تو اس کے اطوار کچھ لڑکیوں ہی کے سے تھے ــــــــ عاقبت نا اندیش اور کچھ سست سی رہتی تھی اور ناتوانی سے آہستہ آہستہ چلتی تھی، مسکراتی تو اس طرح جیسے کوئی تکان سے چور ہو، لیکن اب وہ زندہ دل اور بیحد مسرور رہنے لگی اور ہر وقت کسی خوشی کے موقع کی منتظر رہتی تھی، اب وہ مردوں کی نمایاں توجہات کا مرکز بن چکی تھی۔ وہ ان کے اظہارِ عشق پر خوش ہوتی اور ان کی عاشقانہ باتیں سن سن کر مذاق اڑا دیتی، کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی اپنا دل نہیں ہار سکتی، بلکہ یوں کہئے کہ وہ تو محبت ہی سے تنگ آچکی تھی، یہ شادی اسے محبت کے اسی انجام کی طرف لے گئی تھی۔

اپنے جسم کو ایسے ایسے وحشیوں کی آغوش میں دے دینے کے خیال سے ایک احساس ترحم کے ساتھ وہ ہنس دیتی اور پھر خیالوں ہی خیالوں میں ان کی پہنچ سے بچ کر پرے ہٹتے ہوئے وہ کانپ کانپ جایا کرتی۔

وہ دل میں سوچتی کہ عورتیں کس طرح غیر مردوں سے اس غیر شریفانہ طریقے پر وابستہ

کرنے پر رضامند ہو جاتی ہیں خصوصاً اس وقت جبکہ انہوں نے اپنے جائز شوہروں سے بھی تعلق قائم رکھا ہوتا ہے اسے اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت ہوتی۔ اگر وہ دونوں دوستوں کی حیثیت سے رہا کرتے اور ان کی محبت پاکیزہ بوسوں ہی تک محدود رہتی ایسے بوسوں تک جو شگفتہ روح کی جان ہوتے ہیں۔

وہ مردوں کی خوشامد کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوتی، جب ان کی آنکھوں میں اسے محبت کی ترغیب دکھائی دیتی تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگتا ــــــ یہ سوچ کر کہ میں تو اس میں حصہ نہیں لے رہی تھی! اگر کسی بڑی شاندار ضیافت سے اُٹھ کر وہ ڈرائنگ روم کو آ رہے ہوتے اور اس کے کانوں میں کسی مرد کے اظہارِ محبت کے لفظ پڑتے تو وہ دل ہی دل میں ایک کیفیت اہتزاز محسوس کرنے لگتی، محبت کے یہ الفاظ اس کی روح کی غذا تھے جو بعض وقت اس قدر آہستہ کہے جاتے کہ اُسے انہیں دل ہی دل میں دہرانے کے لئے تقریباً قیاس آرائی سے کام لینا پڑتا۔ یہ الفاظ نہ تو اس کے دل پہ کوئی اثر ڈالتے، اور نہ ان سے اس کا سرد خون کھولنے لگتا۔ اس کی غیر محسوس عشقیہ طرازیوں نے اس کے دل کو مسرت کی ایک کان بنا رکھا تھا، اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور اس کا دل عشاق کی فدا کاریاں دیکھ دیکھ کر مسرت سے لرز جاتا۔

وہ دعوتوں کے وقت اس نظارہ کی بڑی مشتاق رہتی تھی، جب سدِ عب

حسن سے کسی عاشق کے منہ پر مہرِ سکوت لگ جاتی وہ کچھ ہچکچاتا اور اس کے بعد کانپتے ہوئے گھٹنے ٹیک دیتا۔ اس کے لیے یہ ایک نئی قسم کی بے حد روح افزا خوشی ہوتی کہ ادھر عاشق کا دل خواہشات سے اس قدر مضطرب ہو اور ادھر اس کے دل پر اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہو۔ وہ سر ہلا کر یا ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش سے "نہیں" کہہ دے چپکے سے مکان میں روشنی کرنے کے لئے گھنٹی بجا دے اور اپنے قدموں پر گرے ہوئے عاشق کو خادم کے قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور ایک عجیب کشمش و پیچ میں مبتلا ہو کر غضبناک ہوتے دیکھے، وہ اکثر ایک زہر خند ہنسی ہنسا کرتی ——— ایسی سرد مہری کی ہنسی جس سے عاشق کی اُمیدیں خون خون ہو جائیں۔ وہ ایسی بے مہری کی باتیں کیا کرتی اور اپنے چاہنے والوں کے عجز و انکسار کا کچھ ایسا مضحکہ اڑاتی کہ ان کا دل پس کر رہ جاتا، اس کی آواز میں کچھ ایسی دلکشی اور جاذبیت تھی، کہ اس سے سچی محبت کرنے والا اس پر اپنی زندگی ہی قربان کر ڈالے۔

ان دنوں دو آدمی خصوصاً بہت عرصے سے اس سے اظہارِ محبت کر رہے تھے دونوں کی صورتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، ایک کا نام پال پیرونل تھا۔ اس کا قد لمبا تھا، اور وہ حسن پرست اور عالی ہمت تھا۔ اب تک کئی عورتوں کو اپنے دام فریب میں اسیر کر چکا تھا اور جانتا تھا۔ کہ کس طرح منتظر رہتے ہیں اور کس طرح موقع کو ہاتھ

سے نہیں جانے دیتے۔

دوسرا آدمی موسیوڈی ایوانسلے تھا جب یہ اس کے سامنے آتا تو غبِ حسن سے تھر آجاتا تا اسے اظہارِ محبت کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ ایک سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے رہا کرتا تھا۔ اس کی مسلسل توجہ اور اس کی حیران نگاہیں اس کی محرومی محبت کا صاف صاف اظہار کرتی تھیں۔ وہ اول الذکر کو "شوریدہ سر کپتان" اور موخر الذکر کو "وفادار بھیڑ" کہا کرتی۔ وفادار بھیڑ کو اس نے ایک طرح کا خادم بنا رکھا تھا اور اس سے ایسا سلوک کرتی تھی۔ جیسے وہ اس کا غلام ہو۔

اگر کبھی کوئی اس سے یہ کہتا کہ تم اس سے محبت کرنے لگو گی تو وہ ضرور دل ہی دل میں مسرور ہو جاتی کیونکہ اسے اس سے اس خاص قسم کی محبت ہی کب تھی۔ جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ وہ عرصے سے اس سے مل رہا تھا۔ اس لئے وہ اس کی آواز اس کی حرکات اور اس کے اطوار سے مانوس ہو چکی تھی، اس طرح جیسے کوئی زیادہ ملاقات کرنے والوں سے مانوس سا ہو جاتے۔

خوابوں میں اکثر ہی اس کا چہرہ اس کے سامنے آجاتا وہ اسے بالکل ایسا ہی نظر آتا جیسا وہ درحقیقت تھا ——— نہایت بردبار اور عاجز۔ اس کی ہر حرکت سے اس کی لطافت کا پتہ چلتا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی اضطراب آمیز محبت

کا راز کھل جاتا۔ وہ ایسے کئی کئی خواب دیکھ کر بیدار ہوا کرتی اور اسے یوں معلوم ہوتا، جیسے وہ اب بھی اسی کی آواز سن رہی ہے اور وہ اس کے قریب ہی کھڑا ہے ایک رات جب غالباً اسے بخار ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے جنگل میں تنہا اس کے قریب گھاس پر بیٹھی ہے۔ وہ اس سے نہایت دلفریب باتیں کر رہا ہے اور ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوم رہا ہے وہ اس کے اتنا نزدیک ہے کہ اسے اس کی سانس اور جسم کی حرارت بھی محسوس ہو سکتی تھی۔ وہ بھی نہایت بے تکلفی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

ہم خوابوں میں کچھ اور ہوتے ہیں اور بیداری میں کچھ اور اُسے اپنا دل موسیو ابوانسلے کی محبت سے لبریز معلوم ہونے لگا پر سکون اور غیر فانی محبت سے۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر یا اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ موسیو ابوانسلے کے بازو اس کی گردن میں حائل ہونے لگے اور موسیو نے اس کی آنکھوں اور اس کے رخساروں کو چوما ــــــــ عورت نے مزاحمت کی بالکل کوشش نہ کی اس کے جذبات کچھ مغلوب سے ہو گئے یہ بے انتہا مسرت کا ایک لمحہ تھا جو کبھی انسان کو میسر نہیں ہوتا ــــــــ ایک خیالی لمحہ ہونے کے باوجود ایک سبباتی لمحہ ــــــــ دیوانہ بنا دینے والا لمحہ ــــــــ نہ بھولنے والا لمحہ حقیقی زندگی

میں ایسی مسرتیں کہاں حاصل ہوتی ہیں۔ اسے اپنے جسم کی رگ رگ میں ایک سنسنی سی محسوس ہوئی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور ایسی اُٹھی کہ پھر نہ سو سکی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایوانسلے نے اسے مسحور کر کے اس پر ہر طرح سے قابو پالیا ہے۔

اور اب جب وہ پھر اس سے ملی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے اس وقت مطلق احساس نہ ہوا کہ یہ اضطراب ایوانسلے ہی نے اس کے دل میں پیدا کیا ہے، جب وہ اس سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ تو وہ اپنے دل میں بتدریج گذشتہ ملاپ کا نقشہ دھرا رہی تھی۔ ہم آغوش ہونے کا روح پرور احساس اسے بھولتا ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ ایک عجیب طرح کی محبت ——— لطیف لیکن جذبات پرور اور اس جذبہ محبت کا محرک بھی یہی خواب تھا۔ اگرچہ اسے ان خواہشات کی تکمیل کے خیال سے بھی خوف معلوم ہوتا تھا۔ جو اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھیں

آخر ایوانسلے بھی سب کچھ جان گیا۔ اور جین نے بھی اس سے ہر بات کہ ڈالی۔ یہاں تک کہ اسے بوسوں والا خوفناک خواب بھی سنا دیا۔ اور بعد میں اس سے قسم لے لی۔ کہ وہ اس کا احترام کرے گا۔

موسیو ایوانسلے اپنے قول پر پورا اُترا اور اب وہ اس قسم کی خیالی محبت میں باہم کئی گھنٹے گذارنے لگے اس دوران میں شاید ان کی روحیں ہم آغوش ہونے کے لئے مضطرب

رہتیں اور جب وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے تو ان پر ایک کمزوری ناتوانی اور بخار کی سی کیفیت چھا جاتی۔

بعض اوقات دونوں کے ہونٹ مل جاتے اور وہ ایک لطیف عالم محبت کی سرور آگیں فضا میں عرصے تک کھوئے رہتے۔ آخر عورت کو محسوس ہونے لگا کہ اس سے صبر کا دامن چھوٹ رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایوانسلیے کے جذبات کے آگے مغلوب نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے شوہر کو ایک خط لکھا کہ میں واپس آجانا چاہتی ہوں مجھے اپنی پرُسکون زندگی زیادہ مرغوب ہے۔ لیکن جواب میں اس کے شوہر نے ایک نہایت شفقت آمیز خط لکھا اور اس سے نہایت پرُزور الفاظ میں درخواست کی۔ کہ وہ سردیوں میں نہ آئے۔ آب وہوا کی یکایک تبدیلی اور وادی کی برفانی دھند اس کی صحت پر برُا اثر ڈالے گی۔

یہ جواب پڑھ کر جبین پر بجلی گر پڑی اور وہ اس اعتماد کرنے والے آدمی سے ناراض ہو گئی۔ جو اس کے دل کی پہیلیاں بوجھ نہیں سکتا تھا۔

فروری کا مہینہ گرم اور تابناک تھا۔ اگرچہ وہ حتی الامکان موسیوایوانسلیے سے ملنے سے محترز رہتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ جھٹپٹے میں جھیل کے گرد گاڑی میں بیٹھ کر سیر کرنے کی دعوت منظور کر لیتی۔

ایسی ہی شاموں میں ایک شام سخت گرم آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ختم تک کارس بھی بخارات بنکر اڑا جاتا ہے۔ ان کی نگھی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ اور دھندلکا سا چھا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے تھے اور دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ یکایک وہ چونک اُٹھی اور دل ہی دل میں پکار اُٹھی "لو میرا انجام آپہنچا میں گئی!" اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان اُٹھنے والا ہے۔ اس کے دل میں ایوانسلے سے ہم آغوش ہونے کی بے انتہا خواہش پیدا ہونے لگی۔ اس ہم آغوشی کی جو اسے خواب میں میسر ہوئی تھی۔ ہر لمحہ ان کے ہونٹ ایک دوسرے سے چھونے لگے علیحدہ ہوتے اور فوراً دوبارہ مل جاتے۔

موسیو ایوانسلے نے جرأت نہ کی کہ وہ اس کے مکان میں اُسے اندر تک پہنچانے جائے وہ دروازے ہی پر رخصت ہو گیا۔ آج اس کے دل میں اس کے لئے اتنی محبت تھی جتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تقریباً بے ہوش ہو رہا تھا۔

موسیو پال پیرونل ڈرائنگ روم میں بیٹھا جین کا انتظار کر رہا تھا۔ کمرے میں روشنی بھی نہ تھی اور جب موسیو نے اس سے ہاتھ ملایا تو موسیو کو محسوس ہوا کہ شاید اُسے بخار ہو رہا ہے، وہ اس سے نہایت آہستہ آہستہ ملائمت سے باتیں کہنے لگا۔ اور محبت کے مسحور کن الفاظ سے اس کے تھکے ہوئے دماغ کو فرحت حاصل ہونے لگی

جین بغیر جواب دیے اس کی باتیں سنتی رہی کیونکہ ایوانسلے کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسی کی باتیں سن رہی ہے۔ اور وہ ایک خطا کار کی طرح اس کے آگے جھک گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایوانسلے ہی تھا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ کہ اس وقت دنیا میں کوئی اور بھی ہے۔ یکایک جین نے یہ آواز سنی "مجھے تم سے محبت ہے"۔ اور وہ کانپ گئی۔ اسے یہی معلوم ہوا۔ کہ یہ الفاظ ایوانسلے نے کہے ہیں پال پیرونل نے اس کے ہاتھ چوم لیے اور اس سے بغل گیر ہو گیا جیسے موسیو ایوانسلے کچھ عرصہ قبل اس سے بغل گیر ہوا تھا جین کے خیال میں یہ ایوانسلے ہی تھا۔ جس نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر اسے آغوش میں کھینچ لیا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے لیے اس کا دل انتہائی شدت سے بیتاب ہو رہا تھا۔ جس کے لیے اس کے جسم کا رواں رواں محبت کے جذبات سے بیقرار تھا۔

جب وہ اس خواب سے بیدار ہوئی تو اس کے منہ سے ایک وحشتناک چیخ نکل گئی۔ پال پیرونل اس کے قریب جھکا ہوا نہایت گرم جوشی سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوتے اس کے پریشان بالوں پر متواتر بوسے دے رہا تھا۔ یکایک وہ چیخ اٹھی "ہیں! پرے ہٹو! یہاں سے چلے جاؤ"۔

پال پیرونل کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اور اس نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال لیا

بازو ڈالنا چاہا۔ وہ سمٹ گئی اور پھر چلا اُٹھی ۔

"ملعون! اپاہج! مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ چلا جا یہاں سے چلا جا۔"

پال پیرونل سخت حیران ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ہیٹ اُٹھا کر چل دیا۔

دوسرے ہی دن وہ دال ڈی سائر سے واپس چلی گئی۔ اس کا شوہر جسے اس کے آنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ اُس کی جلد بازی کا گلہ کرنے لگا۔

وہ کہنے لگی "میں اس سے زیادہ عرصہ تم سے جدا نہ رہ سکتی تھی۔"

اس کے شوہر نے محسوس کیا کہ اس کے طور ہی بدل چکے ہیں اور وہ کچھ غمگین سی ہو گئی ہے۔ اور جب اس نے اس سے پوچھا کہ "تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اداس نظر آ رہی ہو۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے" تو وہ کہنے لگی "نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیئے اور پھر دیر بعد بولی "اس دنیا میں خوشی صرف خوابوں ہی میں میسّر ہوتی ہے"

دوسرے موسم گرما میں ایوانسیلے جین سے ملنے آیا۔ وہ اس سے ملی لیکن بغیر کسی جذبۂ شوق کے اظہار کے۔ جین کی آنکھوں میں پہلے کی طرح اب اس کے لئے کوئی حسرت نہ تھی کیونکہ یکایک اس پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ اس نے کبھی موسیو ایوانسیلے سے محبت کی ہی نہ تھی۔ سوائے ایک خواب کے دوران کے جس سے پال پیرونل نے اسے نہایت وحشیانہ طریقے سے بیدار کر دیا تھا۔

لیکن موسیو ایوانسلے جسے اب بھی اس سے محبّت تھی دل میں یہ خیال کر کے واپس پیرس چلا گیا کہ اصل میں عورتیں ہوتی ہی عجیب و غریب ہیں ——— ایک معمّا ——— ایک گورکھ دھندا *
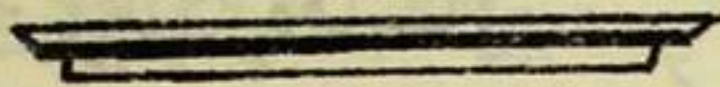
دیوانہ

دیوانہ

میں دیوانہ ہوں یا حاسد؟ نہ جانے کیا ہوں۔ مجھے ایک وحشت کا احساس کھائے جا رہا ہے۔ میں ایک گناہ کا مرتکب ہوا ہوں ——— ایک زبردست گناہ کا یہ سچ ہے، لیکن کیا مجنونانہ رقابت اور جذباتی محبّت ——— جس سے انسان مجرم ہو چکا ہو ——— اور وہ خوفناک عذاب جو میں سہ رہا ہوں کسی بالکل بے گناہ انسان کو گناہگار بنانے کے لئے کافی نہیں؟

آہ میں نے کسقدر عذاب برداشت کیا ہے! ——— ایک مسلسل عذاب خوفناک اور دردانگیز میں اس عورت سے دیوانہ وار محبت کرتا رہا ہوں۔ اور کیا پھر بھی یہ سچ ہے؟ کیا مجھے اس سے محبّت تھی؟ نہیں نہیں۔ وہ میرے جسم اور میری روح کی مالکہ تھی۔ میں اسکے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ اور اب بھی بنا ہوا ہوں۔ مجھ پر اس کی مسکراہٹ اس کی نگاہوں اور اُس کے پُر عظمت جسم کی حکمرانی تھی۔ میں اس کے سحر آفرین سراپا کے اثرات کا مقابلہ کرتا رہا ہوں لیکن اس جسم میں جو "عورت" چھپی تھی۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور اسے حقارت کی نظر سے

دیکھتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس سے نفرت کی ہے۔ اسے حقارت کی نظر سے دیکھا ہے اور اسے بددعائیں دیتا رہا ہوں۔ کیونکہ وہ ایک فاجر بے وفا حیوان خصلت اور ناپاک مخلوق تھی ——————— ایک دغاباز غدار اور شہوت پرست بے روح جانور وہ ایک انسان نما جانور تھی۔ بلکہ کوئی اس سے بھی زیادہ ذلیل چیز خوشنما گوشت پوست کا ایک ہیولے جس کی رگ رگ میں خون کی جگہ گناہ گردش کر رہا ہو:۔

عہد وصال کے پہلے چند ماہ میں ہم عیش و عشرت کے ایک شیریں نشے میں کھوئے رہے۔ اس کی ہم آغوشی میں اَن گنت خواہشات کی دیوانہ وار شدّت مجھ پر ناتوانی کی کیفیت طاری کر دیتی۔ اس کی آنکھیں میرے ہونٹوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتیں جیسے بھی میری پیاس بجھا دیں گی۔ نصف النہار کو ان کا رنگ بھورا ہوتا شفق کے وقت گہرا سبز اور سورج نکلتے وقت نیلا۔ میں دیوانہ نہیں ہوں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کی آنکھیں انہیں تین رنگوں کی تھیں۔ محبت کے لمحوں میں انکا رنگ نیلا ہوتا اور وہ کچھ اس طرح دھندلی نظر آتیں جیسے انہیں مسل دیا گیا ہو اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں۔ اور ان میں ایک ناتوانی کی جھلک دکھائی دیتی اس کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ اور اسکی نم آلود زبان کی باریک نوک سانپ کی زبان کی طرح جنبش کرتی نظر آتی۔ اس کے بوجھل پپوٹے آہستہ سے اوپر کو اٹھتے اور مجھ پر

اس کی ایک ایسی ملامت آمیز خونخوار نگاہ پڑتی کہ میں دیوانہ ہوجاتا جب میں اس سے ہم آغوش ہوا کرتا تو میں کانپتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا میرے دل میں بے پناہ خواہش پیدا ہوتی۔ کہ اس پر پوری طرح سے تسلط پالوں۔ اور اُس بدروح کو مار ڈالوں۔

جب وہ چل کر کمرے کے اس پار جایا کرتی تو اس کے قدموں کی ہر چاپ میرے دل میں گونجتی وہ اپنا لباس اتارتی تو وہ اس کے جسم سے نیچے گر جاتا۔ اور مجھے اس کا گناہ آلود مرمریں سراپا نظر آنے لگتا جس سے میرے ایک ایک عضو میں میری ٹانگوں میں میرے بازوؤں میں اور میرے جذبات سے بھرے ہوئے سینے میں مجھے ایک کمزوری اور خوف کا احساس ہونے لگتا۔

ایک دن جب میں سو کر اٹھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا جی مجھ سے بھر چکا ہے۔ مجھے یہ احساس اس کی آنکھوں نے دلایا۔ ہر صبح اس پر جھک کر میں اس کی پہلی مخصوص نگاہ کا منتظر رہتا تھا میرے دل میں اس سوئی ہوئی وحشی عورت کے لئے جس کا میں غلام تھا نفرت اور اہانت کے جذبات ہوتے تھے اور یہی جذبات دل میں لے کر میں اس نگاہ کا منتظر رہتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی دھندلی شفاف اور نیلی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیتی اور مجھ پر ایک نئی طرز لوا سے تھکی ہوئی ایک ناتوان نگاہ ڈالتی تو یکایک میرے سینے کو ایک ان دیکھی

آگ کھلنے لگتی - اور میری خواہشات اور بھی زیادہ بھڑک اٹھتیں -

جب اس دن اس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے مجھ پر ایک نہایت پھیکی سی اور بے غرضانہ نگاہ ڈالی - ایک ایسی نگاہ جس میں کوئی ارمان نہ ہو میں نے اسی وقت جان لیا - کہ اب اس کا جی مجھ سے بھر چکا ہے - اور وہ مجھ سے تنگ آگئی ہے - میں نے فوراً دیکھ لیا جان لیا محسوس کر لیا اور سمجھ لیا - کہ اب سب باتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے - اور ہر گھنٹہ ہر منٹ مجھ پر ثابت ہونے لگا کہ میرا قیاس صحیح ہے - ایک صبح جب میں نے اس کی طرف اپنے بازو بڑھائے اور ہونٹ اس کے قریب لے گیا - تو وہ سمٹ کر پرے ہٹ گئی

کہنے لگی "مجھے تنہا رہنے دو - مجھے تم سے خوف آرہا ہے! کیا تم کبھی مجھے تنہا نہیں رہنے دو گے؟"

اس کے بعد میرے دل میں ایک رقابت پیدا ہو گئی ——— مکاری بدگمانی اور اخفا سے ملی جلی رقابت ——— بالکل ایک کُتّے کی سی - میں جانتا تھا کہ وہ پھر "بیدار" ہو جائیگی - اور اب کوئی دوسرا آدمی اس کی خواہشات کو بیدار کرے گا

میرے دل میں ایک خبط آمیز رقابت پیدا ہو گئی لیکن میں خبطی نہیں - نہیں ہرگز نہیں میں نے اسے غور سے دیکھا اور انتظار بھی کیا ——— اس لئے نہیں کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی تھی - لیکن اب بھی وہ سرد مہر اور بے پرواہ تھی -

اب وہ اکثر کہا کرتی :۔

"مجھے مردوں سے نفرت ہے"! افسوس یہ بات بالکل سچ نکلی۔

اب مجھے اس کے وجود اس کی بے پروائی اس کی ننہاراتوں اس کے افعال اور اس کے خیالات سے رقابت ہونے لگی۔ میں جانتا تھا کہ اس کی ہر حرکت گناہ آلود ہے۔ اور جب کبھی وہ ان ناتواں نگاہوں کے ساتھ بیدار ہوتی جو ہماری پرشوق راتوں کا پیش خیمہ ہوتی تھیں ــــــــــ اس انداز سے جیسے اس کے دل میں کوئی زبردست خواہش لبس رہی ہے۔ اور اس کے جذبات میں ایک تلاطم برپا ہو گیا ہے۔ تو مارے غصّے کے میرا دم گھٹنے لگتا۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ لوں۔ اس کی تکا بوٹی کر ڈالوں اور دبوچ کر اس سے اس کے تمام حیا سوز راز پوچھ لوں۔ اور ہر بات کا اقرار کرا لوں۔

کیا میں غلطی پر ہوں؟ نہیں! نہیں!!

ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ خوش نظر آرہی ہے میں نے محسوس کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس پر اب کسی نئی اُمنگ نے غلبہ پا لیا ہے۔ وہ کانپ رہی تھی، اس کی حالت بالکل ویسے تھی، جیسے مجھ سے محبت کرنے کے بعد ہوا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اس کے سراپا سے مجھے خواہشات کی دبی

بُو آرہی تھی جو مجھے دیوانہ بنا دیا کرتی تھی۔ میں بظاہر انجان بنا رہا۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بغور مشاہدہ بھی کرتا رہا۔ اب کے مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

میں نے ایک ہفتہ، ایک مہینہ بلکہ تقریباً ایک سال تک انتظار کیا۔ وہ خوش تھی اور ایک ناقابل بیان جذبۂ اشتیاق میں سرشار رہتی تھی۔ اس کی روح کو کسی غیر فطری چیز کی محبت تسکین دے رہی تھی۔ آخر کار میں سب بات سمجھ گیا۔ نہیں مجھے جنون نہیں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اُف! میں کس طرح ایک اس قدر خوفناک اور خلاف توقع چیز کی تشریح کروں؟ میں کس طرح اسے سمجھوں؟ اس خوفناک حقیقت کا مجھ پہ یوں انکشاف ہوا۔

وہ ایک رات دور تک گھوڑے پر سیر کر کے واپس آئی اور ایک جگہ میرے سامنے تکان سے بیجان ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے رخساروں میں ایک قدرتی سرخ رنگ جھلک رہا تھا۔ اس کے سینے میں زور زور سے سانس آنے کی وجہ سے ایک تموج کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اور آنکھیں سوج گئی تھیں۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ میں اسے پہلے بھی اس حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ محبت کر کے آئی تھی! میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ تاکہ وہ مجھے نظر نہ آئے۔ ایک خدمتگار گھوڑے کو اصطبل میں لے جا رہا تھا۔ وہ بھی کھڑی ہو کر گھورتے ہوئے خشم آلود

جانور کو اصطبل میں غائب ہوتے دیکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ فوراً سو گئی۔ میں تمام رات سوچتا رہا میرا دماغ ناقابلِ حل گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا۔ کون ایک جذبات پرست گمراہ عورت کے وہموں کی عمیق ترین گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے، کون ان کے خارج از قیاس اوہام سے تسکین حاصل کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقوں کے جاننے کا گمان تک کر سکتا ہے؟

ہر صبح سورج نکلتے ہی وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیتوں جنگلوں اور دروں میں پھرنے چلی جاتی۔ اور ہر بار ناتواں ہو کر واپس آتی۔ جیسے محبت نے اس کی طاقت سلب کر لی ہو۔ آخر کار میں سب بات سمجھ گیا۔ یہ گھوڑا ہی تھا جس سے مجھے رقابت تھی۔ اسکے چہرے کو پیار کرتی ہوئی ہوا اس کے منہ کو چھوتے ہوئے پتے اور پتوں میں سے گذر کر اس کی پیشانی کو چومتی ہوئی سورج کی کرنیں اور جس زین پر وہ سوار ہوتی تھی اور اس کا لمس چرایا کرتی تھی یہ سب میرے لئے باعثِ رقابت تھیں یہی سب چیزیں تھیں جنہوں نے اسے مسرور بنا رکھا تھا۔ انہیں سے وہ اس قدر تسکین حاصل کر کے واپس آتی تھی یہی چیزیں اس کی طاقت سلب کر لیتی تھیں میں نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اور میں بہت ہوشیار رہنے لگا۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آتی تو میں خود اسے نیچے اتارتا۔ گھوڑا نہایت سرکشی سے میری طرف دوڑ کر بڑھتا۔ وہ اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتی۔ اور اس کے کانپتے

ہوئے نتھنوں کو چوم لیتی اس کے بعد اپنے ہونٹوں کو صاف بھی نہ کرتی۔ اس کے جسم سے ایک گرم گرم خوشبو آتی جیسے وہ بستر سے اٹھ کر آئی ہے۔ اور اس خوشبو میں گھوڑے کے جسم کی تیز بو کی ملاوٹ بھی ہوتی تھی۔

میں موقع کا منتظر رہا ہر صبح وہ بید کے درختوں کے جنگل میں ایک ہی راستے سے جایا کرتی تھی۔ جو ایک وسیع گھنے جنگل میں پہنچ کر غائب ہو جاتا تھا۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ہی اٹھ بیٹھا۔ اپنے سینے کے قریب ایک پستول چھپا لیا اور ایک رسّا لے کر جنگل کی طرف چل دیا جیسے مجھے اپنے رقیب سے جنگ کرنی ہو میں اس راستے تک جا پہنچا جس راستے سے اسے محبت تھی۔ میں نے راستے کے آرپار رسّا پھیلا کر اسے دو درختوں سے باندھ دیا۔ اور خود گھاس میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

میرے کان زمین سے لگے تھے۔ لیکن میں نے اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن لی۔ پھر میں نے درختوں میں سے جو ایک قوس کی شکل بنا کر اُگے تھے دیکھا کہ وہ گھوڑا بگٹٹ بھگائے چلی آ رہی ہے۔ اس کے رخسار سرخ ہو رہے تھے اور اسکی نگاہوں میں ایک دیوانہ پن تھا۔ اسے بیحد مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کسی نئی ہی دنیا میں آ گئی ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا تیزی سے گھوڑا چلانے کی وجہ سے اُسے مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

جانور کی اگلی ٹانگیں رسّے سے الجھ گئیں اور وہ گر پڑا میں نے اس عورت کو بازوؤں میں اٹھا لیا کیونکہ میں ایک بیل کو بھی اٹھا سکتا ہوں پھر میں گھوڑے کے قریب پہنچا جو ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور جب اس نے مجھے دوبارہ کاٹنے کی کوشش کی تو میں نے اپنا پستول اس کے کان کے نزدیک لے جا کر داغ دیا۔۔۔۔

۔۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے میں کسی آدمی کو ماروں۔

وہ میری طرف مڑی اور اس نے میرے منہ پر انتہائی زور سے گھوڑے کے چابک کی دو ضربیں لگا دیں۔ میں نیچے گر پڑا۔ اور جب وہ دوبارہ میری طرف لپک کر بڑھی تو میں نے اسے بھی گولی سے اڑا دیا!

تمہیں بتاؤ! بتاؤ!! کیا میں دیوانہ ہوں؟

مخلص دوست

مخلص دوست

ایک دن صبح ہی صبح بوڑھے پن چوہے نے اپنے بل سے سر نکالا۔ اسکی چمکدار آنکھیں موتیوں کی سی تھیں اور مونچھیں بھورے رنگ کی اور سخت سخت، اور دُم ایسی جیسے کالے ربڑ کا لمبا سا ٹکڑا ہو۔ بطخوں کے چھوٹے چھوٹے بچے جھیل میں ادھر اُدھر تیر رہے تھے اور دُور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جزائر کینری کی گانے والی سنہری چڑیوں کا کوئی جھنڈ ہے۔ سفید سفید پروں اور سرخ سرخ ٹانگوں والی ماں انہیں پانی میں سر کے بل کھڑے ہونے کی مشق کرا رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار سبق دیتی اور ساتھ ساتھ یہ فقرہ دہرائے جاتی "یاد رکھو جب تک پانی میں سر کے بل کھڑے ہونا سیکھ نہ لوگے تمھارا شمار اعلیٰ طبقے میں کبھی نہیں ہو سکے گا"۔ لیکن بچے کوئی توجہ نہ دیتے۔ وہ بہت ہی چھوٹے ننھے۔ کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ سوچتے کہ بھلا اعلیٰ طبقے میں شمار ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بوڑھا پن چوہا گرج کر کہنے لگا "کیسے سرکش بچے ہیں! ڈبو دو انہیں! یہ اسی قابل ہیں!!"

بطخ سہم کر کہنے لگی "ہائے! ایسا نہ کہو۔ شروع میں ہر ایک سے یہی ہوتا ہے۔

تم کیا جانو۔ ماں باپ کے صبر کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے"؟

پن چوہا بولا" آہ۔ بھلا میں ماں باپ کے احساسات کیا جانوں۔ میں گرہستی آدمی ہی نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو کبھی پہلے ہی میری شادی ہوئی ہے اور نہ اب ہی اس کا ارادہ ہے۔ محبت!..... کافی اچھی چیز ہے، لیکن اپنی جگہ پر۔ دوستی!؟ دوستی کا رتبہ بلند تر ہے! سچ کہتا ہوں کہ دنیا میں ایک مخلص دوست سے زیادہ کمیاب اور نجیب تر کوئی چیز نہیں"۔

ایک سبز چڑیا نے جو قریب ہی بید مجنوں پر بیٹھی تھی کہیں یہ باتیں سُن لیں اور کہنے لگی" براہِ مہربانی یہ تو بتائیے کہ دو مخلص دوستوں پر فرائض کیا کیا عائد ہوتے ہیں؟"

بطخ بول اُٹھی" ہاں ہاں میں بھی یہ جاننا چاہتی تھی"...... اور پھر تیرتی ہوئی جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ کر اپنے بچوں کو مثال کے ذریعے اچھی طرح سمجھانے کے لیے خود پانی میں سر کے بل کھڑی ہو گئی

پن چوہا چلا کر کہنے لگا" کیسا فضول سوال کرتی ہو!...... " اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولا" بیشک مجھے اپنے مخلص دوست سے یہی توقع ہو گی کہ وہ میرا وفادار رہے اور کیا!؟"

ننھی چڑیا ایک نرم سی شاخ پر جھولا جھولتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے نازک پر پھٹپھٹا کر کہنے لگی۔" پر اس کے بدلے تم! کیا کرو گے؟ تم!؟"

پن چوہا کہنے لگا" میں نہیں سمجھا!"

"اچھا تمہیں اس موضوع پر ایک افسانہ سُناتی ہوں"۔

"کیا افسانہ میرے متعلق ہے؟ اگر ہے تو سُن لونگا کیونکہ مجھے افسانوں سے بہت دلچسپی ہے"۔

چڑیا کہنے لگی۔"ہاں یہ تمہیں پر صادق آئے گا" اور وہ درخت سے نیچے اُڑ کر آئی اور کنارے پر بیٹھ کر اس نے مخلص دوست کی کہانی شروع کی۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے۔کہ دُنیا میں ایک آدمی رہا کرتا تھا، نہایت ہی دیانتدار رفیق اور چھوٹا سا ہنس نامی"۔

پن چوہا بات کاٹ کر کہنے لگا" کیا اس کی ہر بات نرالی ہوتی تھی؟"

چڑیا کہنے لگی" نہیں وہ صرف اسی بات میں نرالا تھا کہ اسکے گول گول چہرے سے ظرافت ٹپکتی تھی اور وہ بڑا رحمدل اور ہنس مکھ تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بالکل تنہا رہا کرتا، اور ہر روز اپنے باغ میں کام کیا کرتا تھا ارد گرد کی تمام بستیوں میں کوئی باغ اتنا خوش نما نہیں تھا جتنا کہ ننھے ہنس کا۔ اس کے باغ میں جا بجا دمشق کا گُلاب کھلا تھا۔ کہیں نرگس تھی کہیں یاسمین اور کہیں گل داؤدی۔ گُلِ صد برگ نے تمام باغ کے ارد گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور گیندے کے زرد زرد پھولوں نے تو تمام زمین زرد ہی کر رکھی تھی۔ موتیا کے پودوں میں اس قدر پھول آ رہے تھے کہ پتہ تو کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔

سورج مکھی کے پھول کی سمت گردش آفتاب کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگتی اور وہاں اس قسم کے ہزاروں پھول تھے۔ جب ایک قسم کے پھولوں کا موسم ختم ہو جاتا تو دوسرے پھولوں کی بہار آجاتی اور جوں جوں مہینے گذرتے باغ میں رنگ رنگ کے پھول آنے لگتے۔ غرضکہ وہاں ہر طرف آنکھ کے لیے حسن اور دماغ کے لئے بھینی بھینی خوشبوئیں موجود تھیں۔

یوں تو ننھے ہنس کے اور بھی کئی دوست تھے لیکن سب سے زیادہ مخلص دوست ایک چوڑا چکلا اور گرانڈیل پنسہارا تھا۔ اس کا نام ہوگ تھا اور وہ بڑا امیر تھا اور ہنس کا اتنا عزیز دوست تھا کہ اس کے باغ کی دیوار پر سے جھک کر بڑا سا گلدستہ یا کوئی میٹھی بوٹی یا اگر پھل کا موسم ہوتا تو آلوچوں یا شاہدانوں سے اپنی جیبیں بھرے بغیر کبھی نہ جاتا۔

ہوگ کہا کرتا "مخلص دوستوں کی ہر چیز مشترک ہوا کرتی ہے" اور ننھا ہنس جواب میں سر ہلا کر مسکرا دیتا اور یہ سوچ کر دل ہی دل میں نازاں ہوتا کہ میں نے کیا ہی اچھا دوست بنایا ہے جس کے خیالات اس قدر شریفانہ ہیں۔

بعض اوقات پڑوسی یہ دیکھ کر ضرور حیران ہوا کرتے کہ امیر پنسہارا بدلے میں ہنس کو کیوں کوئی چیز نہیں دیتا، حالانکہ اس نے اپنی چکی کے کمرے میں آٹے کی سو بوریاں جمع کر رکھی ہیں اس کے علاوہ اس کے پاس چھ دودھیل گائیں اور

امنی بھیڑوں کا ایک بڑا سا گلہ بھی ہے۔ لیکن ہنس نے کبھی ایسی فضول باتیں سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات تھی ہی کیا کہ وہ ان تمام عجیب و غریب باتوں کو نہایت توجہ سے سنا کرے جو پسنہار اپچی اور بے غرض دوستی کے متعلق اُسے سنایا کرتا۔

ننھے ہنس نے اپنے باغ میں کام شروع کردیا تھا۔ موسم گرما اور بہار و خزاں کا زمانہ تو خوشی خوشی گذر گیا، لیکن جب موسم سرما آگیا اور اس کے پاس منڈی کو لے جانے کے لئے نہ کوئی پھول رہا نہ پھل تو سردی اور بھوک دونوں نے مل کر اُسے بہت ستایا اکثر وہ شام کا کھانا کھائے بغیر ہی صرف دو تین سوکھی ہوئی انجیریں یا کوئی اور خشک میوہ کھا کر سو رہتا۔ یہ بات تو ایک طرف رہی سردیوں میں وہ بالکل تنہا بھی رہ جاتا کیونکہ پسنہار اپھر کبھی اس سے ملنے نہ آتا۔

وہ اپنی بیوی سے کہا کرتا۔ "برفبار موسم میں ننھے ہنس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب کوئی تکلیف میں ہو تو اُسے سب کچھ اکیلے ہی چپ چاپ برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے روز روز مہمان بن کر جانا اور ناحق کسی کو تنگ کرنا! فائدہ کیا؟ دوستی کے متعلق کم از کم میرا نظریہ تو یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہے بھی بالکل درست۔ لہٰذا بہار سے پہلے تو میں وہاں کسی طرح جانے کے لئے تیار نہیں۔ بہار آلینے دو۔ تب جاؤنگا۔ اس وقت وہ بیچارہ مجھے ایک بڑی سی بسنتی پھولوں کی ٹوکری دے کر ذرا خوش

ہو جائے گا۔ میں تو اس کی خوشی چاہتا ہوں"۔

اس کی بیوی اپنی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے، صنوبر کی خشک شاخوں کی آگ تاپتے ہوئے جواب دیتی "اُف! اتنی بے غرض محبت! ؟ دوستی کے متعلق تم نے کیسے اچھے اصول بنا رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خود پادری بھی ایسی اچھی باتیں جیسی تمہاری ہیں کبھی نہ کر سکے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُسے تو رہنے کیلئے تین منزلوں کا مکان میسر ہے اور ہمیں نہیں۔ وہ چھنگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنتا ہے اور تمہاری کوئی بھی نہیں"۔

پنہارے کا چھوٹا لڑکا کہنے لگا۔ "ابا! ایک بہت اچھی بات سوچی ہے۔ ... کیا ہم ننھے ہنس کو یہاں نہیں بلا سکتے اگر اس بیچارے کو مصیبتیں پڑی ہیں تو اُسے یہیں بلا لو۔ میں اپنی آدھی ربڑی اُسے دیدیا کرونگا اور اُسے اپنے سفید سفید خرگوش دکھایا کروں گا۔ اچھی اماں! تم بہت اچھی ہو! اُسے ضرور بلا لو میرا دل اس کے لیئے بہت اُداس ہو رہا ہے"۔

پنہارا غصے سے گرج کر کہنے لگا "تو! تو تو ہے ہی بڑا نادان! معلوم نہیں تجھے سکول بھیج بھیج کر ہمیں کیا فائدہ ہوا۔ تو نے وہاں سے کچھ نہ سیکھا ... فرض کرو خدانخواستہ ننھے ہنس کو یہاں بلا بھی لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ آکر ہمارا سب کچھ دیکھ لے گا۔ وہ ضرور دل میں سوچے گا۔ دیکھو یہ تو آگ بھی تاپ رہے ہیں کھانا بھی اچھا کھاتے ہیں۔ سُرخ شراب کا بڑا سا مٹکا بھی موجود ہے۔ غرضکہ وہ ہم سے حسد کرنے لگ

جائیگا اور حسد!؟ جانتے ہو کیسی چیز ہے؟ وہ چیز ہے جو فطرت کا ستیاناس کر ڈالے میں کبھی ننھے ہنس کی فطرت خراب نہ ہونے دونگا کیونکہ میں اس کا بہترین دوست ہوں میں ہمیشہ خیال رکھوں گا کہ کہیں وہ طمع اور حرص کے جال میں نہ پھنس جائے۔ بالفرض وہ یہاں آ بھی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ سے کچھ آٹا اُدھار مانگے اور ادھار کے تو میں پاس بھی نہ پھٹکوں۔ دوست اور چیز ہے اور آٹا اور چیز، انہیں خلط ملط نہیں ہونا چاہیئے لفظوں ہی کی مثال لے لو ہر لفظ کے علیحدہ ہجے اور علیحدہ معنی ہوتے ہیں۔ بس اس مختصر سی مثال سے آگے سب اندازہ لگا لو اور یہ تو عام باتیں ہیں ہر کوئی انہیں جانتا ہے"۔

پنہارے کی بیوی جو کی شراب کا ایک بڑا سا گلاس غٹا غٹ چڑھاتے ہوئے بولی "بخدا کیسی اچھی باتیں کرتے ہو۔ لطف آجاتا ہے۔ میں تو سچ مچ اُونگھ ہی گئی تھی بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گرجے میں بیٹھ کر وعظ سن رہی ہوں"۔

پنہارا کہنے لگا "بات دراصل یہ ہے کہ کام تو ہر ایک آدمی برا بھلا کر ہی سکتا ہے لیکن ایسے آدمی دُنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں جو گفتگو بھی اچھی جانیں ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں گفتگو بہت زیادہ مشکل چیز ہے اور عمدہ بھی" ان الفاظ کے خاتمہ پر اس کی درشت نگاہیں میز کی دوسری طرف اپنی چھوٹے بیٹے پر جم گئیں جس نے شرم کے مارے گردن جھکا لی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جب اُس سے کچھ اور بن نہ آیا تو وہ "چائے دو، چائے بھی دو" ہی پکارنے لگا۔ خیر اس کا کیا ہے وہ تو اتنا چھوٹا

کہ اس پر کوئی گلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

جب کہانی یہاں تک پہنچی تو پن چوہا کہنے لگا۔"بس کہانی ختم؟"

سبز چڑیا کہنے لگی"نہیں ہرگز نہیں ابھی تو شروع ہی ہے"۔

پن چوہا کہنے لگا"اچھا پھر سُن لو کہ تم زمانے سے بہت پیچھے رہ گئی ہو۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ آج کل کا ہر اچھا افسانہ گو پہلے کہانی کا انجام بتاتا ہے۔ پھر آغاز کی طرف آتا ہے اور سب سے آخر اس کا درمیانی حصہ بیان کرتا ہے۔ یہ نیا فیشن ہے یہ سب باتیں کل میں نے ایک نقاد کی زبانی سُنی تھیں جو جھیل کے گرد ایک نوجوان کے ساتھ چکر لگا رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی موضوع پر بحث کرتا رہا اور مجھے اس کی باتیں بالکل درست معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس نے ایک نیلی عینک لگا رکھی تھی اور زیادہ کتابیں پڑھنے سے اس کے سر کے بال تک اُڑ چکے تھے۔ اور جب بھی نوجوان کوئی بات کہتا تو وہ پکار اُٹھتا۔"اونہہ لغو!... اچھا مہربانی کر کے تم اپنی کہانی شروع کرو۔ مجھے وہ پنہارا بہت ہی پسند ہے۔ خود مجھ میں بھی تمام لطیف حسیات موجود ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں میں گہری ہمدردی ہونا قدرتی بات ہے"۔

چڑیا پہلے ایک ٹانگ پر اور پھر دوسری پر پھدک کر کہنے لگی"اچھا سنو۔ جب جاڑا ختم ہوا اور زرد گلاب نے کھل کھل کر ستاروں کی شکل اختیار کرنی شروع کی تو ایک دن وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا" تو میں ننھے ہنس سے ملنے چلا ہوں"۔

بیوی کہنے لگی "ہیں؟ چلے ہو؟ بڑے رحمدل ہو! ہمیشہ اوروں ہی کا خیال رکھتے ہو۔ ہاں ساتھ پھولوں کے لیئے بڑی ٹوکری لیتے جانا۔ بھولنا مت"۔

پس پنہارے نے لوہے کی ایک بڑی مضبوط زنجیر سے پن چکی کے بادبان اکٹھے کر کے باندھ دیئے اور اپنے بازو میں ٹوکری لٹکائے پہاڑ سے نیچے اترا اور ہنس کے پاس جا کر کہنے لگا۔ "ہنس جی سلام! اچھے تو ہو؟" ہنس بیلچہ ہاتھ میں لیئے سر جھکائے کسی کام میں مصروف تھا۔ اُسے دیکھتے ہی باغ باغ ہو گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "آئیے! آئیے! آئیے!

"کہو ہنس جاڑے کا موسم کیسے گذرا؟"

"خوب گذرا . . . . تم بہت اچھے ہو جو میرا حال پوچھتے ہو۔ مجھ پر بڑا سخت وقت آیا تھا۔ خیر گذر گیا۔ اب تو بہار آگئی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔ میرے پھول بھی خوش ہیں"۔

پنہارا کہنے لگا۔ "ہنس جی ہم موسم سرما میں اکثر تمہاری ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم حیران ہوا کرتے کہ معلوم نہیں تمہارا کیا حال ہو گا"۔

ہنس نے جواب دیا "تمہاری مہربانی۔ مجھے تو کچھ کچھ شک ہو چلا تھا کہ کہیں تم مجھے بھول تو نہیں گئے"۔

پنہارا کہنے لگا ہنس تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ "دوستی" اور "بھول" دو متضاد

چیزیں ہیں یہی تو "دوستی" کی عجیب و غریب خاصیت ہے۔ شاید تم زندگی کی شاعرانہ باتوں سے واقف نہیں ہو اور ہاں بھئی ذرا سُننا دیکھو تو تمہارے گلاب کے پھُول کس قدر من موہنے نظر آ رہے ہیں!"

ہنس کہنے لگا۔ "ہاں واقعی یہ بہُت خوبصورت ہیں اور میرے لِئے سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات تو یہ ہے کہ ہیں بھی کافی۔ اب اِنہیں منڈی میں لے جا کر مجسٹریٹ کی لڑکی کے پاس فروخت کرُونگا اور پھر اُن روپوں کی ایک پہیئے کی ہاتھ گاڑی پھر سے خرید لُوں گا۔"

ہوگ کہنے لگا۔ "پھر سے خرید لُوں گا؟ کیا مطلب؟ کیا تم نے پہلی ہاتھ گاڑی کو بیچ ڈالا تھا؟ بڑی بے وقوفی کی۔"

نہیں بات دراصل یُوں تھی کہ اسے بیچ ڈالنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا جانتے ہو نا کہ موسم سرما میرے لِئے بڑا سخت وقت تھا۔ یقین ماننا میرے پاس روٹی خریدنے کے لِئے بالکل کوئی پیسہ نہیں رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اتوار کو پہننے والے کوٹ کے نقرئی بٹن اُتار کر بیچ ڈالے پھر چاندی کی زنجیر، پھر اپنا حقہ اور آخر کار ہاتھ گاڑی بھی بک گئی۔ لیکن اب تو میں ان سب کو واپس خریدنے ہی والا ہوں۔"

پسنہارا کہنے لگا۔ "ہنس میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالوں۔ اس کی کچھ بہت زیادہ مرمت نہ ہو گی۔ ایک طرف تو یقیناً ناکارہ ہو چکی ہے۔ لیکن پہیئے کے

اُرے کچھ ہی خراب ہیں۔ پھر بھی میں تمہیں وہ دے دُونگا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں بڑی
فیاضی سے کام لے رہا ہوں اور بہت سے لوگ مجھے بیوقوف بھی سمجھیں گے کہ میں نے
کیوں یہ خواہ مخواہ تمہیں دے دی لیکن میں دُنیا کے اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں میرے
خیال میں "فیاضی" ہی دوستی کی رُوح ہے۔ علاوہ ازیں میرے پاس ایک نئی ہاتھ گاڑی
بھی موجود ہے۔ مطمئن رہو کہ میں تمہیں اپنی گاڑی دے دُونگا"۔

ہنس کا گول گول مسرور چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا اور وہ کہنے لگا "اچھا؟ واقعی
تم بہت فیاضی سے کام لے رہے ہو۔ میں بڑی آسانی سے اس کی مرمت کرا سکوں گا۔
گھر ہی میں لکڑی کا ایک تختہ پڑا ہے"۔

پنہارا کہنے لگا "لکڑی کا تختہ؟ مجھے اپنے مکان کی چھت کی مرمت کیلئے ایسی
کی ضرورت تھی۔ چھت میں بڑا سا سوراخ ہو گیا ہے۔ اگر میں نے ابھی سے اسے
بند نہ کر لیا تو تمام غلے کو نم آجائے گا۔ خوب موقع پر تم نے اس کا ذکر کر دیا ہے۔ کیسی
عجیب بات ہے کہ ایک اچھا کام کرنے سے دُوسرا اچھا کام بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے
تمہیں ہاتھ گاڑی دی اور اب تم مجھے اپنا لکڑی کا تختہ دے رہے ہو۔ اگرچہ ظاہر ہے
کہ گاڑی کی قیمت تختے کی قیمت سے بہت ہی زیادہ ہے۔ خیر چلو اس ذکر کو جانے
دو۔ سچے دوست ایسے حساب نہیں کیا کرتے۔ مہربانی کر کے تختہ ذرا جلد لے آؤ تاکہ
آج ہی میں اپنا کام شروع کر دوں"۔

ہنس کہنے لگا "ضرور ضرور"۔ اور دوڑ کر ایک تختہ گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔
پنسہارا اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "بڑا چھوٹا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ چھت کی مرمت کے بعد تمہاری گاڑی کے لئے کوئی لکڑی نہیں بچے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں اور ہاں اب چونکہ میں نے تمہیں ہاتھ گاڑی دے دی ہے تم مجھے اس کے بدلے کچھ پھول دو۔ یہ لو ٹوکری۔ دیکھو اسے اُوپر تک بھرنا۔"
ہنس نے ذرا افسوس سے پُوچھا۔ "بالکل اوپر تک"؟ کیونکہ یہ ٹوکری فی الحقیقت بہت ہی بڑی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے یہ پُوری کی پُوری بھر دی تو پھر منڈی کے لئے کوئی پھول نہیں بچے گا۔ اس کا بہت ہی جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے نقرئی بٹن واپس خرید ے۔
پنسہارا کہنے لگا "ہاں پوری ہی بھر دو۔ میں نے تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالی ہے اب میں نہیں جانتا کہ تم سے کچھ پھول مانگنا کوئی بڑی بات ہے۔ ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ لیکن دوستی اور پھر سچی دوستی میں اس قسم کی خود غرضی کا دخل نہیں ہونا چاہیئے۔"
ہنس نے چلا کر جواب دیا۔ "میرے پیارے دوست! میرے بہترین دوست! تم میرے باغ کے تمام پھول لے لو۔ کوئی دِن ایسا نہیں آئیگا۔ جب مُجھے تمہاری خوشنودی حاصل کرنے سے پہلے نقرئی بٹن درکار ہوں"۔ ...... اس کے بعد ہنس

دوڑ کر چلا گیا۔ اپنے زرد گلاب کے تمام خوبصورت اور نفیس پھول توڑ کر پسنہارے کی ٹوکری بھر لایا۔

"ننھے ہنس خدا حافظ" کہہ کر پسنہارے نے تختہ اپنے کاندھے پر رکھا اور پھولوں کی ٹوکری ہاتھ میں لے کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔

ننھا ہنس بھی جواب میں "خدا حافظ" کہہ کر نلائی کرنے لگا۔ گاڑی ملنے کے خیال سے اُسے بہت مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

دوسرے دن وہ اپنی ڈیوڑھی کی دیوار پر بیلیں چڑھانے کے لئے میخیں جڑ رہا تھا کہ اُسے سڑک پر سے پسنہارے کی آوازیں سنائی دیں۔۔۔ اس نے سیڑھی پر سے ایک چھلانگ لگائی اور دوڑ کر باغ کی دیوار پر سے نیچے جھانکنے لگا۔

پسنہارا آٹے کی ایک بڑی سی بوری اپنی پیٹھ پر اٹھائے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "پیارے ہنس اور ننھے ہنس! میری بجائے تم آٹے کی یہ بوری منڈی کو لے چلو گے"؟

ہنس کہنے لگا "اے ہے افسوس سچ مانیو آج تو میں بڑا مصروف ہوں۔ مجھے آج اپنی تمام بیلیں چڑھانی ہیں۔ سب پھولوں کو پانی دینا ہے اور گھاس کے تختوں پر لوڑھی (ROLLER) پھیرنی ہے"۔

پسنہارا کہنے لگا "تم ٹھیک کہتے ہو گے پر ذرا سوچو تو سہی کہ میں تو تمہیں اپنی گاڑی دے دینے والا ہوں اور تم ہو کہ میری بات تک ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ ہو گی یہ بڑی

بے مروتی۔ آگے تم جانو!

ہنس چلا کر کہنے لگا" ایسے الفاظ زبان پر نہ لاؤ۔ میں تمہارے ساتھ بے مروتی کیوں کروں چاہے کوئی تمام دُنیا ہی نہ میرے ہاتھ میں دے دے"۔ . . . . اور پھر دوڑ کر ٹوپی لینے اندر چلا گیا اور بڑی سی بوجھل بوری کاندھوں پہ اُٹھا کر لڑ کھڑاتا ہوا چل دیا۔

اس دن سخت گرمی تھی اور سڑک پر غضب کی گرد بھی اُڑ رہی تھی۔ ابھی وہ میل کے چھٹے پتھر تک بھی نہ پہنچا تھا کہ اُسے اس قدر تکان محسوس ہونے لگی کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر دم لینے لگا۔ بہرحال اس نے بڑی مستعدی سے اپنا سفر جاری رکھا۔ آخرکار منڈی آگئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد بوری بہت اچھی قیمت پر بک گئی اور وہ فوراً اس خیال سے گھر لوٹ آیا۔ کہ کہیں زیادہ دیر ہوگئی تو راستے میں ڈاکو حملہ نہ کر دیں۔

جب رات کو ہنس سونے لگا۔ تو اُس نے کہا" آج کا دن بہت محنت و مشقت میں گذرا پر خیر اچھا ہوا میں نے اس کی بات تو مان لی۔ دراصل ہے بھی وہی میرا عزیز ترین دوست اس کے علاوہ وہ مجھے اپنی ہاتھ گاڑی بھی تو دینے والا ہے"۔

دُوسرے دن ہوگ سویرے ہی سویرے اپنی بوری کی قیمت لینے آپہنچا لیکن ننھا سا ہنس کل کی طویل اور کٹھن مسافت سے اس قدر چور چور ہو چکا تھا کہ ابھی تک اس کی آنکھ کھلی۔

پسینہارا آگر زور سے کہنے لگا۔" مجھ سے پوچھتے ہو تو تم جیسا سُست بھی کوئی نہیں ہوگا۔ یہی سوچ لیتے کہ میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے رہا ہوں اور اس خیال سے تم زیادہ محنت کر سکتے تھے لیکن تم ہو کہ ابھی تک سو رہے ہو۔ سستی گناہ کبیرہ ہے اور کم از کم مجھ سے یہ بات برداشت نہیں ہو سکتی کہ میرا کوئی دوست بھی کاہل ہو۔ بُرا نہ ماننا تمہیں بے تکلفی سے سب کچھ صاف صاف کہہ لیا ہے اگر میں تمہارا دوست نہ ہوتا تو یہ فقرے میرے خواب و خیال میں بھی نہ آتے لیکن دوستی کا کیا فائدہ اگر کوئی کسی سے دل کی بات بھی نہ کہہ سکے۔ یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے کہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ان کی خوشامد کرے اور طرح طرح کے سبز باغ دکھائے لیکن سچا دوست ہمیشہ کڑوی ہی باتیں کہے گا۔ اُسے پروا نہیں ہوتی کہ میرے دوست کو یہ بات بُری معلوم ہوگی یا بھلی اور اگر وہ سچا دوست ہے تو یقیناً وہ کھری کھری کہہ سُنانے کو ترجیح دے گا۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دوست کی بھلائی اسی میں ہے"۔

ننھا ہنس آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اُٹھ بیٹھا اور شب خوابی کی ٹوپی پرے پھینکتے ہوئے کہنے لگا۔" ہاں۔ ہاں اب مجھے بھی بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ بات یہ تھی کہ میں بہت تھک گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر اور آرام کر لوں۔ پرندوں کے چہچہانے کی خوب آوازیں آ رہی تھیں۔ تمہیں یہ پتا نہیں پرندوں کے گیت سُننے کے بعد مجھ میں کام کرنے کی زیادہ طاقت آجاتی ہے"۔

پنسہارا ننھے ہنس کی پیٹھ پر ایک تھپکی دے کر کہنے لگا "اچھا؛ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اب کپڑے پہن تو میرے ساتھ پون چکی کو چلو چل کر چھت کی مرمت کرتے ہیں۔"

غریب ہنس باغ کا کام کرنے کیلئے پہلے ہی بڑا مضطرب تھا۔ کیونکہ دو دن سے اس کے پھولوں کو پانی نہیں ملا تھا۔ لیکن وہ پنسہارے کی بات ماننے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کا بڑا ہی خیر خواہ اور مخلص دوست تھا۔

وہ نہایت ہی محجوب اور خائف سے لہجے میں ذرا ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔ اگر میں کہوں کہ میں سخت مضروب ہوں تو تم مجھے بے مروت تو نہیں سمجھو گے؟"

پنسہارا کہنے لگا۔ "یہ سوچ لو کہ میں اپنی ہاتھ گاڑی تمہیں دے رہا ہوں۔ اس کے بدلے اگر تم میرا یہ چھوٹا سا کام نہ کرو گے تو پھر میں خود ہی کر لوں گا۔"

ہنس چلا کر کہنے لگا "نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" یہ کہہ کر وہ بستر پر سے زقند بھر کر اُتر آیا اور کپڑے پہن کر پنسہارے کے ساتھ چل دیا۔

وہ دن بھر وہاں کام کرتا رہا یہاں تک کہ سورج کے غروب ہونے کا وقت بھی آ پہنچا۔ اتنے میں پنسہارا بھی یہ دیکھنے کے لئے کہ کام کیسا ہو رہا ہے وہاں آن موجود ہوا اور نہایت خوش مزاجی سے کہنے لگا "ننھے ہنس اب تک چھت کی مرمت ہوئی ہے یا نہیں؟"

ہنس نے سیڑھی پر سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں بالکل ہوگئی۔"
پسنہارا کہنے لگا "عجیب بات ہے آدمی کو اپنے کام کی بہ نسبت دوسروں کا کام کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔"

ننھا ہنس نیچے بیٹھ گیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا "تمہاری گفتگو سننا ہی دُنیا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے بہت ہی بڑی۔ مجھے افسوس ہے تو یہ ہے کہ معلوم نہیں ایسے روشن اور خوبصورت خیال جیسے تمہارے ہیں کبھی میرے بھی ہو سکیں گے۔"
پسنہارا کہنے لگا "کچھ مضائقہ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤ گے لیکن تمہیں ذرا زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ ابھی تو تمہیں دوستی قائم رکھنے کی مشق ہی ہوئی ہے۔ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ اصول تمہاری عقل میں بھی آجائے گا۔"

ہنس پکار اُٹھا۔ "ہیں سچ مچ؟ تمہارا میری نسبت یہ خیال ہے؟ ہائے کبھی میں بھی ایسا ہو جاؤں نا!"

پسنہارا کہنے لگا۔ "مجھے تو اس میں شک نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں چونکہ اس وقت چھت کی مرمت کرکے تم تھک گئے ہو بہتر یہی ہے کہ اب گھر چلے جاؤ اور آرام کرو۔ کل تمہیں پہاڑ پر میری بھیڑیں چرانی ہیں۔"

ننھے ہنس کو جواب میں چون و چرا کرتے ڈر لگتا تھا۔ ناچار چپ ہو گیا۔ دوسرے دن سویرے ہی سویرے پسنہارا اس کی جھونپڑی تک اپنی بھیڑیں ہانک لایا اور ہنس

انہیں پہاڑ پر چرانے لے گیا۔ تمام دن بھیڑوں چراتے چراتے ضائع ہو گیا اور جب وہ واپس آیا تو تکان سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر گر کر اس طرح سویا کہ دوسرے دن سورج چڑھے ہی اس کی آنکھ کھلی۔

"آج باغ میں کام کے لئے کیسا سہانا وقت ہے"۔ کہہ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

لیکن کسی صورت بھی وہ اپنے پھولوں کی خبر نہ لے سکا۔ کیونکہ سکا دوست پسنہارا ہمیشہ آجاتا اور اُسے دُور دُور اپنے کاموں پر بھیج دیتا یا اُس سے پون چکی پر کام لیا کرتا۔

اکثر ننھا ہنس اپنے آپ کو بڑا ہی دکھی محسوس کرتا کیونکہ اس کے دل کو ایک یہ بھی غم تھا کہ کہیں اس کے پھول یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ میں نے انہیں بھلا دیا ہے۔ اور ان کا دل ٹوٹ جائے۔ لیکن پھر دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر پرچا لیا کرتا کہ آخر دنیا میں ایک مخلص دوست تو ہے ہی نا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچتا کہ وہ مجھے اپنی ہاتھ گاڑی دینے والا ہے یہ اس کی کچھ کم مخلصانہ فیاضی ہے۔

پس ننھا ہنس پسنہارے کے کاموں میں لگا رہتا اور پسنہارا اُسے دوستی کے متعلق طرح طرح کے سبز باغ دکھایا کرتا اور یہی باتیں ہنس اپنی نوٹ بک میں لکھ کر رات کو یاد کیا کرتا۔ کیونکہ اُسے پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔

اب یوں ہوا کہ ایک شام جب ہنس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا یکایک کسی نے دروازے

کو مٹھیوں سے خوب پیٹا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات نہایت وحشتناک تھی اور آندھی کے تیز جھونکے جھپٹے چلے آتے تھے اور ان سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے شیر غرّا رہے ہوں۔ آندھی اس قدر غضبناک تھی کہ پہلے تو اس نے یہی جانا کہ طوفان ہی آ گیا ہے لیکن جب دروازے کو پیٹنے کی آوازیں متواتر آنے لگیں تو ننھا ہنس یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا "شاید کوئی بیچارا مسافر ہے"۔

سامنے پنہارا اپنے ایک ہاتھ میں لال ٹین اور دوسرے میں ایک چھڑی لئے کھڑا تھا۔

کہنے لگا "ننھے اور پیارے ہنس مجھ پر سخت مصیبت آن پڑی۔ میرا چھوٹا لڑکا سیڑھی پر سے گر پڑا ہے اور اسے بہت چوٹ آئی ہے۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں عجیب مصیبت ہے وہ بہت ہی دور رہتا ہے اور رات بھی سخت اندھیری ہے۔ یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ میری بجائے تم بھی تو جا سکتے ہو۔ یہ بہتر رہے گا تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے رہا ہوں۔ مناسب یہی ہے کہ تم بھی اس کے بدلے میرے لئے کچھ کام کرو"۔

ہنس چلا کر کہنے لگا "یقیناً یقیناً تمہارا یہاں آنا میرے لئے باعث فخر ہے میں فوراً چل دیتا ہوں۔ لیکن تم ذرا اپنی لالٹین مجھے دے دو۔ دیکھتے ہو رات کس قدر تیرہ و تار ہو رہی ہے۔ کہیں میں کسی کھڈ میں نہ گر جاؤں"۔

پنہارا کہنے لگا "افسوس افسوس یہ تو میری بالکل نئی لالٹین ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا ہو تو میرا بڑا نقصان ہو گا۔"

ننھا ہنس کہنے لگا "اچھا جانے دو میں اس کے بغیر ہی چلا جاؤں گا"۔ چنانچہ اس نے اپنا کھال کا بڑا کوٹ کاندھے پر سنبھالا اور اپنی سُرخ رنگ کی گرم ٹوپی اور گلے پر مفلر لپیٹ کر چل دیا۔

اُف کس قدر ڈراؤنا اور بھیانک طوفان تھا اور رات اس قدر اندھیری کہ ننھے ہنس کو بمشکل ہی راستہ نظر آتا۔ آندھی فراٹے بھر بھر کر چل رہی تھی اور ننھے ہنس کے قدم اپنی جگہ سے اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے لیکن وہ بڑا باہمت تھا۔ تین گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ آخر ڈاکٹر کے مکان پر آ پہنچا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ڈاکٹر نے شب خوابی کے کمرے کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا "کون ہے اس وقت۔"

"ڈاکٹر! میں ہوں ـــ ننھا ہنس ـــ"

پنہارے کا لڑکا سیڑھیوں پر سے گر گیا ہے اور اُسے بہت چوٹ آئی ہے پنہارے نے مجھ سے کہا ہے کہ ڈاکٹر کو جلدی بُلا لاؤ۔"

ڈاکٹر کہنے لگا "بہت اچھا!" اور پھر اس نے اپنے نوکروں سے اپنا فل بُوٹ گھوڑا اور لالٹین لانے کے لیے کہا اور نیچے اُتر کر پنہارے کے مکان کی طرف چل دیا اور ننھا ہنس

اس کے پیچھے لڑکھڑاتا ہُوا بھاگا۔

طُوفان بڑھتا ہی گیا اور مُوسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اتنے طُوفان میں وہ گھوڑے کے ساتھ بھی نہ رہ سکا۔ اب اسے کچھ سُوجھ نہ پڑتا کہ وہ کدھر جائے آخر وُہ راستے سے بھٹک گیا اور اندھا دُھند پھرتا پھراتا کہیں دلدلوں کی طرف جانکلا۔ یہ ایک نہایت خطرناک جگہ تھی۔ جہاں جابجا عمیق کھڈ تھے۔ بیچارا ننھا ہنس یہیں ڈُوب گیا۔ دُوسرے دِن اس کی لاش گڈریوں نے ایک بڑے سے تالاب میں تیرتی ہوئی دیکھی وہ اُسے اُٹھا کر اس کی جھونپڑی کو لے گئے۔

سب آدمی ننھے ہنس کے جنازے میں شریک تھے کیونکہ وہ بڑا ہی ہر دلعزیز تھا۔ ان سب میں پسنہارا سب سے بڑا سوگی بنا بیٹھا تھا۔

وہ کہنے لگا "چُونکہ میں اس کا عزیز ترین دوست تھا اس لئے جلوس میں سب سے آگے مجھے جگہ ملنی چاہئے" پس وہ ایک لمبا سا کالا چغا پہن کر ماتمی جلوس کے آگے آگے چلنے لگا اور بار بار اپنی آنکھیں ایک بڑے سے رومال سے پُونچھتا۔

جب تجہیز و تکفین کی رسم ہو چکی تو لوہار کہنے لگا۔ "ننھے ہنس کی موت سے یقیناً ہم سب کو بڑا نُقصان پہنچا ہے" اور پھر وہ سب سرائے میں آرام سے بیٹھ کر مصالحہ دار شراب اور میٹھے کیک کھانے لگے۔

پسنہارے نے جواب دیا۔ "کچھ ہی ہو اصل نُقصان تو مجھے پہنچا ہے۔ کیوں؟

اس لئے کہ میں نے اُسے اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالی تھی اور اب فی الواقع میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا کروں۔ میرے لئے اس کا وجود مصیبت ہو چلا ہے اور مرمت اس کی اسقدر ہو گی کہ اگر میں اسے بیچنا چاہوں تو مجھے کوئی اس کا ایک آنہ بھی نہ دے۔ میں ضرور اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آئندہ کبھی کوئی چیز کسی کو نہ دوں سخی ہونا بھی ایک عذاب ٹھیرا۔"

ایک لمبے توقف کے بعد پن چوہا کہنے لگا " اچھا تو پھر ہوا کیا؟"

چڑیا کہنے لگی۔ "بس یہاں کہانی ختم ہوتی ہے"۔

پن چوہا کہنے لگا " لیکن پنہارے کا کیا ہوا؟"

چڑیا نے جواب دیا۔ " میں کیا جانوں کیا ہوا نہ کچھ مجھے اس کی پروا ہے"۔

پن چوہا کہنے لگا۔ " تو ظاہر ہے کہ تمہاری فطرت میں کوئی ہمدردی موجود نہیں"۔

چڑیا کہنے لگی "۔ شاید تم کہانی کے نتیجے پر غور نہیں کر رہے ؟"

پن چوہا کہنے لگا " کس پر غور نہیں کر رہا ؟"

" نتیجے پر"۔

" کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اس کہانی سے کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے"۔

" یقیناً"۔

پن چوہا نہایت غصے سے کہنے لگا۔ " میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات تمہیں مجھے کہانی

شروع کرنے سے پیشتر ہی بتا دینی چاہیے تھی۔ اگر تم ایسا کرتیں تو میں ہرگز تمہاری کہانی نہ سُنتا اور اس نقاد کی طرح "اونہہ لغو!" کہہ دیتا۔ لو اب سہی یہ کہہ کر اس نے اتنی اونچی آواز سے جتنی اس سے ممکن تھی گلا پھاڑ کر کہا۔ "اونہہ! لغو!!!" اور اپنی دم کو جھٹکا دے کر اپنے بِل میں واپس چلا گیا۔

اور بطخ کچھ دیر بعد تیرتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "پن چوہے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس میں کئی خوبیاں ہیں اور میری کیا پوچھتے ہو میرے احساسات تو ایک ماں کے سے ہیں اور جب میں کسی ایسے فرد کو دیکھتی ہوں جسے ہمیشہ ناکتخدا ہی رہنا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔"

چڑیا کہنے لگی "کہانی سنا کر شاید میں نے اُسے خواہ مخواہ دِق ہی کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اُسے ایک ایسی کہانی سنا بیٹھی جس کا کوئی نتیجہ بھی نکلتا تھا۔"

بطخ کہنے لگی "آہ ایسی باتیں کرنا ہمیشہ بڑی خطرناک غلطی ہوتی ہے۔"

اور مجھے بھی اس سے بالکل اتفاق ہے

بُلبُل اَور گلاب

بُلبُل اور گلاب*

نوخیز طالب علم چلایا "وہ کہتی ہے میں تبھی رقص میں تمہاری شریک بنوں گی جو تم مجھے گلاب کے سُرخ پھُول لادو گے۔ لیکن میرے باغ میں ایک بھی سُرخ پھُول نہیں"!

بلبل شاہِ بلوط کے درخت پر اپنے گھونسلے میں بیٹھی تھی۔ طالب علم کی آواز سُن کر اس نے درخت کے پتوں میں سے جھانکا اور حیران ہو گئی۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے وہ پھر کہنے لگا۔ "تمام باغ میں گلاب کا کوئی سُرخ پھُول نہیں! ..... مسرت کے لئے بھی کیسی کیسی فضُول باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ دُنیا بھر کے دانا اور اک جہان کے عالم جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ سب تو میں نے پڑھ ڈالا ہے اور فلسفہ کے سربستہ راز بھی میرے سامنے کھُلے پڑے ہیں لیکن آہ گلاب کے ایک پھُول نے میری جان عذاب میں ڈال دی ہے۔"

بُلبُل کہنے لگی "ہیں! یہ تو عاشق صادق ہے۔ آخر آج میری آنکھوں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ میں ہر رات اپنے گیتوں میں اس کی تعریف کرتی تھی اگرچہ اس سے ناآشنا تھی، اور ہر رات اس کی کہانی ستاروں کو سناتی تھی اور آج! آج وہ میرے سامنے موجود ہے!! اس کے بال سنبل کی طرح سیاہ ہیں اور اس کے ہونٹ پھُول کی طرح سُرخ —— اسی پھُول

کی طرح جو اُسے درکار ہے ——— لیکن چہرہ زرد ہو رہا ہے نہ جانے اس کے دل میں کیا کیا آرزوئیں ہیں اور غم و اندوہ نے تو بس اُس پر غلبہ ہی پالیا ہے۔

طالب علم بڑبڑا کر کہنے لگا "کل رات شہزادے کے ہاں محفلِ رقص ہے، اور میری شیریں ادا بھی وہاں جائیگی۔ اگر میں اُسے گلاب کا سُرخ پھُول لادوں تو رقص میں وہ میری شریک بنے گی اور ہم دونوں نُور کے تڑکے تک مصروفِ رقص رہیں گے۔ اُف۔۔۔۔ اگر میں اُس کے لئے سُرخ پھُول لے جاؤں تو میں اس کی کمر کے گرد اپنے بازو بھی حمائل کر سکوں گا اس کا سر میرے کندھے پر آجھکے گا اور میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے بس لپٹ ہی جائیگا۔ لیکن میرے باغ میں تو گُلاب کا سُرخ پھول ہے ہی نہیں۔ میں تنہا ایک طرف بیٹھ جاؤنگا وہ آئے گی اور میری طرف دیکھے بغیر ہی قریب سے گذر جائیگی اور میرا دل ٹُوٹ کر رہ جائیگا۔

بُلبل کہنے لگی "یقیناً یہی ہے سچا عاشق۔ میں جس درد کے گیت گاتی ہُوں وہ اس میں مبتلا ہے۔ جو میری خوشی ہے وہی اس کے لِئے رنج ہے۔ محبّت یقیناً ایک نایاب شے ہے زمرد سے بھی زیادہ مہنگی اور ننھے ننھے سفید پتھروں سے بھی زیادہ پیاری۔ یہ نادر موتیوں کے بدلے بھی نہیں مل سکتی۔ یہ جنسِ گراں بکتی کب ہے؟ وہ کون سوداگر ہے جس کے پاس یہ بھی ہو؟ کون اسے خرید سکتا ہے۔ چاہے اس کے ساتھ سونا بھی تول کر دینے کے لِئے تیار ہو۔"

•

نوخیز طالب علم کہنے لگا "سازندے اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ جائینگے اور اُن کے

تار والے ساز بجنے لگیں گے اور چنگ و رباب کے نغموں کی صدا پر میری شیریں ادا کا رقص شروع ہو گا۔ اس کے رقص میں اس قدر شوخی اور نزاکت ہے کہ لوگ اس کے گرد آ جمع ہوں گے لیکن وہ میری شریک تو نہیں ہو گی! میرے پاس تو گلاب کا سُرخ پھول ہے ہی نہیں کہ اُسے نذر دُوں۔"

طالب علم نے اپنے آپ کو گھاس پر گرا لیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔

پاس ہی سے سبز رنگ کا ایک گرگٹ اپنی دُم ہوا میں اٹھائے ہوئے دوڑ کر گذرا اور کہہ گیا "یہ کیوں رو رہا ہے!؟"

اور ایک تیتری بھی جو سُورج کی ایک سُنہری کرن کا پیچھا کرتے ہوئے اِدھر اُدھر اپنے پر پھڑپھڑاتی پھرتی تھی کہنے لگی "ہیں! سچ مچ! میں کبھی نہیں جان سکتی! کیوں!!

اور ایک ننھا سا پھُول بھی ساتھ کے پھول سے اپنے نرم و نازک لہجے میں کہنے لگا "ہیں! سچ مچ کیوں!!"

بلبل کہنے لگی۔ "وہ گلاب کے ایک سُرخ پھُول کے لیئے رو رہا ہے۔"

سب چلا اُٹھے "صرف گلاب کے سرخ پھُول کے لیئے! کتنی مضحکہ خیز بات ہے!..."

... اور منہ پھٹ گرگٹ نے تو بلا توقف ایک قہقہہ بھی لگا دیا۔

لیکن طالب عِلم کے رنج و غم کا راز تو کچھ بلبل ہی جانتی تھی جو شاہ بلوط کے درخت پر

خاموش بیٹھی عشق کے معمے پر غور کر رہی تھی۔

یکایک اُڑنے کے لئے اس نے اپنے خاکستری پر پھیلائے اور درختوں کے اوپر ہوا میں چلی گئی پھر درختوں کے جھنڈ میں ایک سائے کی طرح گذری اور پھر سائے کی طرح ہی آہستہ آہستہ باغ کے پار چلی گئی۔

گھاس کے ایک تختے کے بیچ میں گلاب کے پھولوں کا ایک خوبصورت پودا تھا اُسے دیکھ کر بلبل نیچے اُتر آئی اور اس کی ایک شاخ پر آن بیٹھی۔

پھر چلا کر اُس سے کہنے لگی "گلاب! گلاب!! تو مجھے اپنا ایک سُرخ پھول دے میں تجھے اپنا سب سے شیریں گیت سناؤں گی"۔

لیکن جواب میں گلاب کے پودے نے اپنا سر ہلا دیا۔ کہنے لگا "میرے پھول تو سفید ہیں۔ بہت سفید۔ پہاڑ کی برف سے بھی زیادہ سفید۔ اتنے سفید جتنا سُمندر کا جھاگ ہے تم میرے بھائی کے پاس چلی جاؤ —— وہ جو پُرانی دھوپ گھڑی کے پاس اُگا ہے —— شاید جو کچھ تم مانگ رہی ہو۔ تمہیں وہاں سے مل جائے۔

بُلبل اُڑ کر اب اُس پودے کے پاس آئی جو پُرانی دُھوپ گھڑی کے گرد اُگا تھا اور کہنے لگی "گلاب! گلاب! ! تو مجھے اپنا ایک سُرخ پھول دے۔ میں تجھے اپنا سب سے شیریں گیت سُناؤں گی"۔

جواب میں گلاب کے پودے نے اپنا سر ہلا دیا کہنے لگا "میرے پھول تو زرد ہیں بہت

زرد۔ نرگس کے زرد زرد پھولوں سے بھی زیادہ زرد جو وادی میں انتہائی خوف کی حالت میں گلچیں کا انتظار کر رہے ہوں ــــ کہربا کے تخت پر بیٹھنے والی بنت البحر کے بالوں کے سے زرد ــــ ہاں تم میرے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ وہ طالب علم کی کھڑکی کے نیچے اُگا ہے شاید جو کچھ تم مانگ رہی ہو تمہیں وہیں سے مل جائے۔

بُلبل اُڑ کر اس پودے کے قریب آئی جو طالب علم کی کھڑکی کے نیچے اُگا تھا۔

بُلبل نے پھر کہا "گلاب! گلاب!! تو مجھے اپنا ایک سُرخ پھول دے میں تجھے اپنا سب سے شیریں گیت سُناؤنگی۔"

لیکن جواب میں پودے نے سر ہلایا۔ کہنے لگا "میرے پھول سُرخ ہیں۔ بہت سُرخ۔ مونگے کے بڑے بڑے پنکھوں سے بھی زیادہ سُرخ جو سمندر کے حجروں میں ہلتے جلتے نظر آتے ہیں۔ اتنے سُرخ جتنے فاختہ کے پاؤں ــ لیکن جاڑے کا جاڑا میری رگوں سے چمٹ گیا ہے۔ پالے نے میری کلیاں نوچ لی ہیں اور طوفان نے میری ٹہنیاں توڑ ڈالی ہیں اس سال تو مجھ میں پھول بالکل آئینگے ہی نہیں۔"

بُلبل چلا کر کہنے لگی "میں صرف ایک ہی پھول مانگتی ہوں! صرف ایک ہی! کیا مجھے یہ کسی طرح حاصل ہو سکے گا؟"

پودے نے جواب دیا "ایک طریقہ ہے۔ لیکن بہت ہی ڈراؤنا میں تمہیں وہ کیسے بتاؤں!"

بلبل کہنے لگی "بتا دو۔ بتا دو۔ میں ڈرونگی نہیں"۔

پودے نے جواب دیا "اگر تمہیں سُرخ پھول ضرور ہی چاہیئے تو پھر تمہیں چاندنی رات میں اپنا راگ الاپ الاپ کر اس کی تخلیق کرنی ہوگی اور اپنے دِل کے خُون سے اسے سینچنا ہوگا تمہیں ایک کانٹے کے ساتھ اپنا سینہ جوڑ کر مجھے رات بھر اپنے گیت سُنانے پڑینگے۔ یہاں تک کہ کانٹا تمہارے سینے سے ہوتا ہُوا آخر تمہارے دِل میں پیر جائے اور تمہارا سب خون میری رگوں میں پہنچ کر میرا بن جائے"۔

بُلبُل چِلا کر کہنے لگی۔ "اپنی جان کے بدلے ایک پھُول خرید لوں؟ یہ قیمت بہُت زیادہ ہے اور جان تو ہر کسی کو بہُت ہی عزیز ہوتی ہے۔ ہرے بھرے جنگل میں بیٹھ کر سُورج کو اپنے سونے کے رتھ میں اور چاند کو موتی کے رتھ میں بیٹھ کر جاتے ہُوئے دیکھنا کتنا رُوح افزا نظارہ ہے اور دُور سے جھاڑیوں کی جو بھینی بھینی خوشبُو آتی ہے کِتنی فرحت بخش ہے۔ وہ گھنٹیوں کی شکل کے ننھے ننھے نیلے نیلے پھُول جو وادی میں چھُپ چھُپ کر اُگے ہیں کِتنے خُوبصورت ہیں اور بیڑھ کا درخت جو پہاڑی پر بہار دکھا رہا ہے کس قدر سرسبز و شاداب ہے لیکن نہیں! عِشق کا رُتبہ زِندگی سے بہُت بلند ہے اور پھر ایک پرندے کے حقیر دل کو انسان کے دل سے بھلا نسبت ہی کیا ہے؟"

پس بلبل نے اڑنے کے لیئے اپنے خاکستری پر پھیلائے اور ہوا میں جا پہنچی اور باغ پر سے ایک سائے کی طرح اڑتی ہُوئی آئی اور ایک سائے کی طرح ہی وُہ درختوں کے جھنڈ

میں سے گذرتی گئی۔

نوخیز طالب علم اب بھی گھاس پر گرا تھا بالکل اُسی جگہ جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی اور ابھی اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے۔

بُلبُل چلّا کر کہنے لگی " اب تم خوش ہو جاؤ! اب خوش ہو جاؤ! تمہیں سُرخ پھُول مِل جائیگا!!! میں چاندنی میں اپنا راگ الاپ الاپ کر اس کی تخلیق کرونگی اور اسے اپنے دل کے خون سے سینچونگی لیکن اس کے بدلے میں تم سے ایک درخواست کرتی ہوں وہ یہ کہ تم اپنی محبت میں ثابت قدم رہنا۔ یاد رکھو کہ مُحبت وہ کچھ دیکھ لیتی ہے جو فلسفہ نہیں دیکھ سکتا۔ خود محبت ہی عقل ہے اور محبت ہی طاقت۔ بڑی سے بڑی زبردست طاقت سے بھی زیادہ زبردست طاقت۔ اس کے پروں میں آگ کے شعلے لپٹے ہیں اور اس کے جسم میں آگ کے شعلوں کی رنگت نظر آتی ہے۔ اس کے ہونٹ شہد کی طرح شیریں ہیں اور اس کی سانس لوبان کی طرح خوشبو دار۔"

طالب علم نے گھاس پر سے اپنی نظر اُوپر اُٹھائی اور سُننے لگا لیکن۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بُلبُل کیا کہہ رہی ہے کیونکہ وہ تو وہی کچھ جانتا تھا جو اس کی کتابوں میں لکھا تھا۔

لیکن شاہ بلوط کا درخت سب کچھ سمجھ کر غمگین ہو گیا۔ اُسے بُلبُل بہت ہی عزیز تھی مدت سے اس نے اس کی شاخوں میں گھونسلا بنا رکھا تھا۔

درخت نے آہستہ سے کہا۔ "بُلبُل! اچھی بُلبُل!! مجھے اپنا آخری گیت سُناتی جا جب

تو چلی جائیگی تو میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

پس بلبل نے درخت کو اپنا گیت سُنایا اور اس کی آواز کچھ اس طرح سُنائی دی جیسے کسی چاندی کے برتن میں سے پانی انڈیلتے وقت بُلبلوں کی آواز نکلتی ہے۔

جب اس کا گیت ختم ہُوا تو طالب علم اُٹھ کھڑا ہُوا اور اس نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک اور ایک پنسل نکال لی۔

اور جب وُہ درختوں کے جھُنڈ میں سے گذر رہا تھا تو کہنے لگا "بس اس کے پاس طرز ہی طرز ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس میں احساسات بھی ہیں؟ میرا خیال ہے نہیں! درحقیقت یہ بھی اکثر صناعوں ہی کی طرح ہے اس کے دل میں ہمدردی تو ہے ہی نہیں بس طرز ہے ہمہ تن طرز۔ بھلا یہ دُوسروں کی خاطر کیسے اپنا آپ قربان کر سکتی ہے۔ اس کے دل میں سوا موسیقی کے کچھ اور آ ہی کہاں سکتا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ فنونِ لطیفہ میں خُودغرضی کو کتنا دخل ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اسکی آواز میں چند دلکش سُر ضرور ہیں لیکن افسوس کہ ان کا مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ سب بے معنی ہیں اور ان کا کوئی عملی فائدہ نہیں!"...

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنے چھوٹے سے بچھونے پر لیٹ کر اپنی محبوبہ کے خیالات میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر نیند نے غلبہ پا لیا۔

اور جب چاند آسمانوں پر چمکنے لگا تو بلبل اُڑ کر گلاب کے پودے پر ایک کانٹے سے

سے اپنا سینہ لگا کر بیٹھ گئی اور اسی طرح رات بھر گاتی رہی اور بلوریں چاند سر داڑھی لیئے جھک کر سنتا رہا۔ تمام رات وہ گاتی رہی اور کانٹا اس کے سینے میں آگے ہی آگے اترتا گیا اور خون جو اس کی زندگی بر قرار رکھنے کیلئے ضروری تھا ترتی ہوئی لہر کی طرح گھٹتا گیا۔

اس کا سب سے پہلا گیت ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کے دل میں محبت کی پیدائش کے متعلق تھا۔ . . . اور گلاب کے پودے کی سب سے اونچی اور گھنی شاخ میں ایک نرالی شان کا پھول کھل آیا ایک گیت ختم ہونے پر جب دوسرا گیت شروع ہوتا تو پھول کی ایک اور پنکھڑی بن جاتی اور اسی طرح ایک کے بعد ایک پنکھڑی آتی گئی اور پھول بن گیا پہلے تو پھول کا رنگ کچھ پھیکا تھا صبح کے پروں کی طرح اور اس کہر کے مانند جو دریا پر ہوا میں لٹکی ہوتی ہے یا اجالے کے پروں کی طرح روپہلی۔ یا گلاب کے اس پھول کا ہم شکل جو چاندی کے آئینے میں نظر آرہا ہو یا گلاب کے پھول کے اس عکس کی طرح جو کسی جھیل میں دکھائی دے رہا ہو۔ یہ تھی اس پھول کی شکل جو پودے کی سب سے اونچی شاخوں میں کھل پڑا تھا۔

لیکن درخت اب بھی بلبل سے چلا کر کہنے لگا "اچھی بلبل اپنا سینہ کانٹے کے ساتھ اور دبا تی جاؤ ایسا نہ ہو کہ پھول مکمل ہونے سے پہلے ہی دن نکل آئے۔

پس بلبل نے اپنا سینہ کانٹے پر اور دبایا اور اس کا گیت بلند سے بلند تر ہوتا گیا کیونکہ اب وہ ایک ایسا گیت گا رہی تھی جو ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کی روح میں

خواہش کی پیدائش کے متعلق تھا۔

اور پھول کی پتیوں میں یکایک ایک نہایت ہی خوشنما سرخ رنگ آگیا۔ وہی رنگ جو دولہا کے چہرے پر دلھن کے ہونٹوں کا بوسہ لیتے وقت آجاتا ہے۔ لیکن کانٹا ابھی بُلبُل کے دِل تک نہیں پہنچا تھا اس لئے پھول کے دِل کا رنگ اب بھی سفید تھا کیونکہ بلبل کے دل کا خون ہی پھول کے دِل کو سُرخ کر سکتا ہے۔

درخت پھر چلایا "بلبل! اچھی بلبل!! ابھی اور دباؤ!!! اور کانٹا سینے میں دور تک لے جاؤ ایسا نہ ہو کہ پھول مکمل ہونے سے پہلے ہی دن نکل آئے"۔

پس بُلبل نے کانٹے کو اپنے سینے سے اور دبایا یہاں تک کہ کانٹا اس کے دل کو چھو گیا اور اس کا تمام جسم ایک دردناک ٹیس سے کانپ گیا۔ درد لحظہ بلحظہ بڑھتا ہی گیا اور لحظہ بہ لحظہ ہی اسکے گیت میں وحشت بھی بڑھنے لگی کیونکہ اب وہ محبت کا گیت گا رہی تھی ایسی محبت کا گیت جو قبر میں جا کر مردہ نہیں ہو جاتی۔

اور نرالی شان کا یہ پھول بالکل سُرخ ہو گیا مشرقی آسمان کے پھول کی طرح سُرخ۔

اب پھول کا حلقہ بھی قرمزی تھا اور پھول کا دِل بھی یاقوت کی طرح قرمزی۔

لیکن اب بُلبل کی آواز دھیمی پڑنے لگی اور اس کے ننھے ننھے پر تڑپنے لگے اور اس کی آنکھوں پر ایک پردہ چھا گیا اور گیت بھی دھیما دھیما ہوتا گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا گویا اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔ آخر اس کا راگ ایک جگہ

ٹوٹ کر رہ گیا۔ زرد رو چاند نے یہ ٹوٹے ہوئے آخری نغمے سن لئے۔ اُسے پو پھٹنے کے وقت کا بھی کچھ خیال نہ رہا اور دم بخود ہو کر وہیں آہستہ آہستہ پھرتا رہا۔ سرخ پھول نے بھی یہ آواز سن لی اور اس نے فرطِ مسرت سے کانپ کر بادِ صبا کے آگے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں اور گونج اس نغمے کو اٹھا کر پہاڑیوں کے اندر اپنی ارغوانی کھوہ میں لے گئی اور لیٹے سوئے ہوئے چرواہوں کے کانوں تک پہنچا کر انہیں خواب سے بیدار کر دیا۔ اور جب یہ آواز دریا کے کنارے نیستاں میں سے تیرتی ہوئی گذری تو نیستاں نے یہ خبر سمندر تک جا پہنچائی۔

گلاب کا پودا چلا کر بلبل سے کہنے لگا "دیکھو! دیکھو!! پھول مکمل ہو گیا ہے!!!" لیکن بلبل کیا جواب دیتی وہ تو لمبی لمبی گھاس میں مردہ پڑی تھی۔ کانٹا ابھی تک اس کے دل میں چبھا تھا۔

اور دوپہر کو طالب علم نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا اور چلا کر کہنے لگا "ہیں! سرخ پھول؟ کمال ہو گیا!! اسے کہتے ہیں خوش قسمتی!! کیا عجیب پھول ہے۔ میں نے تو زندگی بھر ایسا پھول نہیں دیکھا۔ کتنا خوبصورت ہے۔ لاطینی میں ضرور اس کا کوئی بڑا لمبا سا نام ہو گا۔

پھر اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور اپنے ہاتھ میں پھول لے کر پروفیسر کے مکان کی طرف دوڑا۔

پروفیسر کی لڑکی دروازے کے راستہ میں بیٹھی ریل پر نیلے رنگ کا ایک ریشمی دھاگا لپیٹ رہی تھی اور اس کا چھوٹا سا کتا اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

طالب علم چلّا کر اُس سے کہنے لگا "تم نے کہا تھا نا کہ اگر تم مجھے گلاب کا سُرخ پھُول لا دو گے تو میں رقص میں تمہاری شریک ہونگی۔ لو یہ دُنیا کا سُرخ ترین پھُول ہے۔ تم آج رات اسے اپنے دل کے بالمقابل پہننا اور رقص کے وقت تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

لڑکی نے اسے دیکھ کر تیوری چڑھائی۔

پھر کہنے لگی "میں تو اسے نہیں پہنونگی۔ اس کے علاوہ چیمبرلین کے بھتیجے نے مجھے کچھ اصلی جواہر بھیجے ہیں اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ جواہر پھُولوں سے بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔"

طالب علم خشمگیں ہو کر کہنے لگا۔ "میری پُوچھتی ہو تو تم سا ناشکرا بھی کوئی نہ ہوگا۔"

. . . . اس کے بعد نوجوان نے دُنیا کا یہ سُرخ ترین پھُول گلی میں پھینک دیا جو ایک نالی میں جا گرا اور چھکڑے کا ایک پہیہ اس پر سے گذر گیا۔

لڑکی کہنے لگی "میں ناشکری!؟ میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ تم نے مجھ سے سخت گستاخی کی ہے۔ قصہ مختصر، آخر تم ہو کون!!؟ صرف ایک طالب علم . . . . میں نہیں جانتی کہ چیمبرلین کے بھتیجے کی طرح تمہارے بُوٹ میں بھی چاندی کے بکسوئے

لگے ہوں"۔ . . . یہ کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھی اور اندر چلی گئی۔

طالب علم وہاں سے یہ کہہ کر چل دیا کہ محبت کرنا بھی کتنی حماقت ہے۔ یہ کیسی فضول چیز ہے منطق اس سے بدرجہا زیادہ کام کی چیز ہے اس سے نہ تو کچھ ثابت ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ باتوں میں سے کسی ایسی بات کے متعلق ہوتی ہے جو ہو ہی نہیں سکتی اور ہمیں ہمیشہ جھوٹی باتوں کا یقین دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک نہایت ہی غیر عملی چیز ہے اور چونکہ اس زمانے میں باعمل ہونا ہی سب کچھ ہے اس لئے میرے لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ فلسفہ پڑھوں۔ جا کر علم النفس کا مطالعہ کرتا ہوں۔

پس وہ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا اور ایک بڑی سی غبار آلود کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔

کاؤنٹیس رونا کا معمّا

کاؤنٹیس رےونا کا معمّا

تین زبردست محاصروں میں اپنے بقیہ ملک کو فتح کر کے اب سٹینسلاس بہت سی فوج کے ہمراہ ناقابلِ تسخیر شہر آدر کے سامنے آ بیٹھا تھا کیونکہ خونخوار کاؤنٹ تھیوبولٹ کی بیٹی کسی طرح اُس سے مغلوب نہ ہوتی تھی وہ کہتی تھی پچاس سال تک تو میرے باپ نے بادشاہ کی اطاعت قبول نہیں کی اور نہ خراج بھیجا اب میں اس کے لئے شہر کے دروازے کیوں کھولوں؟ جب تک خود میرا ہی جی نہ چاہنے لگے اور جب تک میں خود ہی اپنے عزم سے باز نہ آجاؤں۔ چنانچہ بادشاہ نے آکر چاروں طرف سے شہر کو گھیر لیا اس طرح کہ نہ تو کوئی اندر جا سکتا اور نہ باہر۔ اس کے بعد اس نے کاؤنٹیس رونا کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور کہا کہ "شہر میرے حوالے کر دو ورنہ میں فصیلوں پر حملہ کر کے ایک طوفان برپا کر دونگا۔ شہر کو لوٹ کر قلعۂ شہر اور سطح زمین ایک کر دیئے جائینگے اور اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہیگا۔"

کاؤنٹیس کو بادشاہ کا پیغام دے دیا گیا۔ اس وقت وہ اپنی بلند مسند پر ایک کھڑکی کے نیچے بیٹھی تھی اور سورج کی کرنیں اندر آکر اس کے خوبصورت بالوں کو چوم رہی تھیں۔

"بادشاہ سے کہہ دو ـــــــ کیونکہ آخر وہ بادشاہ ہے، اگرچہ میرا نہیں ـــ کہ ہم خوب مسلح ہیں اور ہمارے پاس ایسے ایسے جانباز موجود ہیں جن کی سپہ گری کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا ہے ـــــــ اُسے بتا دو کہ جتنے عرصے کیلئے ہمارے پاس خوراک کا ذخیرہ جمع ہے اتنے سال اُس کے پاس حکومت کے لئے بھی نہ ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم بھوکوں مریں وہ خود تھک کر ہار جائیگا"۔

کاؤنٹیس نے اپنی گفتگو ختم کی اور شاہ کے خاص الخاص ایلچی نے جھک کر آداب بجالاتے ہوئے پوچھا۔"بس۔ یہی پیغام ہے؟"

"نہیں اور سنو اُس سے یہ بھی کہہ دو کہ شہر آدیں خونخوار کاؤنٹ تھیوبولٹ کی لڑکی کا راج ہے"۔

ایلچی دوبارہ آداب بجالایا۔"بس یہی پیغام ہے؟"

رونا ایک لمحہ کے لئے رُکی اور پھر بولی"نہیں اور بھی ہے بادشاہ سے کہہ دینا قبل اس کے کہ وہ شہر کی فصیلوں کے اس پار آسکے اُسے پہلے قلعے کو تسخیر کرنا ہوگا"

ایلچی ماتھے پر شکن ڈال کر ذرا مسکرایا اور کہنے لگا"حضور کا ارشاد بجا ہے لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ قلعہ ہمیشہ کسی بلند چٹان پر واقع ہوتا ہے اور شہر اس کے نیچے اردگرد، اور پھر شہر کے اِردگرد فصیلیں۔ تو بادشاہ کس طرح پہلے ـــــــ؟"

رونا نے ذرا آزردگی سے اپنے سر کو اوپر کی طرف جنبش دی اور کہا"تمہاری

گفتگو تو تمہارے محاصرے سے بھی زیادہ طویل ہوگئی۔ سر ہیرلڈ اتم پیامبر ہو نہ کہ مترجم۔ جاؤ اور بادشاہ کو وہ سب باتیں سُنا دو جو میں تم سے کہہ چکی ہوں"۔

آخر ایلچی شاہ سٹینسلا س کے پاس واپس آگئے اور اُسے رونا کا جواب سُنا دیا۔ بادشاہ نے اِنتہائے غیظ و غضب میں پیغام کے پہلے حِصّے کو دوسرے حِصّے کی بہ نسبت زیادہ غور سے سُنا اور تین دن تک شہر کی فصیلوں پر زبردست چڑھائی جاری رکھی مگر رونا کے آدمیوں نے اسکی فوج کو بہت نقصان پہنچایا اور پھر اُسے پیچھے کو دھکیل کر تتر بتر کر دیا رونا کے بہادرانہ پیغام سے اسکے آدمی اور بھی مضبوط دِل ہو گئے۔ وہ کہتے تھے "چونکہ ہماری کاؤنٹس نے اپنی ہار کے امکان کے متعلق جو شرط بنائی ہے اُسے پُورا کرنا ناممکن ہے لہٰذا ہمیں کسی طرح شکست نہیں ہوگی ہمیں بیٹی رونا کے لفظوں پر اعتماد ہے۔ کیونکہ باپ تھیوبولٹ کی باتوں پر بھی ہم ہمیشہ یقین رکھتے تھے"۔

تین حملوں میں مسلسل ناکامی کے بعد ایک ماہ تک بادشاہ چپ چاپ وہیں ٹھیرا رہا اور اپنی فوج کو شہر کے قریب لاتا گیا اس کے بعد اس نے پھر کاؤنٹیس کے پاس ایک پیغام بھیجا کہ "میں اپنا نصف عہدِ حکومت شہر آر کے باہر ختم کر ڈالوں گا تاکہ باقی نصف اس کے اندر گذار سکوں اگر اب بھی تم شہر میرے حوالے کر دو تو میں تمہیں معاف کر دونگا اور تمہاری تمام دولت بھی تمہارے ہی پاس رہیگی لیکن اگر تم نے ہار نہ مانی تو پھر تمہیں لوٹ کھسوٹ فاقہ کشی اور میرے بے پناہ غصے کے مقابلے کیلئے تیار رہنا

چاہیئے"۔ اس کے جواب میں کاؤنٹس نے صرف یہ کہا "بادشاہ سے کہہ دو کہ شہر کی فصیلوں کے اس پار آنے سے پہلے قلعے کو تسخیر کرے اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی"۔

جب بادشاہ کو اپنے پیغام کا دو دفعہ ایک ہی جواب مِلا تو وہ چلّا اُٹھا اور کہنے لگا "لعنت ہو اس پر! اس عورت اور اس کے گستاخانہ معمول پر!——
اس کی شکل کیسی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں"۔

مخصوص ایلچی نے جس کا کام قدرتاً فصاحت پروری تھا جواب دیا۔ "وہ خوبصورتی میں مہتاب اور مرتبہ میں آفتاب ہے"۔

بادشاہ نے خود پسندی سے جواب دیا "فضول ہے!"

جواب میں ایلچی جھک کر لیکن ذرا بیزاری سے آداب بجا لایا۔

شاہ نے پھر ایلچی سے پوچھا "کیا وہ ہوش میں ہے؟"

"حضور بالکل ہوشمند ہے۔ اگرچہ حضور کے ارشاد کے بموجب اس کا پیغام سُن کر ہرگز یقین نہیں آتا کہ یہ کسی ایسی معقول خاتون کی طرف سے بھیجا گیا ہے جسے عقل و ہوش——"

بادشاہ سُنی اَن سُنی ایک کر کے اپنے منتظم سے کہنے لگا "دوسرا اجلاس منعقد کر دو! میں تیار ہوں"۔

اور دوسرے اجلاس کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ عام عقل کے لوگوں کی طرح وہ اس جلسے سے بھی دماغی تکلیف اور برہم مزاجی کے سوا اور کچھ حاصل نہ کر سکا تھا پس اُس نے پھر شہر کی فصیلوں پر تین دفعہ حملہ کرایا لیکن یہ حملہ بھی حسب معمول ناکام ہی رہا۔ اس کے بعد کاؤنٹیس رونا کے پاس پھر ایک پیغام بھیجا گیا جس کا وہی جواب ملا جو پہلے مل چکا تھا بادشاہ تمام عمر بھی سوچتا رہتا تو اس پیغام کا اصلی مطلب نہ سمجھ سکتا تھا اس کی سمجھ میں اس حل کے سوا اور کیا آ سکتا تھا کہ وہ عمر بھر فصیلوں کے پار نہیں جا سکیگا۔ جب وہ سوچ سوچ کر تنگ آ گیا تو کہنے لگا "جو کچھ وہ کہتی ہے وہ صرف پرندوں کی فوج ہی کر سکتی ہے" اتنی ناکامیوں کے بعد وہ فی الواقع اس قدر مایوس اور خجل ہو چکا تھا کہ شاید وہ اسی وقت شہر کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے دارالسلطنت کو واپس چلا جاتا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے آتی دفعہ رعیت کے سامنے اور دربردہ قسم اُٹھا کر کہہ دیا تھا کہ جب تک آ رنیج نہ کر لوں گا نہ تو اپنے شہر کو واپس آؤنگا اور نہ اپنی رعیت کو منہ دکھاؤنگا اب وہ تھا اور اتنی بڑی فوج کی خوراک کے انتظام کا بار موسم سرما آ رہا تھا اور اس کے صدر الصدور نے مستقبل کی پُر اضطراب کیفیت پہلے ہی سے بیان کر دی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ شہر سے کاؤنٹس کی رعایا کے جشن منانے کی پیہم صدائیں آ رہی تھیں وہ دعوتیں اُڑا کر بچی کھچی ہڈیاں باہر شاہ کی فوج پر پھینک رہے تھے جس نے شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا اور یہ کس قدر توہین آمیز بات تھی۔

کاؤنٹس رونا اپنی بیش دستوں اور بہادر سرداروں کی مجلس میں کھڑکی کے نیچے بیٹھی تھی ــــ اُس کھڑکی کے نیچے جس پر مُلک کے بہادروں کی تعریف میں شعر کندہ تھے...... اور آفتاب کی شعاعیں اس کے خوبصورت بالوں کے آرپار ہو رہی تھیں اس وقت شاید وہ حیران بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بادشاہ اب کیا کرے گا اور اس کے پیغام کا مطلب کب سمجھے گا۔

(۲)

شاہ سٹینسلاس کی فوج کے ساتھ نکوس نامی ایک راہب بھی تھا وہ ایک بہادر نیک اور خوش خلق آدمی تھا اگرچہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق وہ خوش طبعی، اختلاط اور میل جول کا حد سے زیادہ دلدادہ تھا اور یہ باتیں اس کے مقدس فرض کے پیش نظر اسے زیبا نہ تھیں لیکن چونکہ وہ ایک تیز فہم اور دور اندیش رفیق بھی تھا اس لیئے اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے وہ سٹینسلاس کا منظور نظر ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے اُسے کسی قدر بے تکلف ہونے کی جرأت بھی دے رکھی تھی۔ وہ بھی کاؤنٹس رونا کا پیغام سن چکا تھا جواب بادشاہ کی فوج کے کانوں تک بھی جا پہنچا تھا اور جس کے متعلق بادشاہ کے آدمی اپنے خیموں کے قریب آگ کے اردگرد بیٹھ کر بحث و تحقیق کر رہے تھے۔ راہب ان کی تمام گفتگو سن رہا تھا اور اسکے متعلق وہ ہر آدمی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے نہایت دانائی سے اپنا سر کو جنبش دے دیتا تھا لیکن خود اس کی زبان بالکل بند تھی اور کسی آدمی نے کاؤنٹس

رونا کے پیغام کے متعلق اُسے کوئی رائے ظاہر کرتے نہ سُنا۔ شاہ کے آدمیوں کا خیال تھا کہ اس پیغام کا مقصد ایک سادہ اور علانیہ دھمکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک رات شاہ اپنے خیمے میں بہت فکرمند اور آزردہ خاطر بیٹھا تھا کہ خیمے کا پردہ اُٹھا سامنے نکولس کھڑا تھا۔ بادشاہ کہنے لگا "میں نے تمہیں نہیں بُلایا"۔

نکولس نے جواب دیا "داؤد نے کب نیتن کو بُلایا تھا۔ وہ بھی خود ہی اس کے پاس آ پہنچا تھا"

بادشاہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "میں نے کونسی بھیڑ کی بچھیا چھینی ہے"؟

بادشاہ سوچ بچار سے اکتا گیا تھا۔ خود اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی اُس کے پاس آ کر بیٹھے اس نے نکولس کی طرف شراب کی صراحی دھکیلتے ہوئے کہا "اچھا نیتن داؤد کے ساتھ کچھ پی سکتا ہے"۔ نکولس نے دعوت قبول کرتے ہوئے خیمے کا پردہ اپنے پیچھے گرا دیا اور خود اندر آ گیا۔

بادشاہ نے پھر پوچھا "کیا میری تمام سلطنت میں یہی ایک بھیڑ کی بچھیا ہے جو میرے خلاف اب تک اڑی ہوئی ہے؟ کیا آرکاؤنٹیس رونا کی بھیڑ کی بچھیا ہے؟

نکولس نے شراب ختم کرتے ہوئے جواب دیا "شہر آرہی تو بھیڑ کی بچھیا ہے"۔

اے رسول! اسے فتح کرنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں اسے حاصل کرنے میں ایک دفعہ ناکام رہا ہوں لعنت ہو اس پر! ــــ اور دوسرے اس پر حق بھی میرا ہی ہے کیونکہ یہ میرے باپ کی ملکیت تھا پھر معلوم نہیں اے مقدس رسول تم مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟"

نکولس جو اس وقت خیمے کے وسط میں چغہ لپیٹے کھڑا تھا بولا "میں کب کہتا ہوں کہ آپ

اسے فتح نہ کریں۔ میں تو یہ بتانے آیا ہوں کہ اسے کیونکر فتح کرنا چاہیئے۔۔۔۔ بادشاہ سلامت میں آپ سے ایک سوال کروں گا؟"

بادشاہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا اور کہنے لگا کہو میں سنتا ہوں!"

"اچھا ذرا یہ بتائیے کہ فوج میں قلعہ کہاں ہوتا ہے؟"

"فوج میں قلعہ؟۔۔۔۔۔ فوج میں قلعہ کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ تو اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے شہر کے وسط میں کسی اونچی جگہ پر بنا ہوتا ہے لیکن فوج خیموں میں یا صاف زمین پر رہتی ہے جو اِدھر اُدھر بھی آجا سکتی ہے۔ اے رسول! فوج میں تو کوئی قلعہ نہیں ہوتا۔ کیا تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا؟"

"نہیں بادشاہ سلامت نہیں ———— بتائیے فوج میں قلعہ کہاں ہوتا ہے؟"

"فوج میں کوئی قلعہ نہیں ہوتا۔ شہر جو اینٹوں اور پتھروں کا بنا ہوتا ہے قلعہ اس میں ہوتا ہے۔ فوج اینٹوں اور پتھروں کی نہیں ہوتی اُس میں تو صرف آدمی ہی ہوتے ہیں جو گوشت پوست ہڈیوں رگ و پے اور دل و دماغ کے ہوتے ہیں۔ اے رسول فوج میں کوئی قلعہ نہیں ہوتا کیا تمہیں جواب مل گیا؟"

نکولس نے تیسری دفعہ پھر کہا نہیں بادشاہ سلامت۔ آپ کا جواب درست نہیں بتائیے فوج میں قلعہ کہاں ہوتا ہے؟

اب شاہ نے سوچا کہ اس سوال کا واقعی کوئی گہرا مطلب ہوگا۔ اس لیے اُس نے سوچنا

شروع کیا اور بہت دیر تک خیالات میں ڈوبا رہا اور نکولس خیمے کے وسط میں بت بنے اس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا۔

آخر کار بادشاہ نے سوچ سوچ کر جواب دیا۔ "ہاں نکولس میں نے جان لیا واقعی فوج کا قلعہ بھی ہوتا ہے فوج کا قلعہ اس رہبر کا مضبوط دل ہے جو فوج کی رہنمائی کر رہا ہو اے رسول! کیا اب تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا؟"

"ہاں ہاں اب مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا" یہ الفاظ کہہ کر نکولس واپس مڑا اور خیمے سے باہر چلا گیا۔

بادشاہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور پکار اٹھا "میں نے جان لیا۔ شہر کا قلعہ بھی شہر کے رہبر کا دل ہی ہو سکتا ہے اور اب آر کی فصیلوں سے گذرنے سے پہلے مجھے اس شہر کا قلعہ فتح کرنا ہو گا"۔

(۴)

رونا اپنی بلند مسند پر منقش کھڑکی کے نیچے بڑے ہال میں بیٹھی تھی اس کے اردگرد اس کی مصاحب خواتین اور سردار جمع تھے۔ ایک افسر نے رخصت چاہتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ ایک قیدی کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اجازت حاصل کرنے کے تھوڑی دیر بعد کاؤنٹیس کی خدمت میں ایک نہایت ہی وجیہہ و شکیل نوجوان پیش کیا گیا۔ اگرچہ اس وقت وہ دو محافظوں کے درمیان قیدی بن کر کھڑا تھا لیکن اب بھی اس کا چہرہ کافی پر غرور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ اس کے سر میں ایک آزاد دماغ ہے۔ اس کا قد دراز بال سیاہ آنکھیں نیلی اور کندھے چوڑے چکلے تھے وہ پہلو کی طرف ذرا جھکا ہوا تھا۔ رونا نے منظوری میں اس کے چہرے پر ایک نگاہ دوڑائی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ "تم نے اسے قیدی کیوں بنایا ہے" آخر وہ افسر سے پوچھنے لگی "تم یہ قیدی کہاں سے لائے ہو؟"

افسر نے جواب دیا "رات کافی گذر چکی تھی کہ یہ جنوبی دروازے کی طرف آیا اور شاہ شٹنسلاس کے غضب سے پناہ مانگنے لگا"۔

کاؤنٹیس نے چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا "تو کیا یہ مفرور ہے"۔

"وہ ہمیں کچھ نہیں بتاتا وہ کہتا تھا کہ میں اپنی کہانی صرف پورہائی نس ہی کو سناؤں گا"۔

ایک مصاحبہ کے ہاتھ سے مورچھل لیتے ہوئے اور اسکے پیچھے اپنا نصف چہرہ چھپاتے ہوئے کاؤنٹیس نے کہا۔ اسے بولنے کی اجازت ہے"۔

افسر نے قیدی سے کہا۔ "بولو!"

"اگر میں قیدی بنا تو اپنی مرضی سے۔ کیونکہ میں کچھ ایسی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں نے اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ اپنے آپ کو یورہائی نس کے رحم پر چھوڑ دوں۔ تاہم میں غدار نہیں ہوں اور اب بھی اسکے سوا میری اور کوئی تمنا نہیں کہ میرے آقا شاہ شٹنسلاس کا بھلا ہو!"

"اچھا تو پھر تم ضرور چاہتے ہو گے کہ وہ اب اپنے شہر کو واپس ہی چلا جائے اور میرے شہر کا پیچھا چھوڑ دے"۔

نائٹ مسکرا پڑے اور عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اجنبی نے نہ تو ان باتوں کی اور نہ ہر ہائی نس کے چست فقرے کی کچھ پروا کی ہے۔ اس کے بعد اجنبی نے سلسلۂ کلام یوں باندھا۔ "میں شاہ سٹینسلاس کا بڑا معتمد تھا۔ وہ مجھے ایک عقلمند آدمی سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ میں سب ایسی باتیں جان سکتا ہوں جو جاننے کے قابل ہیں اور صرف میری مدد سے وہ تمام سربستہ رازوں کا انکشاف اور مشکل سے مشکل معموں کا حل کر سکتا ہے۔ میں گذشتہ فتح کی تین مہموں میں اسکے ساتھ تھا۔ اسکے بعد وہ مجھے آمر کی دیواروں کے پاس لایا۔ اس کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ میری بہادری اور مشوروں کی مدد سے آمر کا مالک بن سکتا ہے میں شیخی نہیں بگھار رہا ہیں صرف وہی باتیں بیان کر رہا ہوں جو بادشاہ میری نسبت متعدد دفعہ لوگوں کے سامنے کہہ چکا ہے۔"

رونا نے اجنبی سے کہا۔ "اچھا تو پھر کم از کم ایک آدمی کے دل میں تمہاری بھی قدر ہے"۔

اجنبی نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں ایک کے دل میں نہیں دو کے دلوں میں ہے"۔

عورتیں پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور نائٹ مسکرانے لگے لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اجنبی نے پھر نہایت شیریں آواز اور پر زور انداز میں جس نے سننے والوں کے کانوں پر عجیب اثر ڈال لیا تھا اور عورتیں اس کی ہنسی اڑانے پر پشیمان نظر آرہی تھیں یوں کہنا شروع کیا۔ "اس کے بعد وہ دن آن پہنچا ــــــــ وہ مہلک دن ــــــــ جب یور ہائی نس کیطرف

سے ہزمیجسٹی کو ایک پیغام بھیجا گیا اور جب بادشاہ سلامت نے حضور کے پیغام کا مطلب مجھ سے پوچھا اور کہا کہ "یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی فصیلوں کے پار جانے سے پہلے قلعہ فتح کرے۔"
میں نے جواب میں انہیں بتایا کہ یہ بات بالکل فضول اور ناقابل توجہ ہے۔ شاہ نے مجھ پر یقین کر لیا اور فصیلوں پر تین دفعہ پھر حملہ کیا گیا اور بہت سے آدمی بلا وجہ مارے گئے اس کے بعد دوبارہ حضور کا پیغام آیا اور جب شاہ نے پھر مجھ سے اس کا مطلب پوچھا تو میں نے اسے یہی جواب دیا کہ ایک گستاخانہ للکار کے سوا اس کا اور کوئی مطلب نہیں۔ اب بھی شاہ نے مجھ پر یقین کر لیا اور پھر تین دفعہ فصیلوں پر حملے کئے گئے اور بہت سے بہادر بیکار موت کی گھاٹ اتر گئے اب تیسری دفعہ حضور کا پیغام آیا اور شاہ نے مجھ سے اس کا مطلب پوچھا لیکن مجھے اس کا مطلب نہ آتا تھا مبادا اور آدمیوں کی جانیں ضائع ہوں میں نے اس بات کا اعتراف کر لیا اور کہہ دیا کہ "میں اس معمے کا مطلب بتانے سے قاصر ہوں"
مور چھل کی چوٹی پر سے دیکھتے ہوئے کاؤنٹیس نے کہا "خوب عقلمندی سیکھ تو لی مگر ذرا دیر سے اور پھر اس کی قیمت بھی ادا کر دی۔"
جب میں نے یہ مان لیا تو اس نے مجھے احمق کہا اور اس کے علاوہ بہت سے سخت الفاظ کہے اور مجھے صاف صاف بتا دیا کہ میری خیر اسی میں ہے کہ میں یہ معما حل کر ڈالوں۔ اب تیسری دفعہ بالکل درست حل ہونا چاہئے اور اگر مجھ سے حل نہ ہو سکے تو پھر مجھے ہرگز اپنا وطن دیکھنے یا اپنے آدمیوں سے دوبارہ ملنے کی اجازت نہ دی جائیگی بلکہ میری

زندگی کا خاتمہ یہیں شہر کی دیواروں کے باہر کر ڈالا جائیگا اور میرا انجام نہایت ذلت اور بیچارگی میں ہوگا۔ شاہ نے جب غصے میں مجھ سے ایسے الفاظ کہے تو میں اس کے خوف اور موت کے خیال سے رات کو چپ چاپ خیمے سے باہر نکلا اور اپنے آپ کو یورہائی نس کے ایک افسر کے سپرد کر دیا جو شہر کے جنوبی دروازے پر کھڑا محافظت کر رہا تھا۔"

رونا نے پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یا تو معمے کا حل تاکہ میں اسے بادشاہ کے پاس لے جاؤں اور دوبارہ اسکی خوشنودی حاصل کر لوں ——"

"اور اگر یہ نہ ہو سکے تو؟" رونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مجھے یہاں تھوڑے عرصے کیلئے رہنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں اپنی عقل سے اس کا حل دریافت کر لوں۔"

نائٹ مسکرا پڑے اور حقارت سے آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگے لیکن عورتیں جن پر اجنبی کی شکل و صورت نے کچھ کم اثر نہ ڈال لیا تھا نہایت غمگین ہو کر آہیں بھرنے لگیں۔ شاید وہ اس لئے افسردہ ہو گئی تھی کہ اتنے بڑے آدمی کو ناحق اس قدر فضول دقتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں لیکن اس وقت رونا کا سر خیالات میں جھکا ہوا تھا اور اجنبی اس کیطرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جب رونا نے سر اٹھایا تو دونوں کی نگاہیں ایک ہو گئیں۔ اس وقت رونا کی نیلی اور پرشوق آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی اور اسکے رخسار پر ایک ہلکی

سی سُرخی دوڑ گئی —— یا شاید اُوپر کی رنگین کھڑکی سے سُرخ روشنی اس کے رخسار پر پڑنے لگی تھی۔

کاؤنٹیس نے کہا "سات دن اور سات راتیں تم یہاں رہ سکتے ہو لیکن اس شرط پر کہ جب یہ رات ختم ہو جائے گی تو میرے افسر تمہیں پھر بادشاہ کے پاس چھوڑ آئیں گے۔ اگر اس وقت تک تم نے معمے کا حل تلاش کر لیا تو تمہارے اور تمہارے بادشاہ کیلئے اچھی بات ہو گی لیکن اگر تم نہ حل کر سکے تو پھر تم پر اور اس پر مصیبت آئے گی —— موت کی سی مصیبت —— اب بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے یہ شرط منظور ہے! میں یہاں رہوں گا!"

رونا نے اشارہ کیا کہ اجنبی کو وہاں سے لے جایا جائے اور پھر کہنے لگی "تم سب بھی یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے تنہا رہنے دو۔"

(۴)

اب سات دنوں اور سات راتوں کا آغاز تھا۔ ہر روز اجنبی پوشیدہ طور پر اور بڑے ہال میں جہاں عورتیں اور نائٹ بیٹھے ہوتے اُس سے گفتگو کرتا۔ اس نے اپنے بادشاہ اور سلطنت کی نسبت اُسے بہت کچھ بتایا اور رونا نے اُسے اپنے شہر کی دولت اور طاقت دکھائی۔ لیکن جب وہ اُس سے پوچھتی کہ تم خود کون ہو تو وہ جواب دیتا میں بادشاہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ اسکے سوا اپنی نسبت وہ اور کچھ نہ بتاتا۔ رونا اس عجیب غریب

شخصیت کو دیکھ کر بہت حیران تھی وہ زیادہ سے زیادہ وقت سوچنے میں گذارنے لگی کہ وہ کون ہو سکتا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس دوران میں بادشاہ کی فوج اپنے خیموں میں بڑی سستی سے پڑی تھی اور اب تک اس نے فصیلوں پر بھی کوئی حملہ نہ کیا تھا۔

آخرکار جب تین دن گذر چکے تو رونا نے اس سے پوچھا "اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ بادشاہ تمہارا آقا اپنی اتنی وسیع سلطنت چھوڑ کر صرف میرے ہی غریب شہر کے خلاف کیوں نبرد آزما ہو گیا ہے"؟

"وہ اس لئے جنگ کرتا ہے کہ ملک میں امن و امان اتفاق اور طاقت کا دور دورہ ہو۔ تین سال کے عرصے میں اس نے تمام سلطنت میں امن قائم کر دیا ہے۔ صرف یہی شہر دوستوں میں ایک دشمن، فرمانبرداروں میں ایک سرکش اور زور آوروں میں ایک کمزور باقی رہ گیا ہے۔ بغیر سلطنت کے شہر کچھ نہیں ہے اور بغیر شہر کے سلطنت کمزور ہے۔"

رونا چیں بجبیں ہو کر خاموشی سے یہ باتیں سنتی رہی اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگی "اگر شاہ ان الفاظ کے ساتھ میرے پاس ایلچی بھیجتا تو ممکن تھا کہ میں اسکے الفاظ پر توجہ دیتی اس نے تو صرف مجھے ہار ماننے کے لئے پیغام بھیجا تھا۔"

دوسرے دن پھر رونا نے اجنبی کو بلایا اور پوچھا کہ "اگر میں شہر شاہ کو دے دوں اور اپنے آپ کو بھی اس کے حوالے کر دوں تو پھر میں کیا ہونگی ——— میں جو کاؤنٹس رونا ہوں"؟

اجنبی نے جواب دیا۔" بادشاہ کی مجلسِ مشاورت میں اور اُسکی محبت میں تمہارا مرتبہ بلند ہوگا۔"

رونا نے پھر چتون بدل کر کہا۔" میں بادشاہ کی محبت نہیں چاہتی!"

اجنبی نے آہستہ سے کہا" مادام تم نہیں جانتیں کہ یہ کیا شے ہے۔"

پانچویں دن اس نے پھر خفیہ طور پر اُسے بلایا اور پوچھا کہ اگر میں اپنا شہر دے دوں اور اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالے کردوں اور سلطنت میں امن وامان کا دور دورہ ہو ایسا امن وامان جو میرے باپ کاؤنٹ تھیوبولڈ آف آر کے عہد میں بھی نہیں ہُوا تھا تو پھر بادشاہ کیا کرے گا؟"

" پھر وہ اپنی سلطنت کو اور زیادہ خوشحال کرے گا اور اسے خوبصورت بنائے گا۔ اور تمام دشمنوں سے اُسے محفوظ کر ڈالے گا۔"

" اور تم کیا کرو گے؟"

" میں بادشاہ کے ساتھ ہوں گا بشرطیکہ میرے ساتھ ایسا اتفاق پیش آجائے کہ میں اُسے کوئی اچھی صلاح دے سکوں۔"

" تو کیا وہ تمہیں دولت سے مالا مال کر دے گا؟"

" ہاں اگر میں حاصل کرلوں تو عزت فوراً میری غلام ہوجائے گی۔"

" تو تم نے ابھی حل نہیں کیا؟"

میں اُس کا حل آپ کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہُوں" اجنبی نے ذرا جرأت سے کام لیتے ہُوئے جواب دیا اور رونا نے اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں مبادا وہ اُن میں حل دیکھ لے۔

ساتویں دن شام کو اُس نے پھر اجنبی کو خُفیہ طور پر بلایا جس کی کسی نائٹ یا مصاحبہ کو خبر نہ ہوئی۔ وہ بڑے ہال میں بیٹھی تھی جس میں دھیمی دھیمی روشنی کی گئی تھی۔ صرف اس کا چہرہ اس کے خوبصورت بال اور خوبصورت قیمتی لباس ہی ایک ایسی چیز تھی جو اندھیرے میں بھی چمک رہی تھی۔ اجنبی آگیا اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

رونا نے کہا۔ "کل آفتاب نکلنے پر میں تمہیں ضرور تمہارے آقا شاہ کے پاس بھیج دُونگی جیسا کہ تم سے وعدہ کرایا جا چکا ہے۔ تم اپنے ساتھ بادشاہ کے لئے کیا انعام لئے جا رہے ہو جس سے تمہیں پھر اس کی خوشنودی حاصل ہو جائے"؟

"میں اپنے دماغ میں قلعہ کی چابیاں تو نہیں لے چلا میرے پاس کچھ نہیں ہے"۔

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے اور بڑا ہال اور بھی زیادہ پُرسکوت ہو گیا تھوڑی دیر کیلئے اجنبی رونا کے نزدیک آگیا اور اُس کی بلند مسند کے ایک بازو کے قریب آن کھڑا ہوا۔

"مادام خدا حافظ"۔

رونا نے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "خدا حافظ"۔

"لیکن ہم پھر ملیں گے"۔

رونا نے پوچھا "کب؟" اُس وقت اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھکی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

"ایک دن کے اندر اندر فصیل سے باہر!"

"فصیل سے باہر؟"

"ہاں"۔ وہ اس کے سامنے جھک گیا اور اس کا ہاتھ چوم کر کہنے لگا "شہر کا قلعہ شہر کی ملکہ کا دل ہے!"

یکایک کاؤنٹیس اُٹھ کھڑی ہوئی اور شاید وہ کچھ بولتی بھی لیکن اجنبی نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کاؤنٹس کے چہرے پر کچھ عرصے تک نظریں جمانے کے بعد وہ واپس مڑا اور اُسے اُس منقش کھڑکی کے نیچے تنہا چھوڑ گیا جہاں سے مہتاب کی ایک کرن اندر آ کر چپ چاپ اس کے خوبصورت بالوں کو چوم کر جگمگا رہی تھی۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک اُس دروازے پر لگیں تھیں جہاں سے وہ ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔

کاؤنٹس نے آہستہ سے کہا "میرے دل نے اپنے مالک کو پہچان لیا ہے میں شاید اپنے بادشاہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی"۔

(۵)

دوسرے دن دوپہر کے وقت شاہ سٹینسلاس ایک سفر سے واپس آیا جو بعض ملکی

معاملات کی بنا پر اُسے پیش آگیا تھا۔ اُس نے اپنی فوج کی کمان دوبارہ اپنے ہاتھ میں لی اور اُسے جنگ کے لئے صف آرا کر کے آگے بڑھایا اور خود جنوبی دروازے کے سامنے میدان میں شہر کی فصیلوں کے ذرا نزدیک آن کھڑا ہوا۔

نکولس جو ضرورت پر اپنے مقدس فرائض انجام دینے کے لئے وہاں کھڑا تھا دیکھ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک سپاہی نے کہا "ہم فصیل پر دوبارہ حملہ کرنیوالے ہیں"۔

نکولس ہنس کر کہنے لگا "میرا خیال تو یہ ہے کہ بادشاہ سلامت قلعہ تسخیر کرنیوالے ہیں"۔ باقی تمام لوگ بھی یہ سمجھ کر ہنس پڑے۔ کہ نکولس نے شاہ کی اس بات پر ہنسی اڑائی ہے کہ وہ خواہ مخواہ فضول وقت اور دولت ضائع کر رہا ہے۔

جب کلاک نے ٹن ٹن بارہ بجائے تو شاہ کی شاندار آراستہ سواری آگے بڑھی وہ اس وقت ایک سیاہ طاقتور اور شوخ جنگی گھوڑے پر تھا جب اس کے اور شہر کی دیواروں کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے تمام فوج کو وہیں ٹھیرا دیا اور خود اکیلا آگے بڑھا اب اس کے ساتھ صرف ایک ایلچی تھا اور وہ فصیل کے نیچے بہت ہی قریب جا پہنچا تھا جہاں کاونٹیس رونا کے نائیٹوں اور مسلح آدمیوں کا ایک انبوہ کھڑا تھا ان لوگوں کی اس نے کچھ پروا نہ کی جو حملہ آوروں پر پتھروں اور لوہے کی بھاری بھاری سلاخوں سے حملہ کرنے کیلئے تیار بیٹھے تھے اب وہ ایلچی سے کہنے لگا ذرا چلا کر کہدو کہ شاہ سٹینسلاس ہر ہائی نس کاونٹیس رونا سے بات کرنا چاہتے ہیں"۔

اس پیغام سے فصیلوں کے قریب کی فوج میں ایک ہل چل مچ گئی شاہ بےحس و حرکت اپنے بڑے سیاہ گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ اس طرح آدھ گھنٹہ یا اس کے قریب گذر گیا۔ اس کے بعد شہر کا دروازہ کھول دیا گیا اور رونا اپنے ساتھ عورتیں اور نائیٹ لیئے ہوئے قرمزی رنگ کا لباس پہنے ایک چھوٹے سے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نکل آئی۔

پرانے سپاہی نے مضطرب ہو کر مبادا وہ لڑائی سے محروم رہ جائے نکولس سے کہا "یہ فصیلوں پر حملہ تو نہیں ہو رہا"۔

نکولس نے جواب دیا "میرا خیال ہے تم ابھی ابھی ان فصیلوں کے اس پار جا پہنچو گے"۔

جب بادشاہ نے کاؤنٹس کو دیکھا تو اس نے آہستہ سے اپنے گھوڑے کو مہمیز سے چھوا اور اس جگہ جا پہنچا جہاں رونا اس کی منتظر کھڑی تھی جب کاؤنٹس نے بادشاہ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی لیکن اس نے اپنی حیرانی کو چھپا لیا۔

اس نے آہستہ سے کہا "میرا دل جان گیا"۔ اور یہ الفاظ سن کر اس کی عورتیں اور نائیٹ حیران رہ گئے شاہ سٹینسلاس رونا کے سامنے آداب بجا لایا۔

کاؤنٹس نے پوچھا "میرے بادشاہ کدھر؟"

بادشاہ نے جھک کر اس کی کمر میں اپنے بازو ڈال دیئے اور اسے سفید گھوڑے

سے اُٹھالیا۔ فصیلوں کے محافظ اور میدان کی فوجیں مسرت کے نعروں سے چیخ اٹھیں۔

بادشاہ نے کاؤنٹیس کو بڑے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھالیا تھا۔

بادشاہ نے کہا "قلعہ تسخیر ہوچکا! اور اب میں فصیلوں کے پار جاسکونگا"۔

اور وہ دونوں مسرت وشادمانی کے نعروں کے درمیان شہر میں داخل ہوگئے۔

(۶)

یہ کہانی ہے تو چھوٹی سی لیکن نتائج اس سے بہت نکلتے ہیں:۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کیلئے۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کو چاہیئے کہ اپنا مطلب صاف صاف بیان کردیں۔ بشرطیکہ وہ اسے ظاہر کرنا چاہتے ہوں۔

بچوں کیلئے:۔ خواہ اُن کے باپ پچاس سال سے کسی بات پر کاربند رہے ہوں بعض دفعہ ان کیلئے یہی دانائی ہوگی کہ وہ اس کو فوراً ترک کردیں — خصوصاً اگر وہ اچھی شادیاں کرنا چاہتے ہیں۔

مردوں کے لئے:۔ اگرچہ یہ بات ناممکن ہے کہ عورت جو کچھ کہے اس کا کوئی مطلب بھی ہو تاہم جو کچھ وہ کہتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ مطلب ضرور ہوتا ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ وہ ایک ہی بات کو تین دفعہ دُہرائے۔

عورتوں کے لئے:۔ اگرچہ فصیلیں قلعہ کی حفاظت کرتی ہیں لیکن اکثر قلعہ فصیلوں کو

دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔

سب کے بڑے: جو آدمی اپنی عقل دُوسروں کی بہتری کیلئے صرف کرتا ہے اس کی مثال ایسی رہی ہے کہ اس نے اپنے ہمسائے کا کھانا تو پکایا۔ لیکن خود اس کھانے پر مدعو نہ کیا گیا۔ کیونکہ جب ایک دفعہ قلعہ فتح ہو گیا لوگ فصیلوں کے پار چلے گئے اور عاشق و معشوق ایک دُوسرے سے مل کر خوش ہو گئے تو نہ تو شاہ نہ کاؤنٹیس اور نہ کوئی اور شخص اپنے دل میں غریب نکولس کا خیال تک بھی لایا۔

شادی

شادی

دو سال کا عرصہ گزرا ہے کہ ساریا کے گاؤں میں لوگ ایک شادی کی خوشیاں منا رہے تھے دلہن کمرے کے وسط میں بیٹھی تھی تاکہ اس کے شباب سے تمتمائے ہوئے چہرے پر ہر کسی کی نظر پڑ سکے۔ ابھی ابھی اس کے سر پر ایک ٹوپی رکھ دی گئی تھی جس کی وہ ابھی تک عادی نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنا سر نیچے کو جھکا رکھنے کی بجائے ذرا اوپر اٹھا رکھا تھا۔ لیکن اگر یہ نہ ہوتا تب بھی وہ کوئی ایسی شرمیلی دلہن نہیں معلوم ہوتی تھی کہ شرم سے سر جھکائے ہی رکھے اس کے ہاتھ اس کی گود میں اس کپڑے پر تھے جس پہ مہمان چاندی اور تانبے کے سکوں کی بارش کر رہے تھے اور جو شاید ابھی ان کے بار سے پھٹ جانے والا تھا وہ بار بار ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہنس دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ صرف اس موقع کے انتظار میں ہے جو تھوڑی ہی دیر میں اس کے دل میں مسرت و انبساط کا ایک طوفان برپا کر دینے والا تھا۔ جب یہ رسم ختم ہو چکی تو ایک مہمان نے ازراہِ مذاق دلہن کے گرد حلقہ ڈال کر کھڑے ہوئے ہجوم میں سے ایک پانچ سال کے بچے کو اس کے گھٹنے پر لا بٹھایا کہ لے یہ تیرا بچہ ہے اس پر تمام عورتوں کی طرف سے دلہن پر چست فقروں اور ہزل گوئی کی بارش ہونے لگی۔ بے باکانہ چھیڑ چھاڑ اور بر آنے والی امیدوں اور

آرزوؤں کے متعلق کہے ہوئے طنزیہ فقرے دلہن کے گالوں پر حیا کی سرخی لے ہی آئے۔

اپنی بے ریا فطرت اور جرأت کے باوجود وہ گھبرا کر الفاظ کے جال میں یوں بے طرح پھنس گئی کہ اُسے بچے کو فوراً گود سے نیچے فرش پر اتارتے ہی بنی۔ دُلہن کو گرمی محسوس ہو رہی تھی سر کے لباس کا بار اسے کنپٹیوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ یکایک اس کے دل میں کمرے سے اُٹھ کر باہر چلے جانے کا خیال آیا وہ چپکے سے اپنی جگہ سے ایک طرف سرکی۔ باورچی اس وقت میزیں صاف کر رہے تھے اور شادی کے جشن میں اس طرح حصہ لے رہے تھے کہ بار بار فرطِ مسرت سے میزوں کو طبلے کی طرح بجانے لگتے۔ کمرے کے ایک کونے میں سارنگیاں نغمہ ریز تھیں۔ دلہن نے آہستہ آہستہ کھلے ہوئے دروازہ کی طرف سرکنا شروع کیا اور آخر کار اس میں سے چپکے سے باہر نکل گئی۔ گاؤں کی ایک گلی میں پہنچ کر جہاں بطخیں کیچڑ میں لت پت اپنا ایک بچہ ساتھ لئے پھر رہی تھیں۔ اس نے دوڑنا شروع کیا اور سیدھی کنوئیں پر پہنچ کر دم لیا۔ سوائے دُولہا کے جو شروع سے لیکر آخر تک اس پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا اور کسی نے محسوس نہ کیا کہ وہ کمرے سے چلی گئی ہے چنانچہ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اس نے دیکھا کہ اس کی ننھی نویلی دلہن کنوئیں کی دیوار کے جنگلے پر کنوئیں کی ڈولچی اونچا نے کے لئے جھکی ہوئی ہے جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ اور جھاڑ نے انہیں مکان سے اوجھل کر رکھا تھا۔ جب دُلہن نے قدموں کی چاپ سنی تو یکایک سہم گئی اور پلٹ کر پیچھے

دیکھنے لگی۔ جیسے کوئی گناہ کرتے کرتے پکڑا جاتا ہے اور پھر کہنے لگی "بہت ہی گرمی تھی۔"
یہ الفاظ بھی اس نے کچھ اس طرح کہے جیسے وہ اپنے کسی جرم پر معافی مانگ رہی ہے۔ دولہا
کنوئیں کے ایک ستون کو ایک ہاتھ سے تھامے چہرے سے کوئی اضطراب ظاہر کئے بغیر دلہن
کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ پھر لڑکی کچھ اس انداز سے جیسے دونوں میں خاموشی
ہی خاموشی میں کوئی تصفیہ ہو گیا ہو خود بخود کنوئیں کے ڈھکنے پر بیٹھ گئی جس کی جھریوں
میں گھاس اُگ رہی تھی وہ نہایت ملتجیانہ انداز سے کہنے لگی۔ "آؤ تھوڑی دیر کے لئے
یہیں ٹھیریں۔" دولہا نے اب بھی اس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹائیں اور جواب میں
اپنے سر کو ایک جنبش دے دی۔ دونوں کو اپنے اپنے دل میں مسرت اور غداری کا ملا جلا
ایک جذبہ محسوس ہوا جیسے انہوں نے بلا اجازت ایک ایسی چیز پر ہاتھ ڈالا ہو جو کسی اور کی
ملکیت ہو۔ دلہن نے اپنا ہاتھ کنوئیں کی ایک ٹنڈ میں ڈالا جس کی ایک طرف ایک شگاف
ہو گیا تھا دوسری طرف تھوڑا سا پانی جمع تھا جسمیں دو تین شہد کی مکھیاں تیر رہی تھیں جو
پانی پینے کی کوشش کرتے ہوئے اس میں گر گئی تھیں۔ دلہن نے اپنی انگلی اُن کیطرف
بڑھائی اور وہ سب کی سب اپنی جان بچانے کیلئے ایک قطار میں اس کی انگلی پر چڑھ
آئیں۔ اب انہوں نے تیزی سے اپنے پروں کو پھڑپھڑانا اور اگلی ٹانگوں سے ملنا شروع کیا۔
پچھلی ٹانگوں سے اُنہوں نے اپنے ننھے جسموں کو صاف کرنا شروع کیا جن پر نہ دکھائی
دینے والے نہایت ہی چھوٹے چھوٹے بال تھے وہ آگے ہی آگے جا رہی تھیں اور ان کی

ٹانگوں سے پانی کی ہلکی ہلکی دھاریوں کے نشان دُلہن کی اُنگلی پر بنتے چلے جا رہے تھے یکایک شہد کی ایک مکھی دوڑ کر اس کی آستین میں غائب ہو گئی۔

نوجوان اپنے جسم کو ایک تیز حرکت دیکر کہنے لگا۔" ہیں! ہیں! یہ تمہیں کاٹ لیگی" لڑکی نے اپنے بازو کو زور سے جھٹکا دیکر شہد کی مکھی کو گھاس میں گرا دیا۔ دولہا کی بات سُن کر اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا تھا۔

پھر دونوں نے رقص و سرود کے اُن دل نشیں اور تیز نغموں کی طرف کان لگا دیئے جو دُلہن کے گھر سے سارنگیاں اور پونگیاں فضا میں پھیلا رہی تھیں۔ لڑکی آہستہ سے کہنے لگی "وہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں" اور جواب میں نوجوان نے پھر سر ہلا دیا۔ اس وقت باورچی خانے میں شادی کی دعوت کیلئے کھانے تیار ہو رہے تھے اور سامنے کے دودکش سے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ دونوں نے دودکش سے نظریں پرے ہٹائیں اور سامنے کے میدان کی طرف دیکھنے لگے جن میں موسم گرما کے ابتدائی ایام کا سورج نتھرے ہوئے آسمان میں غروب ہو رہا تھا۔ دیو گندم کے ارغوانی کھیت آسمان کے ساتھ ایک زاویہ منفرجہ بنا رہے تھے اور ان کے پیچھے مغرب کی وسعتیں جگمگ جگمگ کرتی ہوئی تیار شدہ فصل کے متعلق کوئی خوشخبری سُناتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سامنے کے آسمانوں نے انہیں بتا دیا ہے کہ اس دفعہ ان چمکتے ہوئے کھیتوں میں پہلے سے دس گنا غلہ آنے والا ہے۔ باڑ سے پرے چراگاہ پھیلی تھی جو ایک چٹیل میدان ہونے

کے باوجود انہیں غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی اس میں کام شروع کرنے والے تھے۔ اس سے پرے ایک گرجے کی عمارت سیدھی کھڑی تھی ——— میدان میں بھی ایک ایسی عمارت تھی جو سب سے بلند تھی اور ہر جگہ سے نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ قریب کی تمام عمارتوں پر اسی کی حکومت ہے۔ موسم گرما کی ہواؤں میں کنکیوں نے زندگی پیدا کر رکھی تھی۔ دلہن کنوئیں کے کنارے پر بیٹھے ہوئے ان سے تنگ آ رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار ایک شاخ سے جو اس نے ابھی ابھی زمین سے اُٹھائی تھی، پیچھے کی طرف اڑا دیتی تھی اس کے باوجود وہ اس کے کانوں آنکھوں اور منہ میں گھس آتیں۔ یکایک ایک کنکی اس کی آنکھ میں گھس گئی۔ لڑکی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اسے کاٹ ہی کھایا ہے۔ اس کا ہاتھ فوراً آنکھوں کی طرف اٹھا اور وہ کہنے لگی۔ "مجھے کنکی نے کاٹ کھایا ہے"۔

دولہا نے جلدی سے جواب دیا۔ "دیکھو ملو نہیں میں اس کو نکالے دیتا ہوں"۔

اسے نیچے نہ جھکنا پڑا۔ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور ان کا قد برابر برابر تھا۔ نوجوان نے اس کی آنکھ کا پپوٹا آہستہ سے نیچے کیا دیکھنے کے لئے کہ یہ کالی سی شے کہاں ہے۔ وہ اپنا چہرہ اور بھی نزدیک لے آیا تاکہ اپنی زبان سے اسے نکال دے۔ لیکن کنکی پہلے ہی سے بھاگ چکی تھی اور بہانے ہی بہانے میں اس نے اسکی آنکھ کی سفیدی کی باریک دھاریاں اس کی ناک کا چھوٹا سا خال اور چھوٹے چھوٹے دلفریب داغ جو اس کی گالوں تک چلے گئے تھے۔ قریب سے دیکھ لئے۔ اس کے لئے یہ نظارہ کچھ کم مسرت بخش نہ تھا

وہ اپنے آئندہ عیش و مسرت کے خیالوں میں کھو گیا۔ لڑکی بھی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ جواب میں نوجوان کے چہرے پر مسلسل نظریں گاڑے تھی اس کے چہرے سے کوئی اضطراب ظاہر نہ ہوا وہ اس وقت نوجوان کے جذبات کے آگے مغلوب ہونے کو تیار تھی اور اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جن میں سکون اعتماد اور ترغیب کی جھلک تھی۔

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی "آؤ اندر چلیں"۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں ایک کبڑی پیٹھ والا آدمی دکھائی دیا جو شاہراہ سے اس طرف آتی ہوئی ایک گلی میں سے آرہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے قدم زمین سے بمشکل اُٹھ رہے ہیں۔ اُن دونوں کی آنکھوں کو وہ یوں معلوم ہوا جیسے وہ کسی شادی کا مہمان نہیں بلکہ کسی ماتم کی مجلس میں شریک ہونے آرہا تھا۔

دُولہا کہنے لگا "یہ اس جاگیر کا معمر ترین بلیف ہے۔ براہ مہربانی تم خود اسے جو کی شراب دو"۔

لڑکی اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی کیونکہ عین اسی وقت یہی خیال اس کے دل میں بھی آیا تھا کہ میں اس آخری مہمان کو اپنے ہاتھ سے جَو کی شراب کا ایک پیالہ دے کر اس کی پیاس بجھاؤں گی۔

لڑکی نے ایک آبخورہ لیا جس کے لکڑی کے کناروں پر میناکاری کی گئی تھی اور ساتھ کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے بلا ارادہ مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا

اُسے کمرہ معمول سے زیادہ روشن دکھائی دیا۔پچھلی کھڑکی کے قریب کھڑے ہُوئے لوگوں کے چہروں پر شفق کی روشنی لپٹ رہی تھی۔جب عورت اور مرد کا کوئی جوڑا رقص کرتا ہُوا کھڑکی کے سامنے آتا۔تو تھوڑی دیر کیلئے یوں معلوم ہوتا گویا وہ دونوں ایک سُرخ بادل میں تیر رہے ہیں۔نیا مہمان سایے میں کھڑا تھا۔

دلہن تاریک کمرے میں شراب کا پیپا ٹٹول رہی تھی کہ یکایک چونک پڑی مسرور مہمانوں کی سرگوشیاں یکایک بند ہوگئیں تھیں سب کو یکدم چپ لگ گئی۔ایسا معلوم ہونے لگا۔جیسے سب کی سانس تک رُک گئی ہے اور ہر سانس کی بجائے ان کے مُنہ سے ایک آہ نکل رہی ہے...... دلہن نے غیر مذبذب طور پر سینے پر ہاتھ ڈالا۔اُسے یوں معلوم ہونے لگا۔جیسے اس پہ ایک بھاری بوجھ آپڑا ہو۔اس کا دل چاہا کہ وُہ فرش پہ بیٹھ کر رونے لگے اگرچہ اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے اُسے دوبارہ گھر جاتے ہُوئے ڈر محسوس ہونے لگا۔

آب خورے میں کف آلود شراب لئے اس نے عروسی کمرے کا دروازہ کھولا۔دروازہ پہ آکر یکایک رُک گئی تھوڑی سی شراب فرش پہ گر گئی۔اس نے کمرے میں چاروں طرف حاضرین پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔لیکن اس سے پہلے کہ اسے کوئی جواب ملے تمام نگاہیں فرش کی طرف نیچی ہوگئیں۔اور فضا ایک ابہام اور مصیبت میں لپٹی ہوئی نظر آنے لگی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِن پر کوئی نا معلوم جبری آفت مسلّط کر دی گئی ہے جسکے

بوجھ تلے وہ اس طرح دب گئے ہیں جیسے مکان کی چھت ان کے سروں پر آپڑی ہو سارنگیوں کے لرزاں تار خاموش ہو چکے تھے۔ بہت سی عورتیں رو رہی تھیں۔ مردوں کی نگاہیں دھندلی پڑ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے سب سے پہلے اپنی ماں کو تلاش کیا۔ اس نیک عورت نے اپنا چہرہ شال میں چھپا لیا تھا۔ باپ کی نگاہیں فرش پر گڑ گئی تھیں۔ آخر اس نے اپنے شوہر پر نظر ڈالی۔ لیکن صرف ایک لمحہ کے لیئے تاکہ شاید اسی کی نگاہوں سے اس حادثہ کے متعلق کچھ معلوم ہو۔ لیکن اس نے بھی اس سے نگاہیں پھیر لیں۔

اس وقت اس کا باپ اٹھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایک ہی لمحے میں وہ بوڑھا ہو گیا ہے اس کے اعضا لٹک آئے تھے اور اس طرح ڈھیلے پڑ گئے تھے جیسے انہیں کسی نے کچل دیا ہو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی عاجزی اور مظلومی پیش آئند مصیبت کا خاموش مقابلہ کر رہی ہے اس کا باپ اندر ایک کمرے میں چلا گیا اس کے چہرے کا نور چھن چکا تھا۔ دلہن نے سوچا۔ مجھے ضرور اس کے پیچھے جانا چاہیئے۔ لیکن اس کے لیئے تو بھرا ہوا کمرہ بھی سونا پڑ چکا تھا آخر اس نے سب سے نگاہیں پھیر لیں وہ جانتی تھی کہ اس وقت حاضرین میں ہر فرد کی حیثیت ایک تماشائی کی سی ہے یہی وجہ تھی کہ ان کے جذبہ استعجاب وتفتیش سے اسے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے اپنے سر کا زیور ایک بار معلوم ہو رہا تھا اب وہ اپنی ماں کے قریب آئی تو اس کے چہرے سے درشتی کے آثار غائب ہو چکے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اپنی ماں سے ملتجی ہوئی کہ وہ چپکے سے اسکے پیچھے پیچھے آ جائے

ماں نہایت بزدلی اور فرمانبرداری سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے بس آنسوؤں ہی میں غسل کر لیا ہے۔

وہ اندر چلی گئیں اور ان کے پیچھے دروازہ بند کر لیا گیا۔

ماں اس کے باپ سے نہایت مدلل انداز میں کہنے لگی "اس سے اس بات کے متعلق کچھ نہ کہنا۔"

لڑکی نے دل میں سوچا کہ ایک ماں کے لیے اس موقع پر ایسے لفظ کہنا کس قدر طفلانہ حرکت ہے۔ لیکن پھر وہ خود ہی سمجھ گئی کہ محبت ہی اس سے یہ سب کچھ کہلا رہی ہے۔ بہر حال لڑکی نے محسوس کر لیا کہ ابھی ابھی اس کے دل پر کوئی سخت چوٹ پڑنے والی ہے۔ ناگہاں باپ بول اُٹھا "میری بچی تمہیں رات تعلقہ دار کے ساتھ بسر کرنی ہوگی"۔

دلہن نے اپنی نحیف آنکھیں کھولیں۔ اس کے دل پر چوٹ پڑ چکی تھی وہ حیران تھی کہ وہ اب تک زندہ ہے!؟ یکایک اس کے دہشت زدہ نحیف جسم میں مزاحمت کی ایک زبردست قوت پیدا ہو گئی۔

"مجھے وہاں بلایا ہی گیا ہے نا لیکن میں ابھی وہاں گئی تو نہیں" یہ الفاظ اس نے کچھ اس خشمگیں انداز سے کہے جیسے اُس نے کسی ایسی کیل پر ضرب لگائی جو اسے دکھائی نہ دے رہی ہو۔

باپ افسردگی سے کہنے لگا "یہاں کے شرفا کا قانون یہی ہے جس کے آگے

یارائے دم زدن نہیں۔ یہاں کے دربار میں رحم کی کوئی جا نہیں۔"

اس کی غرور سے اکڑی ہوئی گردن پر باپ کے الفاظ بوجھل پتھروں کی طرح پڑے جو اُسے نیچے جھکا دینا چاہتے تھے۔ لیکن دلہن کا انکار اب بھی جاری رہا۔

وہ کہنے لگی "پیغام بھیج دیجئے کہ اس گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔"

اس کے باپ نے یہ الفاظ اس طرح سنے جیسے یہ کسی کمسن بچے کی تقریر ہو۔

"میری بچی ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔"

"ہم بھیک مانگ لیں گے۔ ہم سب کے سب۔"

"تمہیں تو وہ بہر حال زبردستی لے جائیگا۔"

دلہن نے محسوس کیا کہ وہ دام میں اچھی طرح پھنس چکی ہے۔ لیکن اب بھی اس نے اپنی ہار ماننے سے انکار جاری رکھا۔

وہ کہنے لگی "آؤ انصاف کے لیے جج کے پاس چلیں۔"

وہ بھی تو انہیں شرفا میں سے ہے تم نے سنا نہیں "زار کا مرتبہ بلند ہے خدا تو ابھی آسمانوں میں ہے۔"

وہ ماں سے کہنے لگی۔ "ماں تم کیا کہتی ہو؟"

اس کی ماں آنسو بھر کر کہنے لگی "میری بچی تم اس کی ہوس رانی کا پہلا اور آخری شکار نہیں ہو۔"

دلہن نہایت بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ جان چکی تھی کہ کوئی انکار نہیں کرنا چاہتا۔"

آخر وہ کہنے لگی۔" جان ہی کو میرے پاس بلاؤ۔"

دولہا کو دیکھ کر اس پر حجاب طاری ہوگیا جیسے وہ کسی گناہ کی مرتکب ہوئی ہو۔ وہ آہستہ سے کہنے لگی۔" کیا اس کے بعد بھی تم مجھے واپس لے لوگے؟"

وہ کہنے لگا۔" اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا" اور پھر وہ جلدی سے اپنے فقرے کی تشریح کرتے ہوئے کہنے لگا" میں تمہیں واپس تو لے لوں گا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پھر تم وہی رہو گی جو تم اب ہو۔"

دلہن عاجزی سے کہنے لگی۔" ہاں یہ ایک قدرتی امر ہے" کہنے کو تو اس نے یہ الفاظ کہہ ڈالے لیکن اس طرح جیسے اُسے خود بھی اپنے اِن الفاظ کی صداقت پر پورا پورا یقین نہ ہو چنانچہ خود ہی پھر کہنے لگی" اگرچہ بہت سی دوسری لڑکیاں بھی گئی ہیں اور پھر واپس آگئی ہیں"۔

دولہا تیقن آمیز لہجے میں کہنے لگا۔" دوسری جائیں یا آئیں اس سے کیا غرض لیکن تجھ سی پھر نہ آئے گی۔"

وہ انتہائی غم کے ساتھ کہنے لگی۔" مجھے تمہیں بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

وہ کہنے لگا۔" میں ابھی خود اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔"

"لیکن مجھے اس سے کیا اگر تم مجھے پھر قبول بھی کر لو یا پھر بھی وہی رہو جواب ہو۔ میں تو میں نہیں رہونگی" یہی خیال پہلے بھی اس کے دل میں تھا اور اس کے ادا کرنے کیلئے الفاظ اسے اب ملے تھے۔

لڑکی نے نوجوان پر ایک نگاہ ڈالی لیکن ایک دھند اور تاریکی نے انہیں ایک دوسرے سے پرے پرے کر رکھا تھا۔ اس نے اپنا بازو نوجوان کا ہاتھ پکڑنے کیلئے آگے بڑھایا۔ جیسے اُسے یقین نہ ہو کہ وہ وہیں کھڑا ہے۔ یکایک اُسے محسوس ہُوا کہ کہ رہیں جو آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُن میں کوئی چیز چمک پیدا کر رہی ہے — کیا اس نے کوئی راہ نکال لی ہے؟ وہ حیران ہو گئی۔ اب دُلہن کا ہاتھ نوجوان کے گرم اور کانپتے ہوئے مضبُوط ہاتھ میں تھا۔ جس میں خُون نہایت تیزی اور بیقاعدگی سے دورہ کر رہا تھا وہ محسُوس کر رہی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ کس قدر مضبُوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ یکایک دولہا کے ہاتھ سے کسی نامعلوم طاقت کی ایک لہر بدی کی طرح دلہن کے جسم کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ شاید کہ رہیں کسی زبردست اور نامعلوم طاقت نے جنم لے لیا تھا۔

نوجوان کی آنکھیں دلہن کی آنکھوں سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ خاموشی ہی خاموشی میں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اس سے کچھ چاہنے لگیں۔ . . . . دلہن نے کوشش کی کہ نوجوان کا مطلب سمجھ جائے لیکن اس کے سامنے کہ رہی کہ تھی وہ اپنی دماغی قوت کی گہرائیوں تک پہنچ کر اپنی سمجھ کے مطابق مستفسرانہ نگاہوں سے اس کا مطلب سمجھنے کی

کوشش کرنے لگی۔ اُسے محسوس ہوا کہ میں ابھی ان نگاہوں کی طرف کھنچ کر ان میں غائب ہو جاؤں گی۔ . . . وہ کانپ رہی تھی . . . . . . سامنے کی کھڑکی سُرخ پڑ گئی تھی۔ آخر ایک ہی لمحے میں اور ایک ہی جگہ آکر دونوں کا اتصال ہو گیا۔۔۔ ایک دُوسرے کی محبت میں نہیں ایک دُوسرے کی نفرت میں نہیں بلکہ ایک ہی وقت میں دونوں کے دِل میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوڑ گیا۔

یکایک نوجوان نیچے جُھک گیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ دلہن نے ان پر سے ایک سوال پڑھ لیا:۔

"کیا تم ایک جُرأت کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں"! خاموش جواب تھا۔

ایسا معلوم ہوا کہ یکایک کھڑکی چھپٹ گئی ہے دونوں نے ایک دُوسرے کو ایک چمکتی ہُوئی روشنی میں دیکھا دونوں کی آنکھوں میں صاف صاف ایک عزم دِکھائی دیا۔

لڑکی کہنے لگی:۔ "لیکن کیا مشقت کی قید کاٹنے کے لئے تم بھی میرے ہمراہ سائبیریا چلو گے ——————؟"

"جہاں بھی تم جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔"

"لیکن میں کس سے . . . ." لڑکی کا فقرہ یہاں آکر رہ گیا۔

"اس سے"! کہہ کر نوجوان نے کمر بند سے ایک چمکدار چاقو نکال لیا۔

دونوں نے ایک دوسرے پر ایک ایک افسردہ نگاہ ڈالی۔ ایک دولہا اور دلہن کی طرح نہیں بلکہ دو مجرم ساتھیوں کی طرح جن کے دلوں میں مجرموں کے سے شکوک وشبہات اور باہمی نفرت وحقارت نے ابھی سے جڑ پکڑ لی تھی۔

یکایک نوجوان پر ایک رقت طاری ہوگئی۔

وہ چلا اٹھا۔ "آہ ہماری شادی کی پہلی رات!" لڑکی چونک پڑی لیکن اب بھی وہ اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھی۔

دونوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ آج کی شب —— شب عروسی —— کس قدر شیریں اور عطر بیز ہے۔ لیکن یہی شب —— شب عروسی —— ان کے لئے سائبیریا کے قیدیوں کی تنگ وتاریک جھونپڑی میں آگئی جہاں شاید کسی روزن سے روشنی کی صرف ایک کرن اندر آ رہی ہوگی +

تحفۂ جنّت

تحفۂ جنّت

بحیرۂ اسود کے جنوبی ساحل پر جہاں دریائے ہیلیز سمندر میں گرتا ہے ایک رومی دیہاتی وضع کا مکان کھڑا تھا۔ موسم بہار کی صبح تاباں فضا پر نور کی بارش کر رہی تھی۔ شمال مشرق سے مشامِ جاں معطر کرنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں سمندر کے پانیوں اور باغوں کو طے کرتی ہوئی اس طرف آرہی تھیں جن سے بُت پرست اور عیسائی اسی طرح لُطف اٹھایا کرتے تھے جیسے وہاں کے درختوں کے سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے پتے۔

دنیا سے کہیں بہت دُور سمندر کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کھڑے تھے۔ خوبصورت نوجوان کے سامنے ایک پروردۂ نازوادا حسین لڑکی کھڑی تھی جس نے نوجوان کو دکھانے کیلئے اپنے ہاتھ میں سرخ و شفاف پتھر کا ایک گلدان اٹھا رکھا تھا۔ آفتابِ سحر اس براق پتھر میں ایک شان کے ساتھ چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اور اس سے سُرخ روشنی چھن چھن کر لڑکی کے رخساروں کو چوم رہی تھی جن سے حیا کی سُرخی نے ایک اور سُرخی میں پناہ لے لی تھی۔

یہ ایک امیر کی لڑکی ڈوروتھی تھی۔ صوبۂ کیپادوسیہ کا گورنر فرٹیس دیوانہ وار اس کی محبت میں مبتلا تھا۔ اُدھر متعصب گورنر نے نہایت سرگرمی سے نصرانیت آزاری

کی ٹھان رکھی تھی ادھر ڈوروتھی کے والدین کو نئے مذہب کی کشش مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی۔ وہ اسے کھلے بندوں قبول کر لینے کے لئے ہر طرح سے تیار بیٹھے تھے ان کی کوشش یہ تھی کہ نصرانیت کے اس سخت گیر محتسب کے پیہم تقاضوں کو کسی نہ کسی طرح روک دیا جائے اس لئے نہیں کہ وہ اپنے بچوں کے دلوں کو مذہب کی بھینٹ چڑھا دینا چاہتے تھے۔ کوئی ایسی بات تو ان کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور وسیع النظری سے بہت بعید تھی بلکہ اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ کوئی مذہب آزار شخص محبت کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔

خود ڈوروتھی بھی گورنر کی التجاؤں کو درخور اعتنا کیوں سمجھتی وہ اسی گورنر کے محرر تھیوفلس سے رشتۂ محبت جوڑ چکی تھی اور وہی اس وقت اس کے قریب کھڑا گلدان کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

تھیوفلس ایک یونانی خاندان کا چشم و چراغ تھا جسے قدرت نے موزوں قد و قامت کے علاوہ ایک سلجھا ہوا دماغ بھی عطا کر رکھا تھا اور وہ اپنی ہی کوششوں سے نہایت برے حالات پر غالب آ کر اوج و ترقی کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔ اب اُسے ہر جگہ خاص عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن نوجوانی کے تلخ تجربات نے اس کی سیرت میں کچھ عدم اعتماد اور کم گوئی کا مادہ ودیعت کر دیا تھا۔ باوجودیکہ یہ باور کرنے کی کافی وجوہات تھیں کہ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اسی کا ہے اور صرف اسی کا

لیکن اب بھی اُسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آپ ہی آپ کوئی آدمی کس طرح مجھ سے رشتۂ موانست استوار کر سکتا ہے۔ نوجوان ڈورتھی کے حسن کی ایک جھلک ہی اس کی زندگی تھی لیکن یہ دیکھ کر کہ کیپادوسیہ کی سب سے متقدر ہستی نے ڈورتھی سے اظہارِ عشق کیا ہے اُسے اپنے لئے اُمید رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

تاہم ڈورتھی کوشش کر رہی تھی کہ جلد اس کی آرزوئے دل کا کوئی دلفریب نتیجہ نکلے۔ اس وقت وہ بار بار اس کی طرف کچھ ایسی بے تابانہ نظروں سے دیکھتی تھی جیسے اُسے یقین نہ آتا ہو کہ وہ اسی کے پاس کھڑا ہے تھیوفلس پر ہمیشہ سکون اور کچھ بے اعتنائی کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ عورت کا بڑھتا ہوا جذبۂ شوق ضبط کی حد سے باہر آگیا اسی لئے اس نے مذاق ــــ پُرفریب اور خطرناک مذاق ــــ سے چھوٹے چھوٹے فقرے کہنے شروع کئے اور اس کے دل میں جذبۂ رقابت پیدا کر کے اُسے اپنی طرف ملتفت کرنا چاہا اور اس پر یہ بات ظاہر کرنی شروع کی کہ فرشیس مجھے زیادہ عزیز ہے اور میں اس کی زیادہ پرواکرتی ہوں۔ لیکن غریب تھیوفلس ایسے دلکش فریبوں سے محض ناآشنا تھا۔ اگر آشنا ہوتا تو وہ بصد فخر اس وقت جواب میں اپنے جذبۂ رقابت کا اظہار کر دیتا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے چہرے پر تکلیف اور اضطراب کے آثار نظر آنے لگے لیکن صرف اپنے آپ پر قابو حاصل کرنے کیلئے اس نے پھر اپنی فطرتی بے اعتنائی کی پناہ ڈھونڈنی چاہی۔ جو اس کے امکان میں نہ تھی۔ لیکن اس محبت کرنے والی اور

حساس لڑکی نے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اس بات کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور اضطراب انگیز بنانے پر پوری پوری کوشش صرف کر ڈالی۔

تھیوفلس ضلع پوٹائن میں سرکاری کام کے لئے ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈوروتھی کو جب پتہ چلا تو وہ بھی موسمِ بہار کے ابتدائی ایام گذارنے کے لئے اپنے والدین کے ہمراہ یہیں آگئی اور اسی صبح وہ بڑے حیلوں بہانوں سے بہلا پھسلا کر اسے کسی نہ کسی طرح درختوں کے اس جھنڈ میں لے آئی تھی تاکہ کچھ یہ بھی معلوم ہو کہ اتفاقاً ہی وہ وہاں آگئے ہیں اور کچھ یہ کہ تھیوفلس کو یہ بھی پتہ چل جائے کہ یہ اقدام اسے چاہنے والی ڈوروتھی نے دانستہ تمہیدِ کرم باندھنے کے لئے کیا ہے۔

وہ اُسے ایک گلدان دکھا رہی تھی جو اس کے ایک عزیز چچا نے اُس کی سالگرہ کی تقریب پر بطورِ تحفہ بھیجا تھا۔ ڈوروتھی کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ اسے کیوں خوشی نہ ہوتی جب اس کا محبوب ایک تنہا جگہ میں اس کے قریب کھڑا تھا اور خوش تھا اور وہ اسے ایک خوبصورت چیز دکھا رہی تھی۔ یکایک تھیوفلس کے دل میں ہیجان و اضطراب کا ایک طوفان اُٹھا۔ اب اس کے ہونٹوں سے وہ مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی جو محبوب کے باوفا ہونے کی صورت ہی میں عاشق کے ہونٹوں پر نظر آسکتی ہے یکایک اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔

شاید قدماءِ حسد کے اُس دیوتا کو کوئی نام دینا بھول گئے ہیں جو عاشق اور معشوق

کی آنکھوں پر عین اُس وقت پردہ ڈال دیتا ہے جب اُن کے عیش و مسرت کے دِن آتے ہیں اور خود بخود اُن کے مُنہ سے کچھ کے کچھ الفاظ کہلا دیتا ہے۔

ڈورو تھی نے اِس پر اعتماد کرتے ہوئے گلدان اس کے ہاتھ میں دے دیا جب تھیوفلس نے پوچھا کہ یہ اسے کس نے دیا ہے تو وہ وفورِ مسرت سے ازراہِ مذاق اس سے کہنے لگی "فریشیس نے" ڈورو تھی کو پُورا پُورا یقین تھا کہ اب کے وہ ضرور میرے مذاق کا مطلب سمجھ جائے گا۔ شاید فریشیس اس حقیقت کو خوب سمجھ لیتا جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا لیکن تھیوفلس کو یقین ہو گیا کہ ڈوروتھی کو تحفہ ملنے پر اور تحفہ دینے والے کی یاد میں بے اندازہ مسرت حاصل ہو رہی ہے اور وہ ایک خوفناک پھندے میں پھنس گیا ہے۔ اس کا جسم شل ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی اور اس کی آنکھیں نیچے کو جھک گئیں۔ آخر اس نے چپکے سے جھلملاتے ہوئے گلدان کو نیچے گرا دیا جو گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہ ڈوروتھی کا پہلا غم تھا۔ وہ اب مذاق کو بھول چکی تھی۔ وہ نہایت افسردگی سے جھک کر گلدان کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے کہنے لگی "یہ کیا بے پروائی ہے"! اس نے تھیوفلس کے چہرے پر نظر نہ ڈالی نہیں تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ متغیر ہو رہا ہے۔ ڈوروتھی بالکل بھول چکی تھی کہ اسی نے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا۔

جب وہ دوبارہ سنبھل کر اُٹھی تو تھیوفلس بڑے غرور سے اپنے جذبات پر قابو حاصل کر چکا تھا۔ اس نے ڈوروتھی پر ایک غم انگیز اور بے اعتنائی کی نگاہ ڈالی

اور طنزاً اس سے معافی کی درخواست کی اور ٹوٹے ہوئے گلدان کا پورا پورا معاوضہ ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے سلام کہہ کر باغ سے چل دیا۔

ڈوروتھی کا غمگین چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور اس کی نگاہیں تھیوفلس کے نحیف سراپا پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا سفید چغہ اپنے گرد لپیٹے آگے ہی آگے جا رہا تھا۔ اس کے سیاہ گھونگریالے بالوں والا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے خیالات ڈوروتھی کے خیالات سے کہیں بہت دُور مصروفِ کشمکش ہیں۔

سمندر کی سیمیں لہریں آہستہ آہستہ نہایت نرمی سے کنارے کی مرمریں سیڑھیوں کو چھو رہی تھیں۔ سامنے کی لامتناہی وسعتوں پہ ایک سکوت طاری تھا اور ڈوروتھی کے فریب اور شرارتیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔

اس نے روتے ہوئے گلدان کے ٹکڑے اُٹھائے تھے اور انہیں چھپانے کے لئے اپنے کمرے کو لے جا رہی تھی۔

وہ کئی مہینوں تک ایک دُوسرے سے نہ ملے۔ تھیوفلس واپس دارالسلطنت کو چلا گیا اور ڈوروتھی بھی خزاں میں واپس آ گئی۔ تھیوفلس کی پوری پوری کوشش یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ ڈوروتھی کو اپنے ساتھ ملنے کا موقع نہ دے کیونکہ اس سے پھر ملنے کا صرف امکان ہی اسے بیتاب اور فکرمند کر دینے کے لئے کافی تھا۔

چنانچہ فی الحال یہ افسانہ ختم ہو کر رہ گیا۔ . .

پس اب قدرتاً یوں ہوا کہ ڈوروتھی نے اپنے والدین کے نئے مذہب میں سکون قلب کی تلاش چاہی۔ جب انہیں اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی نئے مذہب کی شاہراہ پر گامزن ہونے میں اپنی بچی کی پوری پوری حوصلہ افزائی کی۔

اسی دوران میں ڈوروتھی کی چھوٹی مہربانیوں نے گورنر کے دل پر نہایت مضر اثر ڈال لیا اور فریشییس نے موقع پا کر اور بھی زیادہ شدت اور سرگرمی سے اظہارِ عشق شروع کر دیا۔ بظاہر یوں معلوم ہونے لگا کہ اُسے ڈوروتھی سے کہیں زیادہ اپنی بدنصیبی کا احساس ہے اور اس نے کسی طرح ہمت نہ ہاری۔ جب اسے مایوسی ہوئی تو اس نے ان کے نئے مذہب ہی کو آلہ کار بنا لیا اور خوشامد کے ساتھ ساتھ باتوں باتوں میں ان کی مذہبی سرگرمیوں کو بند کرنے کی ذلیل دھمکیاں بھی دینے لگا۔ لیکن ڈوروتھی بلا خوف نیا مذہب قبول کر چکی تھی وہ اس سے ملتفت ہونے سے یوں پھر گئی جیسے کوئی غیر مادی سایہ دکھائی دیئے بغیر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

تھیوفلس کو بھی تمام معاملات کے متعلق آگاہی ہو چکی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی محبوبہ کس قدر یاس آمیز زندگی بسر کر رہی ہے اور وہ یہ خبر سن کر حیران رہ گیا کہ ڈوروتھی گورنر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ اگرچہ اس کا مذہب وہی پرانا تھا تاہم مریم عذرا کا نیا مذہب اس کے راستے میں سدِ راہ نہ ہوا تھا۔ اس کا دل

ڈوروتھی کی ہمدردی سے بھر گیا۔ اس نے پھر اس کے ہاں جانا شروع کر دیا تاکہ اچھی طرح معلوم ہو سکے اور وہ خود سن سکے کہ کیا کیا کچھ ہو رہا ہے لیکن جہاں بھی وہ ہوتی اور نہایت آرزو انگیز اور اشتیاق آمیز الفاظ میں جو کچھ وہ کہتی وہ یہی ہوتا کہ میں نے آسمانی دولہا تلاش کر لیا ہے۔ جو اپنے غیر فانی حسن کے ساتھ مجھے اپنے پُر نور سینے سے لگانے کی خاطر میرے لئے زندگی جاوید کے پھول لئے میرا انتظار کر رہا ہے"۔

ایسا طرز گفتگو تھیوفلس کی سمجھ سے بالاتر تھا وہ ایسے الفاظ سن کر پریشان اور فکرمند ہو جاتا اور اسے سخت تکلیف ہوتی۔ اس کے دل میں اس نامعلوم دیوتا کے خلاف رقابت اور درد و کرب کا ایک طوفان اُٹھ آیا جو ایک فانی عورت کے دل کو اس سے پھسلا رہا تھا۔ تھیوفلس ڈوروتھی کے اس پرجوش اور بے اعتنا اندازِ تکلم کی تشریح دیوتاؤں کے متعلق قدیم اعتقادات کے مطابق ہی کر سکتا تھا۔ اس کا رقیب ایک دیوتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے وقار کو کچھ زیادہ ٹھیس نہیں پہنچی تھی تاہم اس کی ہمدردی ایک ایسی عورت سے مفقود ہونے لگی جو دیوتاؤں کی امیدِ وصل پر جی رہی تھی۔ دراصل ڈوروتھی کی گذشتہ بے ثمر اور ناکام محبت ہی اس کے منہ سے یہ الفاظ کہلا رہی تھی۔ جیسے تھیوفلس کے دل میں جذباتِ محبت نے آگ لگا رکھی تھی اسی طرح ڈوروتھی کا دل بھی ایک آتشیں خلش سے خالی نہیں رہا تھا۔

سو اسی طرح کچھ عرصہ گذر گیا۔ فرنشین نے معاملات کو سرے سے ختم

کرنے کی ہی ٹھان لی۔ عیسائیوں کے متعلق حکومتِ وقت کے تازہ فرمان کی آڑ لے کر اس نے ڈوروتھی اور اس کے والدین کو قید کر دیا لیکن ڈوروتھی کو اس نے ایک علیحدہ تاریک حجرے میں بند کر دیا اور بار بار اس کے مذہبی اعتقادات کا امتحان لیتا اور ہر روز آ کر سنتا کہ وہ بلند آواز آہوں کے ساتھ مسیح کو دنیا کا سب سے بڑا سردار اور اپنا محبوب منگیتر کہہ رہی ہے۔ گورنر کے دِل میں رقابت کا ایک طوفان اُٹھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈوروتھی کا کام تمام کر دے گا اس نے حکم دیا کہ پہلے اس کو سخت عذابناک سزائیں دی جائیں پھر بھی وہ اپنے ارادوں سے باز نہ آئے تو اسے ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ اِسے لوہے کی سلاخوں کے بستر پر ڈال دیا گیا اور آہنی بستر کو آہستہ آہستہ آگ کی گرمی پہنچائی جانے لگی۔ لوہے کی سلاخیں لحہ بہ لحہ گرم ہونے لگیں اور ایک نازک جسم فرطِ درد سے تھرا گیا۔ ہر تھوڑے وقفے کے بعد اس کی دردناک چیخیں گلے میں اٹکتی ہوئی باہر نکلنے لگیں اس کے جکڑے ہوئے اعضا کانپ کانپ جاتے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی دوران میں تھیوفلس نے بھی یہ واقعہ سُن لیا وہ بالعموم عیسائیوں کے خلاف ایسے افعال شنیعہ میں حصہ نہ لیا کرتا تھا۔ جب اُسے اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بے کل اور دہشت زدہ ہو کر فوراً وہاں پہنچا وہ بھول گیا کہ یہ بات میرے لئے باعثِ نقصان ہوگی۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا ڈوروتھی کے پاس جا پہنچا۔ جب اس نے

ڈوروتھی کی ہلکی ہلکی چیخیں سُنیں تو اس نے جھپٹ کر ایک سپاہی سے تلوار چھین لی اور ایک جست میں اس کے شہادت کے بستر کے قریب جا پہنچا۔

وہ ایک زہر خندہ ہنسی ہنس کر کہنے لگا "آہ ڈوروتھی اور عذاب سہے" اور اب اس نے اس کی زنجیریں کاٹنی شروع کیں۔ یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے ڈوروتھی تمام تکلیف بھول گئی ہے۔ اس کے چہرے پر مسرت جھلکتی ہوئی دکھائی دی اور وہ جواب میں کہنے لگی "تھیوفلس ڈوروتھی کو عذاب کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو اپنے محبوب کی پھولوں کی سیج پر لیٹی تھی۔ دیکھو آج میری شادی ہو رہی ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر پھر ایک شیریں اور شرارت آمیز مسکراہٹ دکھائی دی اور اس کی آنکھوں کے پیمانوں میں سرور کی سی کیفیت چھلکنے لگی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ بہشت کی لطیف فضاؤں کا نور اس کے چہرے اور بستر پر چمکنے لگا ہے اور ڈوروتھی کا فقرہ ختم ہونے کے بعد فضا پر ایک مقدس سکوت چھا گیا ہے لیکن تھیوفلس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ اس نے اسے پرے پھینک دیا اور وہ اپنی حرکت پر اس طرح خفیف اور نادم ہو کر چلا گیا جس طرح وہ اُس دن سمندر کے کنارے کے باغ سے خفا ہو کر چلا گیا تھا۔

اس کے بعد آگ دوبارہ تیزی سے بھڑکی ڈوروتھی آہیں بھر بھر کر موت کی دُعائیں کرنے لگی اور اس کی یہ دعائیں قبول بھی کر لی گئیں اب اسے مقتل میں فنا،

کرنے کے لیے لایا جارہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی ایک پُرغضب اور رحم ناآشنا ہجوم پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ ڈوروتھی نے دیکھا کہ تھیوفلس بھی راستے میں ایک طرف کھڑا ہے اور اس کی آنکھیں اُس کو دیکھ رہی ہیں۔ دونوں کی نگاہیں پھر ایک دُوسرے سے ملیں ڈوروتھی ایک لمحے کیلئے بے حس وحرکت کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی " تھیوفلس کیا تم جان سکتے ہو کہ میرے آقا کے پھولوں کے باغ کس قدر دلفریب اور عالی شان ہیں جہاں میں ابھی ابھی جارہی ہوں۔ وہاں درختوں میں جو سیب آتے ہیں وہ شہد سے کہیں زیادہ شیریں ہیں آؤ میرے ساتھ تم بھی آؤ!"

تھیوفلس کے چہرے پر ایک بے کیف و درد آشنا مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگا۔ " ڈوروتھی میں تمہیں کیا جواب دوں تم جو وہاں چلی ہو میرے لئے بھی اپنے کچھ پھل اور پھول بھیج دینا تاکہ میں ان کی آزمائش کرلوں "۔

ڈوروتھی نے ایک اندازِ تلطف کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دی اور آگے چلی گئی۔ تھیوفلس پیچھے رہ گیا تھا وہیں سے اسے دیکھتا رہا تھا یہاں تک کہ جلوس کے پیچھے پیچھے جاتا ہوا گرد و غبار کا بادل جس پر خورشیدِ شام زرفشانی کررہا تھا۔ فضا میں غائب ہوگیا۔ ہر طرف ایک سناٹا چھا گیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر پہنچا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چھت کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا جہاں سے کوہِ آرگس صاف نظر آتا تھا۔

اسی کے دامن میں منتقل تھا۔تھیوفلس کو لوگوں کا تاریک اژدہام اب صاف صاف نظر آرہا تھا۔ فرطِ اضطراب سے اس نے اس طرف باہیں پھیلادیں۔ ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں اسے جلاد کی کلہاڑی کی چمک دکھائی دی۔ اس کا سر چکرا گیا اور وہ نیچے گر گیا۔ ڈورتھی کا سر بھی اسی لمحے میں تن سے جدا ہوا تھا۔

اسے وہاں بے حس و حرکت پڑے زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اسے یکایک محسوس ہوا کہ جھٹ پٹے کی تاریکی ایک سیلِ نور میں مبدل ہوگئی ہے اور یہی نور اس کے ہاتھوں سے جن سے اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا گذرتا اور چکاچوند پیدا کرتا چمکتے ہوئے سونے کی طرح اس کی آنکھوں میں چلا گیا ہے۔ ایک لحظے میں فضا ایک شیریں خوشبو سے مہک اٹھی۔ نوجوان جوش میں آکر اُٹھ بیٹھا۔ جیسے یکایک اسے نئی زندگی عطا کردی گئی ہو۔ ایک سنہری گھنگریالے بالوں والا خوبصورت لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انجم افشاں زرتار لباس جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور اس کے چاند سے ننگے پاؤں نور کو شرمار ہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی جس میں کچھ گلاب کے پھول رکھے تھے۔ لیکن ایسے پھول جواب تک کسی انسانی آنکھ نے نہیں دیکھے اور ان پھولوں پر باغ بہشت کے تین سیب پڑے تھے۔ لڑکے کے ہونٹوں پر بچوں کی سی معصوم اور رحم آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ شرارت سے کہنے لگا "یہ ڈورتھی نے بھیجے ہیں" اس کے بعد اس نے وہ ٹوکری تھیوفلس کے ہاتھوں میں دے دی اور یہ

کہہ کر "گیا تم نے حقیقت میں اسے اچھی طرح تھام لیا ہے" غائب ہو گیا۔

اور تھیوفلس نے سچ مچ وہ ٹوکری اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی کیونکہ یہ لڑکے کے غائب ہونے کے ساتھ ہی غائب نہیں ہو گئی تھی۔ ہر سیب پر دو چھوٹے چھوٹے دانتوں کے نشان کر دیئے گئے تھے کیونکہ زمانہ قدیم کے عشاق میں یہی دستور چلا آتا تھا۔ تھیوفلس نے تاروں بھرے روشن آسمان کے نیچے آہستہ آہستہ انہیں کھانا شروع کیا۔ یکایک اس کے دل میں آرزوؤں کی ایک میٹھی میٹھی آگ بھڑک اُٹھی اس نے ٹوکری کو زور سے اپنے سینے کے ساتھ دبا لیا اور اسے اپنے لبادے میں چھپائے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا بازاروں میں دوڑتا ہوا گورنر کے محل پر پہنچا۔ وہ اس وقت میز کے سامنے بیٹھا گولچیا کی شراب پی پی کر اپنی آتشِ غضب فرو کر رہا تھا۔

چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ تھیوفلس اس کے سامنے آیا۔ اور ٹوکری پرے پہ وہ اٹھائے بغیر مکان کے سامنے کھڑا ہو کر چلا اُٹھا "میں ڈورتھی کا مذہب قبول کرتا ہوں جسے ابھی ابھی تم نے ہلاک کر ڈالا ہے۔ یہی سچا مذہب ہے"۔

گورنر بول اُٹھا "ہاں جاؤ تم بھی اس جادوگرنی کے پیچھے۔ وہ یکایک مشتعل ہو کر دل میں جذبۂ رقابت کا ایک طوفان لیے اچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ "اسے ایک گھنٹے کے اندر اندر قتل کر ڈالو"۔

سوا سی دن تھیوفلس کو ڈورتھی کا وصال جاوداں حاصل ہو گیا۔ ڈورتھی نے

سکون پرور نور افشاں نگاہوں سے اپنے محبوب کا خیر مقدم کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے دو قمریاں طوفان میں ایک دوسرے سے بچھڑ کر اپنے گھر کے گرد پرواز کے پہلے چکر ہی میں ایک دوسرے سے پھر آملیں۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک لمحہ توقف کئے بغیر آسمان کے بلند تریں حلقوں میں گھومنے لگے۔ انہیں اپنا دنیوی وجود محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تھے بھی اور نہیں بھی تھے۔ وہ نہایت زندہ دلی اور مسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور آسمانوں کی فضائے لطیف کی دوریوں میں غائب ہو گئے لیکن اب بھی وہ جانتے تھے کہ ایک کہاں ہے اور دوسرا کہاں۔ ایک کیا سوچ رہا ہے اور دوسرا کیا اور جب ان میں سے کوئی ایک وہاں کی مخلوق کو محبت کے شیریں جذبے کی فراوانی سے معمور ہو کر بے اختیار چوم لیتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ صرف وہی نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بے تاب ہو کر ایک دوسرے سے آملے لیکن اس بے تابی میں درد یا بے صبری کو کوئی دخل نہیں تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پھر ڈھونڈ لیا تھا اب وہ یا تو ایک صاف و شفاف ندی کی طرح فضا میں بہا کرتے یا ایک دوسرے کے خیالوں میں غرق ہو جاتے۔ اس لامحدود دُنیا میں ان کی نگاہیں دور و نزدیک پڑنے لگتیں لیکن ایک مرتبہ ان پر ایک ایسی شیریں خود فراموشی چھا گئی۔ کہ وہ تثلیث کے مقدس قصرِ بلوریں کے بہت ہی نزدیک جا پہنچے۔ اندر جاتے ہی انہیں پھر اپنی کوئی خبر نہ رہی اور کسی ماں کے رحم کے دو توام بچوں کی طرح ان پر ایک نیند

طاری ہو گئی اور غالباً اب تک وہ وہیں سوئے پڑے ہیں اور سوتے رہیں گے بشرطیکہ اس عرصے میں انہوں نے کسی طرح باہر کی راہ نہ پالی ۔

یونانی غلام کی سرگزشت

یونانی غلام کی سرگزشت

میں یونان میں پیدا ہوا۔ میرے والدین سمرنا میں غربت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب میں بیس برس کی عمر کو پہنچا۔ تو میرے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اب مجھے اپنے لِئے ذریعہ معاش کی فکر ہوئی۔ اس سے پہلے بھی میں ایک یہودی شراب فروش کی ملازمت کر چکا تھا۔ چنانچہ میں پھر اسی کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب مجھے وہاں کام کرتے ہوئے تین سال گذر گئے۔ تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جو میری گذشتہ خوشحالی اور موجودہ تباہی کا موجب ہوا۔

جس وقت کا ذِکر میں کر رہا ہوں۔ اِن دنوں میں نے اپنی محنت اور میانہ روی سے اپنے آقا کو ایسا خوش کر دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کا منظورِ نظر ہو گیا بعض دفعہ وہ صرف شراب خانے کا انتظام میرے سپرد کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی مجھے خود ہی تمام کام کرنا پڑتا۔ اس وقت میرے ذمہ شراب کو چھان کر صاف کرنا اور اسے ہر طرح سے تیار کر کے بازار کے لِئے قابلِ فروخت بنانا تھا۔

میرے ماتحت ایک حبشی غلام بھی کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک نہایت طاقتور گرانڈیل اور ضدی شخص تھا بعض دفعہ میرے مالک کے لِئے اس سے کام لینا تقریباً دشوار ہو جاتا

اسے زبردست سے زبردست سزا دی جاتی۔ لیکن اُس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غضب ناک اور ڈھیٹ ہو رہتا۔ جب کبھی میں اس کا کوئی قصور معلوم کرتا جو بے پروائی کے باعث اُس سے سرزد ہوا ہو۔ تو اُس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا۔ کہ کہیں کسی وقت وہ مجھے جان ہی سے نہ مار ڈالے۔ میں نے اپنے مالک سے کئی دفعہ التجا کی کہ وہ اُسے ملازمت سے علیحدہ کر دے۔ لیکن چونکہ وہ نہایت مضبوط اور قوی آدمی تھا۔ اور حسبِ مرضی شراب کا بڑے سے بڑا کُپا بھی بغیر کسی کی مدد کے اُٹھا لے جاتا تھا۔ اِس لئے میرے مالک کو اُس کا لالچ میری پیہم التجاؤں کے باوجود بھی حبشی کو علیحدہ کرنے سے باز رکھتا۔

ایک صبح جب میں شراب خانے میں داخل ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ حبشی غلام اُس کُپّے کے قریب غافل سو رہا ہے جو میں نے اُسے فوراً صاف کرنے کیلئے دیا تھا۔ اور جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ضرور اُسے اب تک صاف کر چکا ہو گا۔ مگر اُس کی غفلت دیکھ کر جی میں آیا کہ مار مار کر اس کی تمام سُستی نکال دُوں۔ لیکن اُس کو سزا دینے کی مجھے خود جرات نہ ہوئی اور میں اپنے آقا کو بُلا لایا۔ تاکہ وہ اس کے طرزِ عمل کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے۔ میرا یہودی آقا اُس کی غفلت اور سُستی دیکھ کر سخت برہم ہُوا۔ اس نے ایک لکڑی اُٹھا کر زور سے حبشی کے سر پہ دے ماری۔ حبشی غصّہ کے مارے جست بھر کر اُٹھ کھڑا

ہوا۔ لیکن جب اُس نے میرے بجائے آقا کو ہاتھ میں لکڑی لئے ہوئے دیکھا۔ تو وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اور ساتھ ہی آقا سے جاتی دفعہ کہہ گیا۔ "اتنا ہٹ پٹ کر تو میں بھی یہاں کام نہیں کرونگا"۔ جب میرا آقا شراب خانے سے باہر چلا گیا تو حبشی مجھ پر برس پڑا۔ کہ تم نے میرے خلاف کیوں اطلاع دی تھی۔ وہ لکڑی کا ایک سانٹا پکڑ کر مجھ پہ جھپٹا تاکہ میرا سر اس سے پاش پاش کر دے میں جلدی سے پیپے کی آڑ میں ہو گیا اُس نے مجھ پہ پھر حملہ کیا۔ رستے میں ایک کلہاڑی پڑی تھی۔ جب میں نے اپنی مدافعت کے لئے اس پر ہاتھ ڈالا۔ اُس وقت حبشی ایک سٹول سے ٹھوکر کھا کر زمین پہ آن گرا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی کلہاڑی سے اُس کے ایسی ضرب لگائی کہ اُس کی کھوپڑی بالکل پھٹ گئی۔ اور اب وہ میرے قدموں میں مُردہ پڑا تھا۔

اس واقعہ سے میں سخت دہشت زدہ ہو گیا۔ اگرچہ میں نے جو کچھ کیا تھا محض اپنی جان بچانے کی خاطر کیا تھا۔ اور میں اپنے آپ کو بالکل حق بجانب خیال کرتا تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا کہ میرا آقا حبشی کی موت پہ بہت رنجیدہ ہو گا۔ اور ممکن تھا کہ وہ غصہ میں آ کر مجھی کو قصور وار ٹھہراتا۔ چونکہ اس وقت کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہ تھا۔ جو میری بے گناہی کی شہادت دے۔ اِس لِیے بہت ممکن تھا کہ میں قانون کے شکنجے میں بُری طرح جکڑا جاتا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے یہ تدبیر سوجھی۔ کہ حبشی یہ تو کہہ ہی چکا ہے کہ "میں اس طرح ہٹ کر یہاں آئندہ کام نہ کروں گا" اِس لئے میں اپنے آقا کو بہت آسانی

سے یہ یقین دِلا سکوں گا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بھاگ گیا ہے۔ اور اس عرصہ میں اُس کی لاش کہیں چھپا دُونگا۔ لیکن یہ بھی تو کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس کی لاش کو باہر نکالنے میں مجھے اپنی پُوری قوت سے کام لینا پڑا۔ مگر آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کی لاش ایک پیپے میں ڈال کر اور اس کا ڈھکنا کیلوں سے جڑ کر اُسے گودام میں رکھ آیا۔ جہاں مجھے آئندہ سال کی بکری کے لیئے اُس کو شراب سے بھرنا تھا جب یہ پیپا اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ تو میں نے ایک لمبی نلی کے ذریعے سے تالاب کی شراب سے اس کو بھر دیا۔ اب مَیں نے محسُوس کیا کہ ایک بھاری بوجھ میرے دماغ سے اتر گیا ہے۔ کیونکہ کافی عرصہ تک اس راز کے افشا ہونے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔

میں اپنا کام ختم کر کے بیٹھا ہی تھا۔ کہ میرا مالک بھی شراب خانہ میں آ موجود ہوا۔ اور اس نے دریافت کیا کہ حبشی کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا "وہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ وہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ یہاں آئندہ ہرگز کام نہ کرے گا" میرے آقا نے اس کی گرفتاری کے لیئے پولیس میں اطلاع دے دی تاکہ وُہ اپنے بہترین نوکر کو کہیں کھو نہ بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب "فرار شدہ" حبشی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ تو یہ خیال کر لیا گیا۔ کہ اُس پاگل نے غصہ کی حالت میں خُودکشی کر لی ہوگی۔ اس کے بعد نہ تو اُس کے متعلق کچھ کہا گیا نہ سُنا گیا۔ پہلے کی طرح میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ چُونکہ میں اس وقت شراب خانے پر پُوری طرح سے مسلط ہو چکا تھا۔ اس لیئے مجھے

امید واثق تھی۔ کہ میں کسی نہ کسی دن چھپکے سے اپنا بوجھ اُٹھا کر شراب خانے سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاؤنگا۔

جب بہار کا موسم پھر شروع ہوا۔ تو میں بھی اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں ترک سپاہ کا سردار جسے آغا کہتے تھے آ موجود ہوا۔ یہ لوگ عام طور پر نہایت ظالم اور خود مختار ہوا کرتے تھے۔ جہاں جاتے ایک تہلکہ بپا کر دیتے۔ وہ آغا بھی انہی میں سے ایک تھا چونکہ اس کے تمام مصاحب عوام سے روشناس تھے۔ اس لئے وہ ان کو شراب خریدنے نہ بھیجتا۔ بلکہ خود ہمارے شراب خانے میں آ کر ایک کپا پسند کر لیتا۔ جسے ایک پالکی میں رکھ کر اس کے پردے گرا دیئے جاتے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا کہ آغا نے کوئی نئی خاتون حرم میں داخل کی ہے۔ میرے آقا نے آغا کو شراب کے وہ سب کپے دکھائے جو اس سال کی فروخت کے لئے تیار کئے جا چکے تھے۔ اور دو قطاروں میں رکھ دئے گئے تھے۔ اس نے دو تین کپوں کی شراب چکھی۔ لیکن اس کو پسند نہ آئی۔ اور کہنے لگا "دوست ایسچر تمہاری قوم سے جہاں تک ممکن ہو۔ ہمیشہ بدترین مال سب سے آگے رکھتی ہے۔ میرے خیال میں جو شراب تم نے مجھے دکھائی ہے۔ اس سے بہتر پچھلی قطار میں ہوگی۔ ذرا اپنے یونانی سے کہو تو کہ مجھے اس کپے کی شراب چکھائے۔" اس نے اس کپے کی طرف اشارہ کیا جس میں حبشی بند تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ جونہی آغا وہ شراب چکھے گا۔ اس کا منہ بدمزہ ہو جائے گا۔ اور وہ اسے فوراً تھوک دے گا۔ اس لئے

میں نے جلدی سے اس شراب کا ایک گلاس بھر کر آغا کو پیش کر دیا۔ اُس نے اس کو چکھا اور پھر نہایت حیرت و استعجاب سے اس کو روشنی میں لے جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اُس نے اُس کو پھر چکھا۔ اور چٹخارے لے لے کر پینا شروع کر دیا۔ پھر وہ میرے مالک کی طرف مخاطب ہو کر یُوں گویا ہُوا "کیوں بے یہودی کُتّے تو مجھے صریح دھوکا دینا چاہتا تھا۔ جب تیرے پاس ایسی خُوش ذائقہ مزے دار اور لطیف شراب موجُود تھی جسے بہشت کی حُوریں بھی مزے سے گھونٹ گھونٹ پئیں!"

آقا نے مجھ سے پُوچھا "کیا یہ سب شراب ایک ہی قسم کی نہیں؟" میں نے جواب دیا۔ ہاں جناب یہ سب ایک ہی قسم ہے۔ آغا کہنے لگا "اچھا ذرا اس کو چکھو تو۔ اور پھر اسے چکھو جو تم مجھے پہلے پیش کر رہے تھے" جونہی آقا نے شراب کا گلاس مُنہ سے لگایا اس کا چہرہ متحیّر ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ بھئی واقعی یہ شراب تو بڑے مزے کی ہے لیکن میں حیران ہُوں کہ کیا بات ہے۔ "پیرس ذرا اس کو چکھو تو"۔ میرا دل اس شراب کے چکھنے کو ذرا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں نے نہایت بد دلی سے تھوڑی سی چکھ کر اس کی تائید کر دی۔

آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی کہ اُس نے پچھلی قطار کے دو تین کُپّوں کی شراب چکھ ڈالی یہ اُمید کرتے ہُوئے کہ شاید اُسے ایسی ہی شراب کچھ اور مل جائے۔ جب اُسے ایسی شراب نہ ملی۔ تو اُس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اس کُپّے کو گھر لیجائیں

اُنھوں نے وہ کُپّا پالکی میں رکھ دیا۔ اور اُسے اُٹھا لے گئے۔

تم اس خوف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو میں نے اس وقت محسُوس کیا جب کہ غلام شراب کا وہ کُپّا اُٹھا لے گئے۔ میں نے سوچا کہ اب میری جان کی خیر نہیں۔ مجھے فوراً سمرنا سے بھاگ جانا چاہئے۔ میں نے اندازہ کر لیا۔ کہ کتنے عرصہ میں آغا کی شراب ختم ہو گی۔ اور اس کے مطابق نہایت سرگرمی سے تیاری شرُوع کر دی۔ میں نے اپنے آقا سے کہہ دیا کہ میں جا رہا ہُوں۔ کیونکہ مجھے جزیرہ ربنیت میں ایک رشتہ دار نے بُلایا ہے تاکہ میں اس سے مِل کر کوئی کاروبار شرُوع کروں۔ میرا مالک جس کا گذارہ میرے بغیر مُشکل تھا۔ مجھے وہیں ٹھہرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں اپنی ضد کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اس کے پاس ہی رہُوں۔ تو وہ مجھے اپنا حصہ دار بنانے پر تیار ہے لیکن میں نے اس کی یہ بات نہ مانی۔ شراب خانے کے دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہوتا تو میرا دِل دھڑکنے لگتا۔ کہ کہیں آغا اپنے سپاہیوں کے ہمراہ مجھے گرفتار کرنے تو نہیں آ رہا۔ مجھے اگلے دِن روانہ ہونا تھا۔ کہ میرا آقا ہاتھ میں ایک دستاویز لئے شراب خانے میں داخل ہُوا۔ اور مجھ سے یوں کہنے لگا "چیرس شاید تمہیں خیال ہو گا کہ میں نے صرف تمہیں سفر سے باز رکھنے کیلئے اپنا حصہ دار بنانے کا وعدہ کیا ہے! اور در اصل میں تم کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن شک دُور کرنے کیلئے میں یہ دستاویز لایا ہُوں۔ جس کے رُو سے تم میرے نفع کے تیسرے حِصّے کے مالک قرار دیئے گئے ہو۔ دیکھ لو اس

پر قاضی کی مُہرِ تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے۔

آقا نے کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میں انکار کرتے ہوئے واپس کرنے ہی کو تھا۔ کہ کسی نے زور زور سے شراب خانہ کا دروازہ کھٹ کھٹا کر ہمیں دہشت زدہ کر دیا۔ سپاہیوں کی ایک جماعت جو آغا نے ہماری گرفتاری کے لئے بھیجی تھی۔ اندر داخل ہوئی۔ مجھے تو معلوم ہی تھا۔ کہ اصل بات کیا ہے میں اپنے دل میں اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کہ فوراً کیوں نہ بھاگ گیا مگر بات یہ تھی کہ آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی۔ کہ اس نے میرے اندازے سے پہلے ہی چٹ کر ڈالی۔ شراب کے کُپّے کے تیسرے حصّے میں تو غلام ہی سما چکا تھا۔ اس لئے شراب کا اس قدر جلد ختم ہو جانا لازمی امر تھا۔ اب میرے لئے فرار کا کوئی امکان نہ تھا۔ میرا آقا جو اس حقیقت سے نا آشنا تھا۔ بالکل مطمئن تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے سپاہیوں کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن مارے دہشت کے میرا دل پھٹا جاتا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو آغا نہایت غُصّے سے میرے مالک پر برس پڑا۔ اور کہنے لگا "او یہودی کُتّے! کیا تو ایک دیانت دار مومن کے پاس دھوکے سے شراب کا ایک ایسا کُپّا فروخت کرتا ہے۔ جس کا دو تہائی حصّہ بھی بھرا ہوا نہیں۔ فوراً بتا کہ تو نے اس میں بھاری بھاری کیا چیز بھر دی ہے۔"

میرے آقا نے کہا "صاحب میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا بالکل بے قصور

ہوں" آغا نے جواب دیا اچھا کیا خالی تو ہو چکا ہے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا ذرا اپنے یونانی کو بھیجو کہ اندر لے آئے۔ تاکہ اس کو میری موجودگی ہی میں کھولا جائے"۔ دو سپاہی اندر لانے کیلئے روانہ کردیئے گئے۔ جب وہ پاس آئے۔ تو آغا نے مجھے کپّے کا ڈھکنا اکھاڑنے کے لئے کہا۔ اب مجھے اپنی موت کا پورا پورا یقین ہو چکا تھا میں دیکھتا تھا کہ آغا میرے مقابلے میں آقا سے زیادہ ناراض ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ کالے حبشی کی لاش پہچانی جائے گی تو فوراً میرا مالک بری ہو جائیگا۔ اور مجھ پر اس کے قتل کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے جب میں آغا کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کپّے کا ڈھکنا اکھڑ گیا۔ حبشی کی لاش دیکھ کر سب حاضرین دہشت زدہ ہو گئے۔ میں بھی اس کو دیکھتے ہی نہایت خوفزدہ صورت بنا کر پیچھے ہٹا۔ تاکہ مجھ پر سے رہا سہا شک بھی دور ہو جائے۔ لیکن یہ بات بہت عجیب تھی کہ بجائے اس کے کہ حبشی کی لاش بدستور سیاہ رہتی۔ وہ بالکل سفید ہو چکی تھی۔

"خدایا تیری پناہ"۔ میرے مالک کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "اے خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں —— ایک لاش! اے خدا۔ میری مدد کر۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ کیوں جیرس! تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو"؟ میں نے جواب دیا کہ "واللہ میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں"۔

جب ہمارے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ تو آغا میرے مالک کو نہایت غضبناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ جن سے آغا کی بے پناہ نفرت اور حقارت ظاہر ہو رہی تھی۔ باقی تمام حاضرین اگرچہ خاموش تھے۔ لیکن اُن کے بُشرے سے ظاہر تھا۔ کہ وہ میرے آقا کو چیرنے پھاڑنے میں بھی کوئی دریغ نہ کریں گے۔

میرے آقا نے کہا "اے آغا میں بخوشی اس کُتے سے دوسرا تبدیل کر دوں گا۔ لیکن میں لاش کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ آغا نے جواب دیا" یونہی سہی میرا غلام اس کُتے کو ابھی لے آئیگا"۔ تھوڑے ہی عرصے میں غلام شراب کا ایک کُپّا لے کر آموجود ہوا میرا آقا آغا سے کہنے لگا۔ گو ایک غریب یہودی کے لئے یہ بڑا بھاری نقصان ہے۔ تاہم میں یہ مفت آپ کی نذر کرتا ہوں" اور اس نے واپس جانے کے خیال سے اپنی ٹوپی اُٹھالی۔

آغا نے چلا کر کہا" ٹھہر جاؤ میں تمہاری شراب مفت ہی میں ہضم نہیں کروں گا"۔ میرے آقا نے کہا" اچھا تو پھر آپ مجھے اس کی قیمت بھی ادا کر دیں گے۔ آپ بڑے انصاف پسند ہیں۔ آغا نے تیزی سے جواب دیا" ابھی تم کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اور اپنے نوکروں سے کہا کہ وہ اس شراب کو کپّوں میں بھر دیں۔ جب شراب کا کُپّا خالی ہو گیا تو آغا نے اس کا ڈھکن اُتروا دیا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ میرے آقا کو اُٹھا کر اُس میں بند کر دیں۔ اُس وقت میرے آقا کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی

میں اپنے آپ پر لعنتیں بھیج رہا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اپنے آقا کو قصور وار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ میرے کیئے کی سزا اس کو مِل رہی ہے۔ سپاہیوں نے میرے آقا کو اٹھا کر اُس کُپے میں بند کر دیا۔ آغا نے مجھے حکم دیا۔ کہ تم پہلے کی طرح اِس پر کیلوں سے مضبُوط ڈھکنا لگا دو۔ اگرچہ میرا دِل یہ کام کرنے کو بالکل نہ چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس لِئے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آغا نے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ اس کُپّے کو پھر شراب سے بھر دیں۔ اس طرح میرا بے قصور آقا ہمیشہ کے لِئے تباہ کر دیا گیا۔

اب آغا میری طرف مخاطب ہو کر پُوچھنے لگا۔ "تم اس معاملے کے متعلق کیا جانتے ہو"؟ میں نے سوچا کہ اب میرے آقا کی جان تو لی جا چکی ہے۔ اب اگر میں اس کو کچھ بُرا بھلا بھی کہہ لُوں۔ تو اُس کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میں نے آغا کو جواب دیا "حضور میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ کچھ عرصہ قبل ایک حبشی نہایت پُراسرار طریقے سے غائب ہو گیا تھا۔ اور میرے آقا نے اس کی تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ حضور اب مجھے پُورا یقین ہو گیا ہے کہ اس بیچارے کا بھی یہی حشر ہُوا ہو گا۔ اور جناب جب آپ شراب کا وُہ کُپّا اُٹھا لے گئے تھے۔ تو میرا آقا بہت افسوس کرتا رہا۔ شاید اُس نے وہ کسی کے لِئے مخصُوص کر رکھا تھا۔ شاید میری بھی یہی گت بنتی مجھے شک ہے کہ اب باری بھی میری ہی تھی۔ کیونکہ جب میں نے یہاں سے جانے کا اِرادہ کیا۔ تو وہ میرے یہیں ٹھہرنے پر مصر ہُوا جب

میں کسی طرح نہ مانا تو اس نے یہ دستاویز پیش کی۔ یہ پڑھیے۔ اس کے رو سے میں اُس کے نفع کے تیسرے حصّے کا مالک قرار دیا جا چکا ہوں۔ شاید میں اس نفع سے زیادہ دیر متمتع نہ ہو سکتا۔

آغا نے جواب دیا "اے یونانی یہ اچھا ہی ہوا یہ تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہو گا کیونکہ چند شرائط پر تم اُس کی تمام جائداد کے مالک قرار دیے جا سکتے ہو۔ پہلی شرط تو یہ ہے۔ کہ شراب کا یہ کُپّا جس میں یہ حرامی یہودی بند ہے۔ تمہیں اپنے پاس رکھنا ہو گا۔ تاکہ جب میں وہاں آؤں۔ تو اپنے انتقام اور انصاف کی یاد تازہ کر کے خوش ہوا کروں دوسری شرط یہ ہے کہ شراب کا یہ دُوسرا کُپّا بھی تم اپنے پاس رکھو جس میں یہ حبشی غلام بند ہے تاکہ اس کو دیکھ کر میرا غصّہ تازہ ہو جایا کرے۔ آخری شرط یہ ہے کہ میں تم سے جس قسم کی بہترین شراب مانگوں تمہیں مُفت دینی ہو گی۔ کیا تمہیں یہ شرائط منظور ہیں۔ یا میں تمہیں بھی اس گناہ کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ایک سمجھوں۔

میں نے شکر کیا اور یہ سب شرائط مان لیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت کوئی بھی کسی یہودی کی پروا نہیں کیا کرتا تھا۔ جب مجھ سے میرے آقا کی غیر حاضری کے متعلق پُوچھا جاتا۔ تو میں پوچھنے والے کے قریب نہایت رازداری سے جا کر کہتا کہ آغا کے سپاہیوں نے اُسے قید میں ڈال رکھا ہے اور اس کے رہا ہونے تک میں یہاں کام کروں گا۔

آغا کی خواہش کے مطابق شراب کے دونوں کُپے جن میں حبشی غلام اور یہودی تاجر بند تھے ایک بیچ پوسب کُپّوں سے اُوپر سٹور کے درمیان رکھ دیئے گئے۔ آغا ہر شام شراب خانے میں آتا اور گھنٹوں اس کُپّے کی طرف جس میں میرا آقا بند تھا ٹکٹکی لگائے گالیاں دیتا رہتا۔ اس دوران میں وہ اس قدر شراب پیتا۔ کہ اکثر اُس کو تمام رات شراب خانے میں بسر کرنے پڑتی یہ خیال نہ کرنا چاہئے۔ کہ میں نے اُن کُپّوں کے مفید اجزا سے کچھ کام نہ لیا۔ میں رات کو چپکے سے ان کُپّوں میں سے پہلی شراب نکال لیتا اور تھوڑی تھوڑی شراب دوسرے کُپّوں میں ٹپکا دیتا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میرے پاس شراب کا ایک گیلن بھی ایسا نہ رہا جس میں میرے آقا اور حبشی غلام کے عرق کی آمیزش نہ ہو۔ اب میری شراب پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگی تھوڑے ہی عرصہ میں میں ایک امیر آدمی بن گیا۔

تین سال نہایت خوشحالی میں بسر ہوئے۔ آغا میرا مستقل گاہک بن چکا تھا۔ اور کم از کم ہفتہ میں تین بار میرے شراب خانے میں آکر نشے میں چور پڑا رہتا تھا۔ اب اس کی صحبت نے مجھے بھی پکا شرابی بنا دیا۔ ایک روز اُسے حکم آیا کہ اپنی سپاہ لے کر سُلطان کی فوج سے آملے۔

جس دن اس کی فوج کو کوچ کرنا تھا۔ وہ میرے دروازے پر ٹھہرا۔ اور اپنے عربی گھوڑے سے اُتر کر ایک آخری جام پینے آیا اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ

کوچ شروع کردیں۔ وہ بعد میں اُن سے آملے گا۔ اس نے بے تحاشا شراب پینی شروع کی ایک گلاس کے بعد دُوسرا خالی ہوا اور دُوسرے کے بعد تیسرا۔ ساتھ ہی وقت بھی گذرتا گیا رات ہونے کے قریب تھی اور آغا حسب معمول نشے میں مخمور پڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے اصرار کیا۔ کہ میں اُس کو شراب خانے کے ذخیرہ میں جہاں شراب کے دونوں کُپّے رکھے تھے لے جاؤں تاکہ وہ ایک دفعہ پھر میرے آقا کو اچھی طرح گالیاں دے۔ چونکہ اس رات میں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اس لیے میں نشے کے عالم میں آغا سے یُوں گویا ہوا۔

"اے قابلِ ستائش آغا! میرے آقا کو زیادہ گالیاں نہ دیجئے۔ کیونکہ دراصل وہی میری خوشحالی کا باعث ہوا ہے چونکہ آپ اب جا رہے ہیں۔ اس لئے میں آپ پر ایک راز افشا کئے دیتا ہوں ——— میرے ذخیرے میں شراب کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں جو یا تو میرے آقا یا حبشی غلام سے خوشبودار نہ کر دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میری شراب بہترین مانی جا چکی ہے۔"

"ہیں! کیا!!" آغا نے بڑبڑا کر کہا۔ جس کے لیے اب نشے کی حالت میں بولنا بھی تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ "اچھا اے حرامی تیری سزا موت ہے۔ تو بھی اپنے مالک کی طرح کیفر کردار کو پہنچے گا۔" تو ایک مومن کو ایک گنہگار کافر کے عرق والی شراب پلاتا رہا اے دجال! تو ضرور موت کے گھاٹ اُتارا جائے گا۔"

وہ لپک کر میری طرف بڑھا لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور نشے کے عالم میں

وہ دھم سے زمین پر آگرا۔ اور پھر نہ اُٹھ سکا۔ میں نے سوچا کہ یقیناً وہ ہوش میں آنے پر بھی یہ واقعہ نہ بھولے گا۔ اور میں اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤنگا۔ موت کے خوف نے اور شراب کے نشے نے مجھے بتا دیا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے فوراً آغا کو گردن سے پکڑ کر ایک کُپّے میں گھسیڑ دیا اور اُس کا ڈھکنا مضبوط بند کر کے اس کو شراب سے بھر دیا۔ اس طرح میں نے اپنے غریب آقا کا بدلہ لے لیا۔ اور آغا کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو گیا۔ اس کے بعد میں صحن میں گیا جہاں آغا کا گھوڑا بندھا تھا۔ میں نے آغا کی تلوار لیکر بیچارے جانور کو اچھی طرح زخمی کر کے چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے گھر چلا جائے۔ آدھی رات کو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے آغا کے گھر والوں کو جگا دیا۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ گھوڑا زخمی ہو چکا ہے اور آغا اس پر سوار نہیں۔ تو انہوں نے خیال کیا۔ کہ آغا کو دشمن کے کسی گروہ نے راستے میں قتل کر دیا ہو گا۔ اُنہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ آغا کس وقت میرے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے کہا کہ شام ہونے کے ایک گھنٹہ بعد۔ اور میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس وقت شراب کے نشے میں چور تھا۔ چنانچہ وہ اپنی تلوار بھی یہیں بھول گیا ہے۔ میں نے تلوار ان کے حوالے کر دی اب میں اپنے خطرناک راز دار سے رہائی پا چکا تھا۔ اگرچہ وہ میری شراب کا کافی حصہ پی گیا تھا۔ لیکن میں نے بھی اس کی استعمال شدہ شراب پر سود لگا کر نقصان پورا کر لیا۔ یعنی آغا کی آمیزش سے اپنی باقی ماندہ شراب خوشبودار کر لی۔ میں نے یہ تیسرا کُپّا بھی ان دو کُپّوں کے ساتھ رکھ دیا اب مجھے اور بھی زیادہ نفع ہونے لگا۔ اور میری شراب

دُور دُور تک مشہور ہو گئی۔

ایک دفعہ شہر کا قاضی جو میری شراب کی شہرت سن چکا تھا۔ میرے شراب خانے میں آیا۔ میں اپنی اس عزت افزائی پر جھک کر آداب بجالایا۔ میں مدت سے اس کو اپنا خریدار بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی کچھ بہترین شراب گلاس میں ڈال کر قاضی کو پیش کی۔ اور کہا عالی جاہ! یہ میرے آقا کی شراب ہے۔ مرحوم آغا اس کے بڑے شیدا تھے۔ بس جناب وہ تو تمام کا تمام کُپّا ہی اُٹھوا کر لے جایا کرتے تھے۔" قاضی کہنے لگا۔ ہاں یہ بھی خوب تجویز ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے غلام کو برتن دے کر بھیجا جائے۔ یہ بہتر ہے کہ تمام کا تمام کُپّا ایک ہی دفعہ خرید لیا جائے۔ تاکہ انسان لوگوں کے اعتراض سے بچ جائے۔ میں بھی ایسا ہی کرونگا لیکن خریدنے سے پہلے مجھے ذرا چکھ لینی چاہیے" اس نے بہت سے کُپّوں کی شراب چکھی۔ لیکن اس کو سب سے زیادہ پسند وہی آئی جو میں نے پیش کی تھی۔ آخر کار اس نے اُن تینوں کُپّوں پر نگاہ ڈالی جو سب سے اونچے رکھے گئے تھے۔ اور دریافت کیا کہ وہ کیسی شراب ہے؟ میں نے جواب دیا "خالی کُپّے ہیں جناب"۔ لیکن وہ اپنی چھڑی سے کُپّوں کو ٹھوکریں لگا کر کہنے لگا "تم تو کہتے تھے کہ کُپّے خالی ہیں۔ لیکن یہ آواز سے تو بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یقیناً ان کُپّوں میں تم نے بہتر شراب چھپا رکھی ہے ذرا اس کُپّے کی تھوڑی سی شراب تو دکھاؤ۔"

مجھے چار و ناچار تعمیل کرنی پڑی۔ اس نے وہ شراب چکھی اور کہنے لگا۔ "ماللہ

یہ نہایت ہی عمدہ اور خوشبودار شراب ہے۔ میں یہ تمام کی تمام خرید لوں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ شراب دُوسرے کپّوں کی شراب کو خوشگوار بنانے کے لئے رکھی گئی ہے اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ مجھے اُمید تھی۔ وہ اس کی زیادہ قیمت ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ پُوچھنے لگا "اس کی کیا قیمت ہے" میں نے کہا۔ پہلی سے چار گنا زیادہ" قاضی چلا کر کہنے لگا "مجھے منظور ہے۔ مجھے منظور ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھی چیز خرچ کئے بغیر نہیں مِل سکتی۔"

میں سخت خوفزدہ ہُوا۔ اور میں نے قاضی کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس شراب کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں نے اپنی شراب کو عمدہ بنانے کا سامان تباہ کر دیا۔ تو میری تمام شہرت خاک میں مِل جائے گی"۔ لیکن میرے تمام عذر بیکار ثابت ہوئے۔ قاضی کہنے لگا "میں نے تم سے قیمت پُوچھی تھی اور تم عام شراب سے چار گنا قیمت پر رضامند تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تُم سے شراب خرید چُکا ہُوں اور اب اسے واپس نہیں دے سکتا"۔ اُس نے اپنے نوکروں کو بُلایا۔ جو شراب کے تینوں کپّے اُٹھا کر لے گئے۔

میں نے دوسرے ہی دن سفر کی تیاری شروع کر دی۔ جلد ہی قاضی سے قیمت بھی وصول کر لی گئی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اب یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے زبردستی اس شراب کی فروخت پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور مجھے اب اپنی تجارت کے

فرغ کی بھی کوئی اُمید نہیں رہی۔ میں نے اُس سے دوبارہ التجا کی کہ اگر تینوں کپّے واپس دے دے۔ تو میں اُس کے عوض اس کو تین دُوسرے کپّے مفت دیدُونگا لیکن اُس نے میری ایک نہ سُنی۔

میں نے ایک جہاز راں سے چند شرائط طے کر کے اپنی بچی کھچی شراب لدوادی۔ اور اپنا تمام سرمایہ لیکر اس سے پہلے کہ قاضی پر میرا راز افشا ہونے پائے جزیرہ کا رفیوکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن ہمیں رستے میں ایک سخت آندھی اور طوفان سے پالا پڑ گیا دو ہفتے تک ہم آگے بڑھنے کی بیفائدہ کوشش کرتے رہے۔ آخر کار اس طوفان نے ہمارے جہاز کو بحر سمرنا کی طرف دھکیل دیا جب موسم ذرا سکون پذیر ہوا۔ تو میں نے کپتان سے کہا۔ کہ اب ہمیں ساحل سے ذرا دُور لنگر انداز ہو جانا چاہیے۔ تاکہ مطلع صاف ہونے پر ہم فوراً اپنا سفر جاری کر سکیں۔ ابھی ہمیں لنگر ڈالے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ میں نے دیکھا۔ کہ ساحل کی طرف سے ایک کشتی ہماری طرف آ رہی ہے۔ جسمیں قاضی اور عدالت کے دُوسرے رکن موجود تھے۔ مجھے اپنی گرفتاری کا پُورا یقین ہو چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ میں اپنے آپ کو کیوں نہ شراب کے ایک کپّے میں بند کر کے چھپ جاؤں۔

میں نے کپتان کو جلدی سے جہاز کے نچلے کمرے میں بُلایا۔ اور اسے مختصر طور پر تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ اور اس سے وعدہ کیا۔ کہ اگر وہ اس وقت میری مدد

کریگا تو میں اسے اپنے مال کا بہت سا حصہ دے دوں گا۔

کپتان جو میری بدقسمتی سے یونانی تھا۔ اس بات پر رضامند ہوگیا۔ ہم جہاز کے گودام میں پہنچے۔ اور ایک کُپّے سے شراب نکال کر میں اس میں داخل ہوگیا اور کپتان نے اُوپر مضبوط ڈھکنا جڑ دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی قاضی بھی جہاز پر آپہنچا۔ اور میرے متعلق دریافت کرنے لگا۔ کپتان نے اسے جواب دیا کہ "جناب طوفان کے دوران میں وہ ڈک پر سے سمندر میں گر پڑا تھا۔ اور اِسکے بعد اُس کا کچھ پتا نہیں چلا"۔

قاضی کہنے لگا "افسوس کہ میں اُس بدمعاش سے بدلہ بھی نہیں لے سکا۔ لیکن کیا تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟ ذرا میں جہاز کی تلاشی تو لوں"۔

قاضی اور اُس کے مصاحبوں نے جہاز کا کونا کونا چھان مارا لیکن وہ مجھے کہیں بھی نہ پا کر واپس چلے گئے۔ اب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن کُپّے کی لکڑی میں جو شراب سرایت کر چکی تھی۔ اس کی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد وہاں سے رہائی ہو۔ لیکن غدار کپتان کب مجھے چھوڑنے والا تھا۔ وہ تو میرے پاس پھٹکا تک نہیں۔ رات کے قریب اُس نے جہاز کا لنگر اُٹھایا اور جہاز روانہ ہوگیا۔ میں نے کُپّے کے پاس دو آدمیوں کو باتیں کرتے سُنا اور میں کپتان کے ارادے سے مطلع ہوگیا اس کے ارادہ تھا کہ وہ مجھے سمندر میں ڈبو کر میری تمام جائداد پر قبضہ کر لے۔ میں کُپّے کے سوراخ کے قریب (جس میں سے شراب ڈالی جاتی ہے)

مُنہ لا کر زور زور سے چلا کر رحم کی التجائیں کرنے لگا۔ لیکن یہ بے سُود ثابت ہُوا۔ جہاز کے آدمیوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ "تمہارے ساتھ وہی سلُوک ہونا چاہیے۔ جو تم نے دُوسروں سے روا رکھا تھا۔"

اب میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اگر مجھے غرق ہی ہونا ہے۔ تو میرا جلد سے جلد فیصلہ کر دیا جائے۔ تاکہ مجھے اس غم واندوہ اور مصیبت سے جلد چھٹکارا حاصل ہو مجھے موت کا خیال موت سے زیادہ اذیت دے رہا تھا۔ لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ آندھی نہایت زور وشور سے چلنے لگی۔ اور جہاز کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگیا۔ کپتان اور دُوسرے ملّاح جہاز کی نگرانی میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ یا تو وہ مجھے بالکل بُھول گئے۔ یا میری موت کسی پُرامن دن پر ملتوی کر دی گئی۔

تیسرے دن میں نے ملاحوں کو کہتے سُنا کہ اگر اُن کے جہاز پر مجھ جیسا بدکردار تھوڑا عرصہ بھی اور رہا۔ تو وہ ضرور غرق ہو جائے گا۔ اُنھوں نے کُپّے کے سُوراخ کا ڈھکنا اتار دیا اور مجھے موجیں مارتے ہُوئے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔ تاکہ کپّے میں پانی بھر جائے اور میں ڈوب جاؤں۔ کپّے کے سُوراخ میں مَیں نے اپنا رُومال ٹھونس دیا۔ اور کپّا پانی میں اِدھر اُدھر گھُومنے لگا۔ جب اُس کا سُوراخ والا حصّہ پانی میں جاتا تو میں رُومال کی مدد سے اس میں پانی داخل نہ ہونے دیتا۔ جب سُوراخ پانی سے باہر آتا۔ تو میں فوراً سُوراخ سے رُومال نکال لیتا تاکہ اس میں تازہ ہوا داخل ہو سکے۔ کپّا گھومتا جا رہا تھا

اور مارے دھکوں اور ہچکولوں کے میرا بُرا حال تھا۔ میں تھک کر چُور ہو گیا۔ اور میں نے چاہا کہ سُوراخ میں سے رُومال نکال لوں تاکہ اس منحوس زندگی کا کہیں خاتمہ ہو دفعتہً سمندر کی موجوں نے مجھے تین ایسے دھکے دیئے کہ میں اب رُومال کی مدد سے پانی نہ روک سکا۔ پیپا لڑھکتا ہوا موجوں پر بلند ہو گیا۔ یکایک وہ زور سے کسی چیز کے ساتھ ٹکرایا اور میری ناک کے بُری طرح چوٹ آئی۔

ایک لمحہ کے بعد میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سُنا۔ وہ پیپے کے پاس جمع ہو گئے اور اُنہوں نے اس کو کنارے کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ میں پیپے میں خاموش رہا۔ کہ مبادا وہ میری آواز سُن کر خوف زدہ ہو جائیں۔ اور مجھے پھر سمندر کی بے پناہ موجوں کے حوالے کر دیں۔ جب وہ ایک جگہ آ کر رُک گئے۔ تو میں نے سُوراخ کے قریب منہ لا کر نہایت نحیف آواز سے کہا "خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور مجھے باہر نکالیئے"۔

پہلے تو وہ لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ لیکن جب میں نے اُن سے کئی دفعہ گڑگڑا کر التجا کی اور انہیں بتایا کہ میں جہاز کا مالک ہوں اور کپتان اور دوسرے ملاحوں نے مجھ سے غداری کر کے مجھے اس طرح سمندر میں پھینک دیا ہے۔ تو اُنہوں نے پیپے کا ڈھکنا اکھاڑا اور مجھے رہائی دلائی۔

رہائی کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر میری نگاہ پڑی۔ وہ میرا جہاز تھا جو

ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ ہر لہر جو جہاز کو کنارے کی طرف دھکیلتی تھی ساتھ ساتھ اس کی دھجیاں اڑاتی جاتی تھی۔ جہاز کے بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اور پانی میں ہر طرف جھاگ ہی جھاگ نظر آتا تھا۔ میرے سب گیتے سمندر میں بکھرے ہوئے تیر رہے تھے۔ کیونکہ جہاز کی ٹکر کے بعد جب وہ کنارے سے آ لگے۔ تو ساحل کے لوگوں نے انہیں پھر سمندر میں دھکیل دیا تھا۔

جب مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی میرے ارد گرد بیٹھے آگ تاپ رہے ہیں۔ اور میری شراب کا ایک کپا نہایت سُرعت سے خالی کیا جا رہا ہے۔ میرے منہ میں بھی تھوڑی سی شراب ڈالی گئی جس سے مجھ میں اُٹھنے کی طاقت آگئی۔ اب اُن سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ اُن کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ "جو آدمی جہاز کی تباہی سے بچ نکلے تھے اُنہوں نے مجھے تمہارے بے پناہ گُن ہوں کی عجیب و غریب داستانیں سُنائی ہیں۔ اب بیٹھ جاؤ اور مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو اگر میں نے تمہارے بیان پر یقین کر لیا تو تم سے انصاف کیا جائے گا۔ میں یہاں کا قاضی ہوں۔ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تم کہاں ہو تو یہ خلیج نیلپز کا جزیرہ اسچیا ہے۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تم کس کی صحبت میں ہو تو ہم وہ لوگ ہیں جنہیں جاہل لوگ بحری ڈاکو کہتے ہیں۔ ہاں اب سچ سچ کہو"

میں نے خیال کیا کہ بحری ڈاکوؤں کو میری کہانی دوسرے لوگوں سے ذرا

زیادہ ہی پسند آئے گی۔ اس لئے میں نے اپنی تمام کہانی لفظ بہ لفظ اسی طرح بیان کر دی۔ جس طرح اب بیان کر رہا ہوں۔

وہ نہایت توجہ سے سنتے رہے۔ جب میں اپنی کہانی ختم کر چکا تو قاضی کہنے لگا جیسا کہ تم نے بتایا ہے تم ایک حبشی کو قتل کر چکے ہو اور ایک یہودی کے قتل ہونے کا سبب ہوئے ہو نیز تم نے ایک آغا کو شراب میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے۔ اسلئے تمہاری سزا یقیناً موت ہے لیکن میں تمہاری قابلِ قدر شراب کا لحاظ کرتے ہوئے اور ایک پُراسرار راز کے افشا کرنے کی بنا پر موت کا حکم منسوخ کرتا ہوں کپتان اور دوسرے سرداروں نے طوفانی سمندر میں غداری کی ہے جو ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے اس لئے ان کی سزا بھی فوری موت ہے لیکن چونکہ ان ہی کی وجہ سے ہمیں ایسی عمدہ شراب حاصل ہوئی ہے۔ اسلئے میں ذرا اور نرمی سے کام لیتا ہوں اور اب ایک ایسا حکم صادر کرتا ہوں جسکی وجہ سے تم سب اپنی تمام عمر محنتِ شاقہ میں بسر کرو گے تم سب قاہرہ میں بطور غلاموں کے بیچ دیئے جاؤ گے۔ نقدی تو ہم اپنی جیبوں میں ڈال لیں گے۔ اور تمہاری شراب پی جائینگے۔

بحری ڈاکوؤں نے قاضی کے انصاف کی داد تالیوں سے دی۔ اور ہماری کوئی فریاد نہ سنی گئی۔ جب مطلع صاف ہوا تو ہم ایک چھوٹے سے جہاز میں بٹھا کر قاہرہ کیطرف روانہ کر دیئے گئے۔ جب ہم بندرگاہ میں پہنچے۔ تو ہم فروخت کیلئے پیش کئے گئے اور زرِ خرید غلام بنا لئے گئے۔
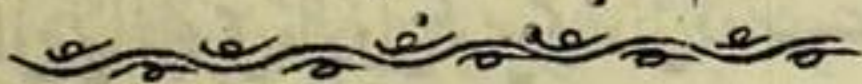
"چھ سال بعد"

"چھ سال بعد"

اور چھ سال بعد الائزا پھر اُس سے ملی۔ دُوسری میزوں کے درمیان، وہ ایک چھوٹی سی بانس کی میز کے قریب بیٹھا تھا جس پر آرائش کے لیے کاغذی پھولوں کا ایک جاپانی گلدان رکھا تھا۔ قریب ہی ایک طشتری میں کچھ پھل ایک چھوٹے سے انبار کی صُورت میں پڑے تھے۔ الائزا نے غور سے اِدھر دیکھا تو اسے فوراً معلوم ہو گیا کہ نارنگی چھیلنے کا یہ "خاص" انداز اُسی کا ہے۔ اُسے پہچانتے وقت الائزا کے چہرے کی حیرت ضرور اُس نے بھی دیکھ لی ہو گی جبھی تو اُس نے نظریں پھر اُوپر اُٹھا کر اس سے ملائیں۔ "ارے ! ! ! یہ کون عورت ؟" الائزا مسکرائی۔ البرٹ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ الائزا آگے بڑھی۔ البرٹ کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے بند ہو کر رہ گئیں۔ پھر کھلیں اور ساتھ ہی یکایک البرٹ کا چہرہ چمک اُٹھا جیسے تاریک کمرے میں دیاسلائی بھڑک کر روشن ہو جائے۔ اس نے نارنگی نیچے رکھ دی اور کرسی پیچھے کو سرکائی اتنے میں الائزا نے مصافحہ کے لئے اپنا ننھا سا گرم گرم ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ کہنے لگا "الائزا کتنی عجیب بات ہے۔ سچ مچ ایک لمحے تک تو میں تمہیں

بالکل پہچان ہی نہ سکا۔ بیٹھو گی نہیں! اچھا کھانا؛ کافی پیوگی؟

وہ تھوڑی دیر کے لئے کچھ کشمکش و پیچ میں پڑی۔ جس سے اس کی نیم رضامندی سی ظاہر ہوئی۔ پھر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی "ہاں میں تھوڑی سی کافی پی لونگی"۔

البرٹ کے چہرے پر پھر پہلی سی چمک دکھائی دی اور وہ اپنی پُرشوق نگاہیں اس پر گاڑ کر کہنے لگا "تم بہت بدل گئی ہو۔ بلکہ بالکل ہی بدل گئی ہو۔ تمہاری صحت کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے!۔ میں نے کم از کم تمہیں کبھی اتنا صحت مند نہیں دیکھا تھا۔"

اس نے اپنے چہرے سے نقاب اُتار لی اور اپنے چوڑے سے سمور دار کالر کے بٹن کھول کر کہنے لگی "ہیں، سچ مچ؟..... اچھا! مجھے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا اتنی سردی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تم جانتے ہی ہو۔"

"اچھا؟ مجھے معلوم نہ تھا۔ اچھا! تو تمہیں سردی بُری لگتی ہے؟....."

وہ کانپتے ہوئے کہنے لگی "بُری نہیں لگتی۔ بلکہ مجھے تو اس سے نفرت ہے۔ سب سے بڑی بُرائی تو اس میں یہ ہے کہ جتنا کوئی زیادہ بوڑھا ہوتا جائے....."

البرٹ نے اس کی بات کاٹ کر کہا "معاف کرنا" اور خادمہ کو بُلانے کے لئے میز پر اُنگلیوں سے تھپکی دی۔ خادمہ آئی تو اس سے کہا "کچھ کافی اور بالائی لاؤ!" پھر الائیزا کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اچھا تو سچ مچ تم کھاؤ گی کچھ نہیں؟ پھل تو شاید تم

گھاؤگی ہی۔ یہاں کا پھل بہت اچھا ہے۔"

الائزا نے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں شکریہ اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

البرٹ نے مسکرا کر پھر اپنا پرانا فقرہ دہرایا۔ "اچھا تو اب ایک بات طے ہو گئی" یہ کہہ کر اس نے پھر نارنگی اٹھائی اور کہا "تم کہہ رہی تھیں جتنا کوئی زیادہ بوڑھا ہوتا جائے ———"

وہ ہنس کر کہنے لگی "جتنا کوئی زیادہ بوڑھا ہوتا جائے اتنی ہی زیادہ سردی اسے چمٹتی ہے"۔ اب اسے یاد آرہا تھا کہ وہ کس خاص طریقے سے اس کی بات کاٹا کرتا تھا اور کس طرح آج سے چھ سال پہلے وہ اسکی شرارت پر غصہ سے بظاہر شعلہ بھبھوکا ہو جایا کرتی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے یکایک اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا کرتا اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر کوئی دوسری بات کرتا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہتا "ہاں اب کہو! اب ایک بات تو طے ہو گئی۔"

البرٹ نے ہنستے ہوئے پھر اس کے یہ الفاظ دہرائے "اچھا خوب بوڑھا ہوتا جاتا ہے"۔ آہ تم اب بھی وہی باتیں کرتی ہو۔ ہاں تمہاری ایک بات بالکل نہیں بدلی، بالکل وہی ہے ——— تمہاری شیریں آواز، تمہارا باتیں کرنیکا حسین انداز ———

البرٹ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا جیسے معلوم نہیں ابھی کیا کیا کچھ گڑ گڑا گڑ گڑا کر کہہ ڈالنے والا

ہے۔ وہ الائنزا کی طرف جھک گیا تھا اور اُسے اس کے سنگترے کے چھلکے کی تیز تیز خوشبو آ رہی تھی۔ وہ پھر بولا "تم ایک لفظ کہو اور میں تمہاری آواز تمام آوازوں میں پہچان لوں۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیا سحر ہے۔ تمہاری آواز نہیں بھول سکتی۔ . . . . تمہیں وہ پہلی سہ پہر یاد ہے جو ہم نے نشاط باغ میں گذاری تھی۔ تم بہت حیران ہوتی تھیں کہ مجھے پھولوں کے نام تک نہیں آتے۔ تم نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا لیکن میں اب بھی اُسی طرح کورے کا کورا ہوں۔ لیکن اب بھی کسی سہانے اور پُر کیف دن کو مجھے باغ میں کچھ چمکتے ہوئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے مجھے پھر تمہاری آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ "صد برگ، شبّو، موتیا" اور مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تین لفظ کسی فراموش کردہ آسمانی زبان کی صدائے بازگشت ہیں . . . . . . وہ سہ پہر تمہیں بھی یاد ہے؟"

وہ کہنے لگی "ہاں ہاں مجھے ایک ایک بات یاد ہے" یہ کہہ کر اس نے ہلکی سی اور طویل سانس کھینچی۔ جیسے میز پر کے سوکھے ہوئے کاغذی پھولوں کی شیریں خوشبو اس کی برداشت کی حد سے بڑھ گئی ہے۔ مگر اس سہانی دوپہر کی یاد تو اس کے دل میں کچھ اور چٹکیاں لے رہی تھی۔ چائے کی میز کے سامنے ایک بیہودہ نظارہ تھا۔ ہوٹل میں ایک دُنیا چائے پی رہی تھی۔ اور وہ اس متحرک ہجوم سے وہی سلوک کر رہا تھا جو دیوانہ اپنے ارد گرد منڈلاتی ہوئی مکھیوں سے کرتا ہے۔ وہ اُن سے

بچنے کے لئے بزندل کی طرح پھڑپھڑاتا، ٹوپی ہلاتا اور انہیں اپنے سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بات زیادہ اہم نہ تھی لیکن وہ سخت جھنجھلا رہا تھا۔ چائے پینے والے کتنے بیہودہ اور خوش تھے نہایت تکلیف دہ قہقہے لگا رہے تھے! ور الائیزا کو بھی تکلیف ہی ہو رہی تھی۔ اب جو وہ بولا تو پہلی یاد تازہ ہو گئی۔ البرٹ کی باتوں کی صداقت اسے محسوس ہوئی۔ ہاں واقعی وہ ایک عجیب دغریب سہ پہر تھی گرم اور خوشگوار دُھوپ میں باغ صد برگ، شبّو اور موتیے سے بھرا پڑا تھا۔

گرم اور خوشگوار موسم کی ایک اور یاد تازہ ہوئی: وہ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھی تھی۔ اور وہ اس کے نزدیک لیٹا تھا ایک طویل خاموشی کے بعد یکایک وہ گھوم کر آگے ہوا اور اس نے اپنا سر الائیزا کی گود میں رکھ دیا۔ پھر نہایت آہستہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کاش میں نے اس وقت زہر کھایا ہوتا اور مجھے یہیں مرنا ہوتا۔"

اس وقت ایک ننھی لڑکی کنول کا سفید پھول ہاتھ میں لے کر ایک جھاڑی سے دوڑ کر باہر نکلی اور گیلے پھول سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ لڑکی پھر اُسی جھاڑی میں غائب ہو گئی تھی۔ البرٹ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور وہ بھی اس پر جھک گئی۔

البرٹ کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی غم انگیز چیخ نکلی اور اُس نے اس ــــ کے؟

ہاتھ پکڑ کر اپنے گالوں سے لگا لئے۔ اور کہنے لگا "میں تم سے لاانتہا محبت کرنے والا ہوں۔ اتنی محبت جتنی کبھی کسی سے نہیں کی۔ آہ الائیزا میرا انجام کس قدر خوفناک ہوگا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کبھی مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی!"

وہ یقیناً اب پہلے سے زیادہ باعظمت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی فطرت سے وہ پہلا خیالی ابہام اور تذبذب دُور ہو چکا تھا۔ اور اسکی وضع ایک ایسے آدمی کی سی ہو گئی تھی جس نے زندگی میں اپنے لئے جگہ تلاش کر لی ہو اور ایک جگہ اطمینان اور بھروسے سے سکونت پذیر ہو۔ ایسی باتوں کا کس پر اثر نہ پڑتا اور اب تو ضرور اس کے پاس روپیہ بھی ہوگا۔ اس کا لباس بھی قابلِ تعریف تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک رُوسی سگرٹ کیس نکال لیا۔

"الائیزا سگرٹ پیو گی؟"

وہ سگرٹوں کو جھک کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی "ہاں کتنے نفیس ہیں"۔

"ہاں کافی عمدہ ہیں۔ میں نے سینٹ جیمز سٹریٹ کے ایک چھوٹے سے آدمی سے یہ اپنے لئے تیار کرائے تھے۔ میں زیادہ سگرٹ نہیں پیتا۔ تمہاری طرح نہیں ہوں۔ لیکن جب پیتا ہوں تو بہترین، لطیف اور تازہ پیتا ہوں۔ لیکن سگرٹ پینا میری عادت میں داخل نہیں۔ یونہی دلچسپی کے لئے پیتا ہوں جیسے لوگ عطر کا استعمال کرتے ہیں۔ کیا اب بھی تم عطر پسند کرتی ہو؟ اور جب میں رُوس میں تھا ......"

وُہ بات کاٹ کر بول اُٹھی "ہیں کیا سچ مچ تم روس جا چکے ہو؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں تو وہاں ایک سال سے زیادہ عرصہ رہا ہُوں۔ کیا تم بھُول گئی ہو جب ہم وہاں جانے کی باتیں کیا کرتے تھے"۔

وہ کہنے لگی "نہیں میں نہیں بھُولی"۔

البرٹ ایک نیم قہقہہ لگا کر پیچھے کی طرف جھک گیا اور کہنے لگا "ہے نا تعجب کی بات؟ واقعی! میں اُن تمام جگہوں سے ہو آیا ہوں جہاں جانے کے متعلق ہم دونوں مِل کر تجویزیں کیا کرتے تھے۔ جو جو سفر ہمیں کرنے تھے وہ سب میں کر چکا ہُوں۔ درحقیقت میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ تین سال مسلسل سفر میں گزارے ہیں۔ کبھی سپین میں، کبھی کارسیکا میں، کبھی سائبیریا میں، کبھی روس میں اور کبھی مصر میں۔ اب چین باقی رہ گیا ہے میرا ارادہ ہے کہ جنگ ختم ہوتی ہے تو وہاں بھی جاؤں"۔

جب اس نے اس قدر ٹھنڈے دِل سے اپنے سگرٹ کا جلا ہُوا حِصّہ طشتری سے رگڑتے ہُوئے اُس سے یہ باتیں کہیں تو یکایک دُور دراز ملکوں کی سیر کا جذبہ جو مدّت سے اس کے سینے میں مُردہ ہو چکا تھا بیدار ہو گیا اور تصوّر ہی تصوّر میں وہ دُور دراز ملک اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے لیکن اگرالا نے زُبان سے کچھ کہا تو صرف یہی کہ میں اس وقت تم سے جل رہی ہُوں"۔

وہ جواب میں مُسکرا کر کہنے لگا "واقعی یہ سفر عجیب و غریب تھے خاص کر رُوس

کا سفر۔ ہم سب سے زیادہ باتیں رُوس ہی کی کیا کرتے تھے۔ میں دو تین دن تک دریائے والگا کی ایک ہاؤس بوٹ میں بھی رہا تھا۔ تمہیں ملاح کا وہ گیت یاد ہے جس کے سُر تم پیانو پر نکالا کرتی تھیں؟

وہ کہنے لگی "ہاں" اور اس کے دِل میں پیانو کے وُہی سُر پیدا ہونے لگے۔

"کیا اب بھی تم اس گیت کو پیانو پر بجایا کرتی ہو؟"

"نہیں میرے پاس کوئی پیانو نہیں"۔

وہ حیران ہو کر کہنے لگا "وہ تمہارا خوبصورت پیانو کیا ہوا؟"

"مدتیں گزریں بِک گیا"۔

وہ اور حیران ہوا۔۔۔ "لیکن تمہیں تو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی؟"

"اب میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں"!

یہ قضیہ یہیں چھوڑ دیا گیا اور وُہ کہنے لگا "دریائی زِندگی ایک خاص چیز ہے۔ ایک یا دو دِن کے بعد کسی کو یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کی کبھی کسی اور شخص سے بھی آشنائی تھی اور اُن کی زبان جاننے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ کشتی کی زِندگی بذاتِ خُود ہی ہمارے اور اُن لوگوں کے درمیان کچھ تعلقات سے قائم کر دیتی ہے اور یہ کافی سے زیادہ ہے۔ دن تو ان کے ساتھ کھاتے پیتے گزر جاتا ہے اور شام کو ان کے لاتعداد ہی گیت شرُوع ہو جاتے ہیں"۔

وہ کانپ اُٹھی" اُسے ملاح کے گیت کی بلند اور غمناک آواز سنائی دے رہی تھی۔ کشتی تاریک دریا میں چل رہی تھی جس کے دونوں طرف اُداس درخت کھڑے تھے .....ساری بات سُن کر وہ کہنے لگی "کاش میں بھی وہاں جا سکتی"۔

وہ نہایت گرمجوشی سے کہنے لگا "تم دیکھو تو روسی طرزِ معاشرت کی ہر بات تمہیں بہت پسند آئے، کتنا آزاد، کتنا دلپذیر اور کتنا بے ضابطہ مُلک ہے۔ وہاں کے کسان تک شاندار ہیں۔ اور تو اور اپنا گاڑیبان ہی لے لو۔ ناممکن ہے، جو وہ مُلک کے سیاسی حالات میں کوئی نہ کوئی حصّہ نہ لیتا ہو۔ مجھے وہ شام اب تک یاد ہے جب میں، میرے کچھ دوست اور اُن میں سے ایک کی بیوی بحیرۂ اسود کے کنارے کھانے کی چیزیں ساتھ لے کر گئے تھے۔ ہم نے شمپین پی اور شام کا کھانا اُسی گھاس پر بیٹھ کر کھایا۔ اسی دوران میں گاڑیبان ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا" لو کا نجی بھی ہو"۔ بات یہ تھی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا۔ یہ بات مجھے اتنی اچھی آئی ——— سو تم سمجھ گئیں کہ میرا مطلب کیا ہے؟"

اس ایک ہی لمحے میں وہ پُراسرار بحیرۂ اسود کے ساحل پر جا بیٹھی تھی۔ سمندر کے پانی کا رنگ مخمل کی طرح سیاہ تھا اور اس کی خاموش اور مخملیں لہریں آ آ کر کناروں سے چھو رہی تھیں۔ سڑک کے ایک کنارے پر گاڑی کھڑی تھی اور ایک چھوٹی سی جماعت گھاس پر بیٹھی تھی۔ ان لوگوں کے چہرے اور ہاتھ چاندنی میں سفید ہو رہے تھے۔

ایک عورت اپنا لباس پھیلا کر ایک جگہ بیٹھی تھی۔ اس کی خوبصورت چھتری گھاس پر بند پڑی تھی اور اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز مخمل کے کپڑے پر کوئی ننھا سا پھول ہو۔ اس کے علاوہ گاڑیبان اپنا شام کا کھانا کپڑے میں باندھے اسے گھٹنے پر رکھ کر بیٹھا تھا۔ آواز آئی "لو کانجی بھی پیو۔" اُسے معلوم نہ تھا کانجی کیا ہوتی ہے؟ لیکن اُس کے سامنے ہلکے سبز رنگ کا ایک جگ آ گیا۔ طوطے کی چونچ کی طرح اس میں ایک سُرخ مرچ جھلملا رہی تھی۔ اس نے تھوڑی سی کانجی پی لی۔ کانجی سخت کھٹی تھی......"

وہ کہنے لگی "ہاں میں سمجھ گئی تمہارا کیا مطلب ہے"۔ گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ حائل ہوا اور دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پہلے جب وہ ایک دُوسرے کی طرف اس طرح دیکھا کرتے تھے تو اُن کی رُوحیں فوراً ایک ہو جاتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ غم نصیب عشاق کی طرح ایک دُوسرے کے گرد بازو حمائل کر کے ایک دُوسرے کے خیالوں کے سمندر میں ڈوب جائیں لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ اب وہی پیچھے ہٹ رہا تھا وُہی کہہ رہا تھا:۔

"تم میری باتیں بہت توجہ سے سُنتی ہو۔ جب تم میری طرف ان وحشی آنکھوں سے دیکھتی ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے۔ کہ میں تم سے وہ باتیں کر سکتا ہوں جو میں کبھی کسی اور انسان سے نہ کروں۔"

الائیزا نے یکایک محسوس کیا۔ کیا یہ مجھ سے دل لگی کر رہا ہے یا میرا وہم ہے۔

وہ کہنے لگا "تمہیں ملنے سے پہلے میں نے کبھی اپنی باتیں کسی دوسرے سے نہیں کہی تھیں۔ مجھے ایک رات اب تک بہت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ رات جب میں نے تمہیں کرسمس میں ایک چھوٹا سا درخت لا کر دیا تھا اور اپنے بچپن کی سب باتیں تمہیں سنائی تھیں۔ ایک دفعہ میری خوب گت بنی۔ میں بھاگ گیا اور اپنے صحن میں دو دن تک ایک چھکڑے کے نیچے چھپا رہا۔ کوئی مجھے ڈھونڈ نہ سکا تم نے یہ باتیں سنیں اور تمہاری آنکھیں چمک اٹھیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ تم نے کرسمس کے درخت میں بھی سننے کی روح پھونک دی ہے جیسے کوئی پریوں کی کہانی کا واقعہ ہو۔

لیکن اس شام کے متعلق الائیزا کو صرف ایک بات یاد تھی۔ کہ اس نے ساڑھے چھ شلنگ میں مٹھائی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا جگ خریدا تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا اور اسی کے متعلق باتیں کئے جاتا تھا "اف خیال کرو اتنا چھوٹا سا جگ اور قیمت سات شلنگ چھ پنس۔"

اور جب وہ اس جگ کو کھا رہی تھی تو وہ اسے دہشت زدہ اور خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"نہیں سچ کہتا ہوں کہ اتنا مہنگا جگ کھانا تو روپیہ کھانا ہے۔ اتنے چھوٹے جگ میں تو سات شلنگ آ بھی نہیں سکتے۔ ذرا سوچو تو سہی دکاندار کس قدر نفع اٹھاتے

ہوں گے۔ . . . . . . "

اب اس نے جگ کی لاگت اور نفع کے متعلق پیچ در پیچ حساب لگانے شروع کر دیئے . . . . . . لیکن اب برتن غائب ہو چکا تھا۔ میز پر وہی درخت پڑا تھا جو اس نے اُسے تحفۃً دیا تھا۔ ننھا لڑکا چھکڑے کے نیچے چھپ کر لیٹا تھا اور تکیئے کی جگہ اس کے سر کے نیچے صحن کا کُتا تھا۔

وہ ہنس کر کہنے لگی "کُتے کا نام بوزن تھا"۔

البرٹ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کہنے لگا "کون سا کُتا؟ تمہارا کوئی کُتا بھی تھا؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں"؟

وہ کہنے لگی "نہیں نہیں۔ میری مُراد اُس کُتے سے ہے جو صحن میں رہا کرتا تھا جب تم چھوٹے ہوتے تھے۔ وہ سُن کر ہنس دیا۔"

"اچھا تھا کوئی کُتا؟ مجھے تو بالکُل یاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مُدّتیں گزر گئی ہوں۔ مُجھے یقین نہیں آتا کہ صرف چھ سال ہی گزرے ہیں۔ آج جب تمہیں میں نے پہچانا تو مجھے پھر ایک گزری ہوئی دُنیا میں واپس جانا پڑا اور مجھے وہاں تک پہنچنے کے لئے گزری ہوئی زندگی کے تمام سال پھلانگنے پڑے۔ کتنا ننھا تھا میں ان دنوں" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی مُٹھیاں میز پر دے ماریں۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ میں خواہ مخواہ تمہیں دق کیا کرتا تھا۔ میں اب اُس

خط کو اچھی طرح سمجھا ہوں۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ تم نے مجھے وہ کیوں لکھا تھا۔ اگرچہ اُس وقت تو میں وہ خط پڑھ کر جاں بلب ہو گیا تھا۔ اگلے دن جب یہ میری نظر پڑا تو میں اسے پڑھ کر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنی ہنرمندی سے لکھا تھا۔ وہ تو میرے کیریکٹر کی صحیح تصویر تھا۔"

البرٹ کی نگاہیں یکایک اُوپر کو اُٹھ گئیں۔

"ہیں، تم جا رہی ہو؟"

الائزا نے کالر کا بٹن بند کر کے چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔

وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی "ہاں اب مجھے جانا ہی چاہیے"۔ اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس سے دل لگی کر رہا ہے۔

البرٹ کہنے لگا "کیوں؟ کیوں جا رہی ہو؟ ایک منٹ تو اور ٹھیرو"۔ اس نے اس کا ایک دستانہ اُٹھا کر زور سے مٹھی میں بند کر لیا جیسے اس کا جانا نہ جانا اسی دستانے پر منحصر ہے۔ "آج کل میں لوگوں سے اس قدر کم ملتا اور بولتا ہوں کہ بدتہذیب ہو گیا ہوں۔ کیا میں نے کوئی ایسی بات کہدی ہے جس سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے"۔

وہ جھوٹ بولتے ہوئے کہنے لگی "نہیں تم نے تو کوئی بات نہیں کہی" لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کا دستانہ اس نے اپنے ہاتھ میں پہن لیا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا غصہ فرو ہونے لگا اس کے علاوہ اس ایک ہی لمحے میں البرٹ

پھر البرٹ بن گیا ـــ چھ سال پہلے کا البرٹ . . . .

وہ آہستہ سے کہنے لگا "اس وقت میری تمنا کیا تھی ؟ یہی کہ تمہارے چلنے کے لئے اپنے آپ کو ایک قالین بناؤں تاکہ تمہارے نازک پیروں کو پتھروں کی چوٹ نہ آئے اور تم کیچڑ سے بچی رہو جس سے تمہیں سخت نفرت تھی ۔ میری یہی خواہش تھی کہ جادو کا ایک غالیچہ بن جاؤں اور تمہیں اُن تمام مقامات کو لے جاؤں جن کی سیر کرنے کے لئے تم اس قدر بیتاب رہتی تھیں ۔"

الائزا نے اپنا سر اُوپر کو اُٹھایا جیسے اُسے کوئی چیز پی کر نشہ آگیا ہو دُنیا کی سیر کے جذبہ نے پھر اس کے سینے میں ایک ہیجان برپا کردیا ۔

البرٹ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا مجھے محسوس ہوتا تھا کہ دُنیا میں تم سب سے زیادہ اکیلی ہو ۔ اکیلی لیکن حقیقی معنوں میں زندہ ۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تم اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئی ہو ۔ تمہارے لئے دُنیا کو ذرا اور سُدھر لینا چاہیئے تھا ۔

"آہ اے خدا میں نے کیا کردیا ۔ میں نے کس طرح اپنی مسرت خاک میں ملا دینے کی جُرأت کردی ۔ صرف یہی ایک آدمی تھا جس نے مجھے پوری طرح سمجھا تھا ۔ کیا اب وقت گذر چکا ہے ؟ کیا سچ مچ اب وقت نہیں ؟"

الائزا کی قسمت البرٹ کے ہاتھ میں وہ تانہ بن گئی تھی اور وہ اس سے کھیل رہا

تھا۔ اس پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اور پھر یہ حقیقت کہ تمہارا کوئی دوست نہیں اور تم نے کبھی کوئی دوست نہیں بنایا میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کیونکہ میرا بھی کوئی دوست نہ تھا۔ کیا اب بھی وُہی بات ہے؟"

الائیزا ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگی "اب بھی وہی بات ہے۔ میں ہمیشہ کی طرح اب بھی دُنیا میں اُسی طرح تنہا ہُوں"۔

وہ آہستہ سے ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگا "میں بھی تنہا ہُوں اب بھی وُہی بات ہے"۔

یکایک ایک تیز حرکت کے ساتھ البرٹ نے دستانہ اُسے واپس دے دیا اور فرش پر اپنی کُرسی رگڑنی شروع کی اور نہایت سادگی اور صاف دلی سے اپنی پُرانی شکل اختیار کر کے یہ خوفناک الفاظ کہنے شروع کر دیئے:۔ "لیکن اس وقت جو بات مجھے عجیب اور پُر پیچ معلوم ہوتی تھی اب مُجھ پر بالکل واضح ہو چکی ہے اور قدرۃً تم پر بھی ۔ ۔ ۔ اس کی صاف وجہ یہ تھی کہ ہم اس قدر خُود پسند، مطلب پرست اور اس قدر شیر دشکر ہو چکے تھے کہ ہمارے دِل میں کسی اور کے لئے بالکل جگہ ہی نہ تھی۔ تمہیں یاد ہے نا؟ جب میں روس میں تھا اور میں نے نفسیات کے متعلق ایک کتاب پڑھنی شروع کی تو مجھے پتہ چلا کہ ہم دونوں میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور یہ تو نفسیات کی۔ ۔ ۔ ۔"

الائیزا جا چُکی تھی ۔ ۔ ۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کے تحیّر کی کوئی حد نہ رہی۔ ۔ ۔ ۔

اسکے بعد اس نے منتظر خادمہ سے بل لانے کیلئے کہا:۔

"دیکھو بالائی کی پلیٹ نہیں چھوئی گئی۔ اس کے دام نہ لگانا"۔

بوڑھا سازندہ

بُوڑھا سازندہ

مُدرس کہنے لگا اُن دنوں میں بھی بھجن منڈلی میں تھا۔ اور کرسمس کے اس ہفتے بھی حسبِ معمول ہمیں تعلقدار کے مکان پر جمع ہو کر بڑے کمرے میں سرکار کے عزیزوں اور مہمانوں کی موجودگی میں گانے کی محفل لگانی تھی۔ مہمانوں میں نائب پادری لارڈ اور لیڈی بیکس بائی اور جانے اور کون کون تھا محفل برخاست ہونے پر جاتے وقت ہمیشہ نوکروں کے بڑے کمرے میں ہماری خوب دعوت ہوا کرتی جس میں نہایت مکلّف کھانے ملتے۔ انڈریو بھی جانتا تھا کہ وہاں اس اس طرح ہوا کرتا ہے چنانچہ جب ہم جانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو وہ ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا خدایا! اس دعوت میں شریک ہونے کو میرا بہت ہی جی چاہتا ہے جس میں کہیں گائے کا اور کہیں فیل مُرغ کا گوشت کہیں کشمکش والی پڈنگ اور کہیں جو کی شراب ملتی ہے۔ میاں! تم لوگوں کی تو چاندی ہے۔ تم تو اس دعوت میں شریک ہونے کے لئے ابھی ابھی خوش خوش جا بھی رہے ہو بھئی تمہیں بتاؤ کہ ایک آدمی کی کمی یا زیادتی سرکار محسوس کرے گا؟ گانے والے لڑکوں کے ساتھ تو میں جا نہیں سکتا۔ بڑا ہوں اور گانے والی لڑکیوں میں بھی چھپ کر نہیں نکل سکتا۔ داڑھی کا کیا کروں۔ اے پڑوسیو! تم ہی مجھے ایک رنگی اُدھار دے ڈالو تا کہ میں سازندہ بن کر ہی اندر کھسک جاؤں...... دے دو گے!؟

خیر ہمارے دل نے گوارا نہ کیا کہ خواہ مخواہ اس کی راہ میں روڑا اٹکائیں۔ ہمارا کیا تھا ہم نے اُسے ایک پُرانی سارنگی لے دی حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اُسے اس فن سے کبھی دُور کا واسطہ بھی نہیں پڑا۔ وہ سارنگی سے مسلح ہو کر ہم سب کے ساتھ عین وقت پر جا پہنچا۔ پھر سارنگی بغل میں دبائی اور نہایت بے باکی سے اندر آ داخل ہوا بس سمجھ لیجئے کہ موسیقی کی کتابیں کھولنے اور موم بتیوں کی روشنی سُروں پر ڈالنے کیلئے اِنہیں مُناسب جگہ اِدھر اُدھر رکھنے میں تو اُس نے بیساختہ پن ظاہر کرنے کی کوشش صرف کر ڈالی۔

پہلے ہم نے ایک نظم گائی پھر دُوسری پھر تیسری، لیکن اس کے بعد؟ بس اس کے بعد کچھ نہ پُوچھیئے سردار کی ماں —— ہاں کیا ایک اُونچی لمبی تندخو بڑھیا جسے گرجے کی موسیقی سے بہت دلچسپی تھی ناگہاں آ پہنچی اور آ کر اینڈریو سے کہنے لگی "ارے مردوے! تو دوسروں کے ساتھ سارنگی نہیں بجا رہا! یہ کیا؟"

اس وقت اینڈریو پر الغاروں پانی پڑ گیا۔ اس کی قابلِ رحم حالت دیکھی نہ جاتی تھی اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا دیکھ کر وہ تو کیا خود ہم بھی مارے شرم کے مٹی ہو رہے تھے۔ اب ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ آخر یہ حال سے بے حال آدمی بے حال سے حال کب ہوگا۔

وہ ایک بچے کی طرح نہایت مسکینی سے جُھک کر آداب بجا لاتے ہوئے

کہنے لگا "بڑی بی کیا کہوں! میری بدقسمتی!! سڑک پر سے آ رہا تھا کہ گر گیا اور میری سارنگی کا گز ٹوٹ گیا۔"

"ا.... ر.... ے! بڑے افسوس کی بات ہے!! لیکن اس کی مرمت بھی تو ہو سکتی ہے؟"

"نہیں بڑی بی! اب مرمت کیا ہو گی وہ تو چور چور ہی ہو چکا ہے"۔

"اچھا دیکھوں گی شاید تمہارے لئے کچھ مل جائے"۔

ہم نے دل میں کہا "چلو معاملہ ختم ہوا سینے چھوٹ گئے اور اب ہم اے چاند! اے چاند! والی نظم گانے لگے۔ جونہی یہ نظم ختم ہوئی وہ پھر سر پہ آ دھمکی اور انڈریو سے کہنے لگی:۔

"میں نے ایک آدمی بالاخانے پر بھیجا تھا وہاں کچھ پرانی سارنگیاں پڑی تھیں تمہارے لئے وہاں سے گز مل گیا ہے" یہ کہکر اس نے گز قسمت کے مارے غریب انڈریو کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور کہنے لگی "لو اب ہمارا ساتھ پورا ہو جائیگا"۔

انڈریو سامنے کتاب رکھے سازندوں کے حلقے میں کھڑا تھا گز دیکھ کر بیچارے کا چہرہ اس طرح متغیر ہو گیا جیسے گلا مڑا سیب ہو۔ کیونکہ بستی میں اگر کوئی فرد ایسا تھا جس سے سب خوف کھاتے ہوں تو وہ طوطے کی ناک والی یہ بڑھیا تھی تاہم انڈریو ایک دوسرے آدمی کی پشت کی آڑ لے کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش

کرنے لگا کہ وہ بس سارنگی بجانے کا آغاز کرنے ہی کو ہے۔ آخر اس نے گز سے سارنگی پر آرہ کشی شروع کر دی، پر اس طرح کہ گز تاروں کو چھوئے تک نہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دل و جان سے نغموں کی تخلیق کرنے کیلئے جد و جہد کر رہا ہے۔ شاید اسی طرح کچھ بیچ بچاؤ ہو جاتا۔ اگر سردار کے آدمیوں میں سے ایک ـــــ وہی نائب پادری ـــــ دیکھ نہ لیتا کہ اس نے سارنگی کچھ عجیب ٹیڑھی بیڑھی اور آڑی ترچھی کر کے پکڑ رکھی ہے۔ یہ دیکھ کر باقی سازندے بھی اس کے گرد اُمنڈ آئے ـــــ یہ دیکھنے کے لئے کہ شاید سارنگی بجانے کا یہ کوئی نیا طریقہ ہو ـــــ

یہاں آکر تمام بھید کھل گیا اور اس عورت نے انڈریو کو مکار اور دغا باز کہہ کر باہر نکال دیا۔ جشن کی آئندہ کارروائی کی فضا ایک حد تک بگڑ سی گئی اور سردار نے گرج کر کہا "نکال دو اسے! کہہ دو اسے کہ دو ہفتے کے اندر اندر اپنی جھونپڑی سے چلتا بنے۔ بہر کیف جب ہم نوکروں کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ انڈریو بھی وہاں ایک جگہ چپ چاپ بیٹھا ہے۔ اُسے سردار کے حکم سے کمرے کے سامنے کے دروازے سے باہر نکال دیا گیا تھا اور سردار کی بیوی کے حکم سے پھر پچھلے دروازے سے اندر داخل کر لیا گیا تھا۔ لیکن اُس رات کے بعد انڈریو پھر کبھی ہماری کسی محفل میں سازندہ بن کر نظر نہ آیا اور اب تو بیچارے کو مرے مٹے بھی ایک مدت ہو گئی ہے اسی طرح ہم بھی کبھی مر کھپ چکے ہوں گے۔

فریب در فریب

فریب در فریب

(چینی ماحول کا ایک فسانہ)

گریسی گڈنائٹ کے بال مشرقی ایلڈگیٹ پمپ کی تمام لڑکیوں سے زیادہ پیارے اور خوشنما تھے۔ اس کا سر موسم خزاں کے ڈوبتے سورج کی طرح جو فضا پر زر فشاں خاموش نغموں کی بارش کرتا ہے۔ حسین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کانگ فوآ جیسی موٹی عقل کا جسیم آدمی بھی اسے نوکر رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا گریسی گڈنائٹ کے متعلق طرح طرح کے شیریں تصورات اس کی رگ رگ میں حسرت کی لہر دوڑا دیا کرتے۔ اس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ کانگ فوآ کا مکان صاف رکھے اور اس کی عطر بیز دکان پہ مہمانوں کی خاطر و مدارات کیا کرے۔

کانگ فوآ کے متعلق روائیت مشہور تھی کہ اسے دکان کے چند گر ضرور آتے ہیں۔ معتبر لوگوں کا بیان تھا کہ جب اس نے پینی فیلڈ میں یہ چھوٹی سی دکان کرائے پر لی تو کاروبار کا بڑا مندہ تھا لیکن اب؟ اب تو اٹھارہ ماہ کے اندر اندر اس کی قسمت کا پانسہ ہی پلٹ گیا تھا۔ مختلف بنکوں میں اس کا بہت سا روپیہ جمع تھا۔ وہ کسی کو نہ بتاتا تھا کہ میں نے کہاں روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ جہاں اس کے ہم پیشہ لوگوں کو اصل رقم پر دگنا فائدہ ہوتا تھا۔ اسے تین گنا چار گنا ہو جاتا تھا۔

جب وہ پیسے گننے کے کٹہرے کے پیچھے اور ننھے سے حسین سر اور سبک انداز گوری گوری انگلیوں والی چست و چالاک لڑکی کے ساتھ کھڑا ہو کر ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسّم لئے پہلے اس پر اور پھر اپنے گاہکوں پر ایک نگاہ ڈالتا۔ اس وقت وہ اپنے جواہرات سے لدے ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ لیتا۔

اس کی وسیع دوکان میں جس کے کئی کمرے تھے ہر چیز موجود تھی ہر بہتر سے بہتر اور نئی سے نئی چیز مثلاً انڈوں کا اچار، شارک مچھلی کے سوکھے ہوئے پر بیس سال کے پرانے کھٹے تربوزوں کا رس۔ خشک انجیریں، لیچی، سوکھی ہوئی مچھلیاں، میٹھے کیک۔ چانڈو اور اس کے استعمال کا سامان۔ چھالیہ، تیز دھار والے چمکدار چاقو۔ کاپیاں، پنسلیں وغیرہ۔

دیواروں پر چینی مناظر کی تصویریں...... بطخوں کا خشک گوشت۔ خشک مچھلیاں کچھ برتن اور آگ بجھانے والی گیس کی تین مخروطی آہنی بوتلیں ٹنگی تھیں بوتلوں پر ان کے استعمال کا طریقہ درج تھا۔ کانگ فوآ کی حالت اتنی اچھی ہو گئی تھی کہ اس نے ایک مشہور بیمہ کمپنی میں اپنی عظیم الشان دوکان کا بیمہ کرا لیا تھا۔

گرینسی گڈنائٹ کی وجہ سے کانگ فوآ کی دوکان کی شہرت روز بروز بڑھ رہی تھی اُسکی وجہ سے اب اسکا کاروبار اتنا ترقی کر گیا تھا۔ اُسکی وجہ سے اب اسکی دکان پر نت نئی اور انوکھی چیزیں موجود رہتی تھیں پیلی سفید اور کالی چمڑیوں والے ہر رنگ اور ہر نسل کے لڑکے دُکان پر آتے

اور سگرٹ جو انہیں درکار نہیں ہوتے تھے اور سُوکھا ہوا پھل جو وہ نہیں کھا سکتے تھے خرید لے جاتے۔ گریسی ان سے کہتی "پھر بھی کبھی آؤ گے؟ اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لانا!" وہ آتے اور پچھلے کمرے میں بیٹھ کر جس کے دروازوں پر چقیں لگی ہوتیں چائے کی ایک پیالی پی جاتے۔ گریسی گڈ نائٹ خود ہی ان کے لئے چائے لاتی اور شام کو وہیں بیٹھ کر ان سے کچھ باتیں بھی کرتی۔ گریسی کی چنچل ادائیں انہیں کئی بار وہاں آنے پر مجبور کر دیتیں۔ اسی طرح گاہکوں میں بے اندازہ اضافہ ہوتا گیا بنک میں اب کانگ فوآ کا بے شمار روپیہ جمع تھا۔

خوشحال ہوتے ہی وہ خُوب موٹا بھی ہو گیا اور موٹا ہوتے ہی وہ زیادہ مغرور اور متکبر بھی ہو گیا۔ اس نے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ دخل دینا شروع کر دیا بعض اوقات وہ غصّے میں آپے سے باہر ہو جاتا ـــــ تمام قصبے میں کوئی ایسا باہمت نہ تھا جو اُسے اس وقت زبردستی کرسی پر بٹھا دینے کی جُراُت کر سکے جب وہ غُصّے میں آ کر جوشِ غضب سے کانپ رہا ہو۔ لوگ اس سے نرمی کا برتاؤ کرتے تھے کیونکہ وہ ان سے بہت امیر تھا۔ بہت ہی امیر۔

کانگ فوآ کا خیال تھا کہ کاروبار میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا نہ کر سکیگا۔ وہ اپنے اُس حریف زمیندار کو بھول گیا جو شراب خانے کا مالک تھا.....

دراصل کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ کانگ فوآ منوا تر اسی شراب خانے

میں آنے جانے لگا۔ وہ یہاں آکر دو قسم کی شراب اپنے گلاس میں انڈیلتا اور منہ سے پیا کرتا۔ یہی زمیندار اُسے شراب پلایا کرتا تھا ایک دن کانگ فو آ اُسے کہہ بیٹھا۔ "ارے بکرے! مجھے کچھ اور شراب دو!" زمیندار میز پر زور سے ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

"دیکھو مجھے اِس بات پر اعتراض نہیں کہ تم میرے شراب خانے میں شراب پینے کیوں آتے ہو۔ مجھے اعتراض ہے تو اس بات پر کہ تم دُوسروں کے شراب خانوں سے مخمور ہو کر یہاں آجاتے ہو اور واہی تباہی بکنے لگتے ہو۔"

کانگ فو آ نے جب اُسے ذرا آنکھیں دِکھائیں تو وہ کہنے لگا۔

"چُپ رہ بڈھے مُرغے! راستہ صاف کر۔ اگھر کی راہ لے!"

اس کے بعد اُسے زبردستی دھکّے مار کر باہر نکال دیا گیا۔

جب وہ دکان پر پہنچا۔ گریسی کچھ خشک کیک ہاتھ میں لئے باہر آرہی تھی وہ گرج کر کہنے لگا۔ "نکل جا یہاں سے۔" یہ کہتے ہوئے اِس کا مُنہ دھونکنی کی طرح پھُول گیا۔ گریسی حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کانگ فو آ نے زور سے اس کے کاندھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس کی گردن میں ناخن چبھوئے۔ اس کے خوبصورت بال نوچ لئے اور اسے دھکیل کر ان سیڑھیوں پر سے نیچے گرا دیا جو بازار میں اُترتی تھیں۔ اس کے بعد اس نے گریسی کی ہیٹ

اور جاکٹ اس کے پیچھے باہر زمین پر دے ماری اور کہنے لگا۔ "نکل جا چور لڑکی! ڈاکو کی ماں! کتے کی بچی! چلی جا یہاں سے! ...... چلی جا! ...... دور ہو جا!"
گریسی کے دل میں اسی دم ایک زبردست آتشِ انتقام بھڑک اُٹھی۔ سینے پر گویا سانپ لوٹنے لگا۔ اسے بیحد صدمہ پہنچا تھا۔ اسے اپنے آپ سے محبت تھی۔ وہ نہ جانے اپنے آپ کو کیا کچھ سمجھتی تھی۔ اُسے اپنا نازک جسم اور پیارے پیارے بال بہت عزیز تھے وہ اُنہیں مقدس چیزیں سمجھتی تھی۔ وہ کیوں کسی کو اتنی آسانی سے اِن پر دست درازی کرنے دیتی۔ وہ کیوں انہیں ایک چینی کے زرد اور میلے کچیلے ہاتھ لگنے دیتی؟ سب سے زیادہ غصہ اُسے اس بات پر آ رہا تھا کہ کانگ فو آ نے اُسے چور لڑکی کہا تھا۔
پینی فیلڈ کے تمام چینی اور سفید فام آدمی جھگڑا دیکھنے آ جمع ہوئے کھلکھلا کر ہنسنے اور مذاق اُڑانے لگے۔ تمام نے لوگوں کو اِس خبیث آدمی کا نام لیتے سُنا۔ بہتوں نے دیکھ لیا کہ گریسی کو کس بُری طرح دکان سے نکال دیا گیا ہے۔ جو لوگ ذرا دیر سے پہنچے انہوں نے کم از کم گریسی کو چھوٹے سے پوکھر سے ہیٹ اور جاکٹ اُٹھا کر پہنتے ضرور دیکھ لیا —— اس کے لئے یہی بات کچھ کم ہتک آمیز تھی؛ گریسی نے بھی ان تمام لوگوں کے سامنے اپنے مالک کو خوب کوسا۔ سخت سے سخت باتیں کہیں اور پھر سڑک پر سے کیچڑ کی ایک مُٹھی بھر کر دکان پر زور

سے دے ماری۔ کیچڑ کھڑکی پر گرا۔ تمام کھڑکی خراب ہوگئی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلی آئی۔ تماشائیوں میں سے کسی نے اُس کی مدد نہ کی بلکہ اس سے ہمدردی کے دو ایک لفظ بھی نہ کہے۔ وہ یا تو ایک دوسرے کو یہ پُر لطف واقعہ سُنانے میں مصروف تھے یا سُن رہے تھے۔ وہ حسین تو تھی ہی اور جب حسین عورت یا لڑکی کی اتنی بے عزتی ہو جائے تو وہ طعنہ زنی اور مضحکوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ نظروں سے گر جاتی ہے۔ اسے ایک بُزدل عورت سمجھا جاتا ہے۔

اس کی چنچل باتوں اور مسکراہٹوں کے نظارے کے لیئے ہی لوگ اس دُکان پر کھنچے کھنچے آیا کرتے تھے۔ لیکن اس توہین آمیز مُصیبت کے وقت اس کا حُسن و جمال بھی اس کے کام نہ آسکا۔ وہ اس کے گرد کھڑے اس پر ہنس رہے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر انگلیاں اُٹھاتے تھے۔ اس چیختی چلاتی ہُوئی رحم انگیز مُورت کی طرف دیکھ دیکھ کر جس کے سر کے منتشر بال ہواہیں اُڑ رہے تھے اور جس کے نازک لباس پر شکنیں پڑ چکی تھیں اور جس کا غُصّہ رائیگاں جا رہا تھا حظ اندوز ہو رہے تھے۔

گریسی نے کانگ فو آ کی سمت ہوا میں زور سے ایک لات ماری گویا اس نے اسے حقارت سے پاؤں کی ٹھوکر لگائی ہے۔ وہ چلا اُٹھی۔ "خدا کی قسم میں اس کا بدلہ لُونگی! پُورا پُورا بدلہ لُونگی!"

گریسی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ میں اس زرد کُتّے کو بتا دُونگی کہ سفید فام

یورپین لڑکیوں کی اس طرح ہتک کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ مَیں اسے بتاؤں گی کہ گندے گندے ہات، گوری گوری گردن پر کس طرح ڈالتے ہیں۔ گریسی گڈنائٹ کے بال نوچنے کا کس قدر خوفناک انجام ہوتا ہے۔ مَیں اسے بتاؤں گی کہ ایک فیشن ایبل لڑکی کی توہین کرنے کا کیا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے۔ بلا سوچے سمجھے کسی کو اس طرح برطرف کر دینا کہاں کی انسانیت ہے۔ نوٹس بھی نہ دیا اور نکالا بھی تو کس بُرے طریق سے۔ دھکے دے کر سیڑھیوں سے گرا دیا اور میری چیزیں گندے پانی میں گرا دیں۔

گریسی کو اس رات بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ اپنے سفید سفید تکیے پر سر رکھے گھنٹوں لیٹی رہی اور بہت عرصہ خیالات میں غرق رہی۔

کچھ دوستوں سے مل کر مشورہ کرنے کے بعد طے پایا کہ "غرور بیشک اچھی چیز ہے لیکن زندہ رہنے کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیئے"۔ لہٰذا اس نے پھر موٹے کانگ فوآ کے پاس چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔

گریسی گڈنائٹ کے دو ہی دن غائب رہنے سے دُکان کی بکری بہت کم ہو گئی تھی۔ چائے پینے کے کمرے میں تو اب بُہت کم آدمی آتے تھے۔ ایک پیسہ کی بھی بکری نہ ہوتی تھی۔

گریسی دل میں کہنے لگی "اس کا غصہ ضرور فرو ہو چکا ہوگا۔ وہ میرے واپس

آنے کو غنیمت جانے گا۔ میں اسی رات جاؤنگی چاہے قصبے کے تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس سے معافی مانگ لی ہے۔"

چنانچہ اسی رات وہ کانگ فوآ کے پاس گئی۔ دریا کی سمت سے بینی فیلڈ کی طرف تیز ہوا چل رہی تھی۔ درختوں میں بجلی کے قمقمے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ دکان کی دیواروں پر ٹنگی ہوئی چیزیں سوئیٹر، بیٹی کوٹ اور کیلنڈر ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ نرم نرم اور نازک نازک ٹانگوں والے زرد رو لڑکے باہر کھڑے تھے۔ گریسی اپنی سہیلیوں اور ایک دوست کے ہمراہ یہاں آئی تھی۔ جنہوں نے ہوا کی تندی کے باعث اپنی ٹوپیاں اُتار رکھی تھیں۔ گریسی انہیں اس لئے اپنے ساتھ لائی تھی کہ ممکن ہے کانگ فوآ پھر اس پر حملہ کر دے۔

چنانچہ وہی ہوا جس کی اُمید تھی۔ کانگ فوآ اس وقت بھی بہت غصّے کی حالت میں تھا۔ اس کی نظریں اس کمرے پر تھیں جو اب بالکل خالی پڑا تھا جہاں اب کوئی لڑکا چائے پیتا نظر نہ آتا تھا۔ قہقہوں کی آوازیں مفقود تھیں۔ کمرے میں اُلّو بول رہے تھے۔ ایک بھی گاہک نہ آیا تھا۔ وہ پیسے گننے کے لئے کٹہرے کے قریب بیٹھا تھا۔ کٹہرے پر ایک بہت بڑا لیمپ روشن تھا دکان کے دُوسرے حصّے میں دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ ہوا زور شور سے چل رہی تھی۔ بالکل خواب کا سا منظر معلوم ہو رہا تھا۔

گریسی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ اس کے ساتھی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ——— باہر سڑک پر کھڑے رہے۔ اُنہوں نے گریسی کو اندر جاتے اور اپنے مالک سے مخاطب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وُہ یکایک اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور غصّے سے اپنا سر ہلا رہا ہے۔ گریسی اپنی بات پر زور دے رہی تھی اور کٹہرے کے اس طرف کھڑی تھی۔ سوال وجواب ہوتے رہے اور بات بڑھتے بڑھتے پھر بڑھ گئی تھی۔ بڈھا شرابی پھر مشتعل ہو گیا۔ طور بے طور نظر آنے لگے۔ گریسی نے جھک کر اُسے کوئی بات کہی۔ کانگ فوآ کا چہرہ متغیر ہو گیا اس نے بھی جواب میں کوئی بات کہہ دی۔ گریسی نے وُہی بات اُسے لوٹا دی۔ کانگ فوآ کا بڑا سا آہنی بازو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ گریسی خوفزدہ ہرنی کی طرح اُچک کر پیچھے آ رہی۔ ساتھ ہی اس کے کوٹ کا سمور دار بازو لیمپ سے اُلجھ گیا۔ شیشے کا لیمپ فرش پر آ گرا اور گرتے ہی چکنا چور ہو گیا۔ آتش زدہ تیل فرش پر پھیلنے لگا کچھ کٹہرے پر بھی گر گیا جس کے ساتھ ہی خشک کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ میں آگ کٹہرے اور کھڑکی کو جا لگی۔ ہوا زوروں پر تھی آگ آن کی آن میں پھیل گئی۔ گریسی چیخیں مارنے لگی اور بوڑھا آدمی گرجنے لگا ——— اب دونوں چلا رہے تھے۔ پیچھے کودتے وقت گریسی کی ٹوپی لالٹین سے جا ٹکرائی . . . . . لالٹین بھڑک اُٹھی اور کھیں کاغذوں کے

کے ڈھیر پر جا گری۔ جو کٹھرے کے پیچھے موجود تھا۔ قریب ہی موم بتیوں کے بنڈل اور تیل کی ٹینکی موجود تھی۔

آس پاس کے دکانداروں اور کمپنی والوں نے لوگوں کی چیخیں سنیں تو دوڑے آئے۔ لیکن آتے ہی واپس لوٹ گئے اور جا کر اپنی دکانیں خالی کرنی شروع کر دیں کیونکہ آگ اسقدر بھڑک اٹھی تھی کہ تیز و تند ہوا میں اس کے بہت پھیل جانے کا خطرہ تھا۔ سڑک پر پیلی چمڑی والے چینی لڑکے بھی آ جمع ہوئے انہوں نے یہ تماشا دیکھ کر ناچنا کودنا شروع کر دیا۔ گریسی اپنے خوبصورت سر پر ہاتھ رکھے چلا رہی تھی۔ لوگ آگ بجھانے کی تدبیروں میں مصروف تھے۔ کانگ فوآ باہر نہ آ سکتا تھا۔ ایک ہی راستہ باہر آنے کا تھا اسے شعلوں کی زبانیں چاٹ رہی تھیں۔ دھواں اسقدر تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بلند کٹھرے سے پھلانگ کر ادھر آنا بھی ناممکن ہو گیا تھا اب شاید تیل کی ٹینکی کو بھی آگ لگ چکی تھی۔ گریسی کانپ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ شاید اسے آگ کی گرمی محسوس ہوئی تھی۔ کانگ فوآ کو اس کے گورے گورے نازک ہاتھ نظر آ رہے تھے اور جب وہ آگ کی دیوار سے پرے اچھل کود رہا تھا۔ اس کے گلے سے گیدڑ کی سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ وہ لوگوں کو کٹھرے سے پرے کیوں ہٹا رہی ہے۔ قریب کے مکانوں سے فرنیچر اور دیگر سامان نکالا جا رہا تھا کھڑکیوں سے چٹائیاں اور قالین نیچے پھینکے

جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد آگ بجھانے کا انجن بھی آموجود ہوا۔

کانگ فوآ اب زمین پر پاؤں مار مار کر چلا رہا تھا۔ "ارے بچاؤ! بچاؤ! بچاؤ! مجھے بچاؤ! . . . جو مجھے بچائے گا اُسے میں بہت سا روپیہ دُونگا۔ سو پونڈ دے دُوں گا۔ دو سو پونڈ دُوں گا۔ ارے کوئی بچائے! خدا کے لئے بچائے! اُو ــــ اُو ــــ اُو ــــ"

اب گریسی پیچھے سے چائے پینے کے کمرے کی طرف چلی گئی اور کانگ فوآ کو پکار کر کہنے لگی۔ "میرے آقا کھڑے رہئے! آرام سے کھڑے رہئے! میں آپ کو بچاؤں گی!"

اس کے بعد وہ ہجوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آگے سے ہٹ جاؤ۔ اِدھر مت آؤ۔ اسے بچانے کا طریقہ میری سمجھ میں آگیا ہے۔ تم ذرا اس شیشے کی طرف دیکھتے رہو۔"

وہ سیڑھی لگا کر چائے پینے کے کمرے کی دیوار کے روشندان تک پہنچ گئی اس کے بعد ایک نازک سے ہاتھ نے پل بھر میں روشندان کا شیشہ توڑ ڈالا۔ آگ بجھانے والی گیس کی آہنی بوتل اُٹھائی جو اس جگہ بیمہ کمپنی خود نصب کر گئی تھی اور کانگ فوآ کا نشانہ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

کانگ فوآ نے جب دیکھا کہ وہ گیس سے آگ بجھانے لگی ہے تو وہ گلا

پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ اَری پانی لاؤ پانی! بوتلیں پھینک دو۔ پانی لاؤ۔ پانی!"
شاید اس سینہ زور لڑکی نے جوش اور جرأت میں کانگ فوآ کی چیخ پکار نہ سُنی۔ یا نہ سُننی چاہی۔ ممکن ہے اس نے "وہ بات" اب بھلا دی ہو۔
گریسی نے بوتل کے مُنہ کو کھولنے کے لئے زور سے ٹھوکر لگائی۔ بوتل کھُل گئی۔ گیس کا رُخ کانگ فوآ کے قدموں کی طرف تھا۔ ایک کے بعد دُوسری اور دُوسری کے بعد تیسری بوتل خالی کردی گئی۔ لیکن آگ کسی طرح نہ رُکی بلکہ بڑھتی ہی گئی اب تو کٹہرا تک نظر نہ آتا تھا۔ دھوئیں اور آگ کی گرمی کی وجہ سے گریسی آگ بُجھاتے بُجھاتے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اِدھر بیچارے کانگ فوآ کو آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
آگ بُجھانے والے انجن نے بازار میں اپنا راستہ نکال لیا تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر اس نے آگ پر قابو پالیا۔ گریسی فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ اِس کے گرد کچھ آدمی کھڑے اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ جب اس کی گردن پر پانی ڈالا گیا اور مُنہ میں برانڈی ٹپکائی گئی تو وہ ہوش میں آگئی۔ اس کے مُنہ سے آہستہ سے کوئی آواز نکلی۔
وہ سِسکی بھر کر کہنے لگی۔ مَیں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی مَیں نے اسے اور اس کی دکان کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ آخر ہوا

کیا؟ کیا وہ صحیح و سلامت ہے؟"
"اچھی لڑکی فکر مت کرو۔ بات گئی آئی ہوئی تم نے واقعی بہت بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ افسوس ہم اُسے نہ بچا سکے۔ وہ بیچارہ ہمارے آنے سے پہلے ہی جل بھُن چکا تھا۔ آخر اس زبردست آگ پر گیس کیا کر سکتی تھی تم نے تو حد سے زیادہ بہادری دکھائی ہے۔ کون اتنے خطرے میں پڑتا ہے"۔
بڑی تحسین و آفرین کے بعد گریسی کو اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور وہ کانپ رہی تھی۔ اسکے ساتھی اسے گھر لے گئے۔
دوسرے دن اس حادثے کی تحقیقات ہوئی۔ بہت سے گواہوں کی شہادتیں لی گئیں۔ گواہوں میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بھی شامل تھے جنہوں نے شروع سے لے کر آخیر تک تمام واقعہ اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ پولیس کے افسر اعلیٰ اور فائر بریگیڈ سپرنٹنڈنٹ نے نہایت شاندار الفاظ میں گریسی کی بہادری غیر معمولی جرأت اور عقلمندی کی داد دی۔ رائل ہیومین سوسائٹی کی رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا کہ "اگرچہ اس حادثے میں کانگ فوآ کی موت واقع ہو گئی ہے۔ لیکن اس کی یہ وجہ نہیں کہ کسی نے اسے بچانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت کیا۔ ایک لڑکی گریسی گڈ نائٹ نے اس خوفناک حادثہ میں اسے بچانے کی جان توڑ کوشش کی۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا ہے اور کسی عورت سے اگر

زیادہ بہادری کی توقع نہیں ہو سکتی"۔

جب عدالت برخاست ہوئی تو لوگوں نے گریسی کی تعریف میں خوب تالیاں بجائیں۔ اخبار کے چار نمائندوں نے اس کے حسین سر کے فوٹو لے لئے۔ ان تصویروں میں اس کے لب پر تبسم تھا۔

اور اب جبکہ کانگ فوآمر چکا ہے دُنیا میں صرف گریسی گڈنائٹ ہی ایک ایسی لڑکی ہے جسے یہ بات معلوم ہے کہ ایک دن کانگ فوآنے بیمہ کمپنی کو دھوکا دینے کے لئے ان بوتلوں سے گیس نکال لی تھی اور اس کی جگہ مٹی کا تیل بھر دیا تھا۔

"مُصوّر"

"مصوّر"

مس مارتھا کا چھوٹا سا ہوٹل بازار کے کونے ہی پر تھا۔ وُہی جہاں سیڑھیوں کے تین قدم چڑھنے کے بعد دروازہ آجاتا ہے اور داخل ہوتے وقت گھنٹی بجنے لگتی ہے۔

مس مارتھا کی عُمر چالیس سال تھی۔ اُس کی پاس بُک بتا رہی تھی کہ بنک میں اس کے نام دو ہزار ڈالر جمع ہیں اور علاوہ دو ہزار ڈالر کے اس کے پاس ایک درد مند دِل اور دو مصنوعی دانت بھی تھے۔

کئی ایسے لوگوں کی شادی ہو چکی تھی، جنہیں مس مارتھا کی نسبت بہت کم موقعے میسّر آئے تھے۔ لیکن مس مارتھا ابھی مس مارتھا ہی تھی۔

ایک گاہک ہفتے میں دو تین دفعہ اس کے ہوٹل میں آیا، نہ معلوم کیوں مس مارتھا کو اُس سے ذرا دِلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ ادھیڑ عُمر کا ہوگا اور عموماً اس کی آنکھوں پر عینک نظر آتی تھی۔ اس کی ترشی ہُوئی بھُورے رنگ کی ڈاڑھی ایک باریک نوک پر ختم ہوتی تھی۔ وہ انگریزی بولتا تھا لیکن پُورے پُورے جرمن لہجہ میں اس کے پُرانے کپڑے کہیں کہیں سے رفو شدہ اور اکثر پُر شکن ہُوا کرتے تھے اور بعض جگہ سے بیگ کی طرح پھُولے ہُوئے تاہم اس نے اپنی سفید پوشی کو پُوری طرح برقرار رکھا تھا وہ خوش مزاج

اور سادہ دِل معلوم ہوتا تھا۔

ہمیشہ وُہ دو باسی ڈبل روٹیاں خریدتا۔ تازہ روٹی پانچ پیسے میں صرف ایک ملتی تھی لیکن باسی دو۔ باسی ڈبل روٹی کے سوا اس نے کبھی کچھ اور نہ خریدا۔

ایک دفعہ مِس مارتھا کو اس کی اُنگلیوں پر کچھ سُرخ اور بھُورے رنگ کے ہلکے سے نشانات نظر آئے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی غریب مصوّر ہے۔ بیچارہ کسی بالاخانے میں بیٹھ کر تصویریں بناتا ہو گا۔ باسی روٹیاں کھاتے وقت اُس کے دِل میں ضرور میرے ہوٹل کی اچھی اچھی چیزوں کا خیال آتا ہو گا۔

جب مِس مارتھا اپنے ہوٹل کی عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کیلئے بیٹھتی — ہلکے پھُلکے کیک جام اور چائے وغیرہ — تو اکثر نہایت افسوس سے دل ہی دِل میں کہتی آہ غریب مصوّر! وہ کس قدر شائستہ مزاج ہے! — بیچارہ اپنے بالاخانے میں بیٹھ کر رُوکھی سُوکھی روٹی کھاتا ہو گا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر باسی اور خُشک روٹی کھانے کے بجائے وہ بھی میرے ساتھ ذرا اچھے کھانے میں شریک ہو جایا کرے۔

یہ تو تم جان ہی چکے ہو کہ مِس مارتھا بہت ہی رحمدِل تھی۔ اجنبی کے پیشے کے متعلق اپنے خیال کی تصدیق کے لئے ایک دِن وہ اپنے کمرے سے ایک تصویر اُٹھا لائی جو کبھی اُس نے نیلام سے خریدی تھی۔ ہاں اور پھر — پھر اُس نے جان بُوجھ کر سامنے کی الماریوں کے عین بالمقابل اُسے لٹکا دیا۔

تصویر میں وِنیس کا ایک منظر دِکھایا گیا تھا۔ سنگِ مرمر کا ایک عالیشان محل تھا جس کے سامنے پانی میں کئی بجرے تیر رہے تھے ایک چھوٹے سے بجرے میں کوئی خاتون بیٹھی چلی جا رہی تھی اس کا ایک ہاتھ پانی میں تھا جس کے ساتھ سطحِ آب پر ایک مسلسل لکیر سی بنتی چلی جاتی تھی۔ آسمان بادل دُھوپ اور سایہ کا منظر نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ کون مصوّر اس پر توجہ نہ دیتا۔

دو روز بعد گاہک پھر آیا۔

کہنے لگا "خاتون! دو باسی روٹیاں"۔

جب وہ روٹی کے گرد کاغذ لپیٹ رہی تھی تو یکایک وہ بولا۔

"او ہو! خوب تصویر ہے ـــــــ تمہاری ......"

مس مارتھا دِل ہی دِل میں اپنی فن کاری پر بہت خوش ہوئی اور جواب میں کہنے لگی "ہاں مجھے مصوری اور (نہیں ابھی "مصوّر" کہنا ٹھیک نہیں) اور تصویریں بہت ہی پسند ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ تصویر اچھی ہے؟"

وہ بولا "محل کا نقشہ ذرا ٹھیک نہیں اور منظر بھی نقلی معلوم ہوتا ہے۔ اچھا خاتون خدا حافظ"۔

اس نے اپنی روٹیاں ہاتھ میں لیں اور اندازِ ادب میں سر کو ذرا جنبش دیکر جلدی سے باہر نکل گیا۔

مس مارتھا تصویر اُٹھا کر کمرے میں واپس لے آئی اور دِل میں سوچنے لگی یقیناً وہ کوئی مصوّر ہے ـــــ عینک کے اندر اس کی آنکھوں میں کس قدر نیکی اور شرافت جھلک رہی تھی۔ اس کی پیشانی کتنی کشادہ تھی۔ تصویر کو ایک ہی نگاہ میں پرکھنے کی قابلیت رکھنا ـــــ اور باسی روٹی پر زندگی بسر کرنا! ـــــ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ایک جوہرِ قابل کو اپنا کمال تسلیم کرانے سے پہلے جدوجہد بھی تو کافی کرنی پڑتی ہے۔

کیا منظر نگاری اور فن پر یہ ایک احسان نہ ہوگا کہ جوہرِ قابل کی پُشت پر مینک کے دو ہزار ڈالر ایک ہوٹل اور ایک محبت بھرا دِل بھی ہو؟ اور ـــــ لیکن مارتھا چھوڑو بھی اِن خیالوں کو۔ تم تو بیداری ہی میں خواب دیکھنے لگیں۔

اِس کے بعد جب کبھی وہ آتا میز کے ساتھ کھڑے ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ضرور مس مارتھا سے باتیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے مس مارتھا کی خوش آیند باتیں سُننے کا بہت ہی شوق ہے۔

وہ ہمیشہ باسی روٹیاں ہی خریدتا رہا۔ کبھی کوئی کیک کوئی سموسہ یا کسی مزیدار مٹھائی کا ایک ٹکڑا تک نہیں۔

مس مارتھا نے محسوس کیا کہ وہ روز بروز دُبلا اور پست ہمت ہوتا جا رہا ہے اُسے اُس کی یہ حالت دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی اور وہ دِل میں خیال کرتی، آہ میں

اس کی سادہ غذا میں کسی اچھی چیز کا اضافہ کیسے کروں۔ اپنی ہر خود ساختہ تدبیر کے جواب میں وہ خود ہی کہتی نہیں اس طرح بھی نہیں یوں اُسے اپنی سُبکی محسوس ہوئی مصور بہت غیر تمند ہوتے ہیں۔

مس مارتھا اب اکثر پیسے گننے کی میز کے پیچھے نیلی نیلی نکتیوں والا ریشمی لہنگا پہنے ہوئے کھڑی نظر آتی۔ پچھلے کمرے میں اس نے کوئی عجیب و غریب مرکب آگ پر تیار کیا۔ بہی دانہ اور سہاگہ تھا شاید یا کیا؟ بہت لوگ اسے چہرے کی صفائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

ایک دن حسب معمول گاہک ہوٹل میں آیا اور میز پہ پیسے رکھ کر ڈبل روٹیاں طلب کیں۔ جب مس مارتھا روٹی لینے اندر گئی تو یکایک باہر سے ایک شور اور کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ملی جُلی بِگل کی آوازیں سُنائی دینے لگیں اور آگ بُجھانے کا ایک بوجھل انجن کھڑکھڑاتا ہوا قریب آیا۔

خریدار دیکھنے کے لئے قدرتاً دروازے کی طرف لپکا۔ دفعتہً مس مارتھا کیلئے ایک موافق صورتِ حالات پیدا ہو گئی۔

پیسے گننے کی میز کے پیچھے سب سے نچلی الماری میں ایک پونڈ تازہ مکھن پڑا تھا جو ابھی دس ہی منٹ ہوئے گوالا چھوڑ کر گیا تھا۔ مس مارتھا نے دونوں باسی ڈبل روٹیوں میں ایک ایک گہرا شگاف دیا اور ان میں خوب مکھن بھرا۔ پھر انہیں اُدھر سے

اچھی طرح دبا کر ویسی کی ویسی ہی بنا دیا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو مس مارتھا روٹیوں پر کاغذ لپیٹ رہی تھی۔

وہ کچھ اچھی اچھی باتیں کر کے رخصت ہوا ـــــ اتنی اچھی جتنی اس نے پہلے کبھی نہ کی تھیں ـــــ مس مارتھا مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ ہلکی سی دل کی دھڑکن بھی شامل تھی۔

"کیا میں حد سے زیادہ تو نہیں بڑھ گئی؟ وہ برا تو نہیں مانے گا؟ لیکن نہیں یقیناً نہیں۔ کھانے کی چیزوں کی زبان تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ کسی کو مکھن دینا کوئی ایسی علامت یا پیش قدمی نہیں جو اصولِ دوشیزگی کے خلاف سمجھی جائے۔"

وہ بہت دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اور پھر اپنے دل میں اس موقعے کا تصور لائی جب خریدار پر اس کا بے ضرر فریب کھلے گا۔

"وہ اپنے برش اور مصوری کے تختے کو نیچے رکھ دے گا۔ پاس ہی تصویر کا پردہ ہو گا۔ اس پر وہ کوئی ایسی لاجواب تصویر کھینچ رہا ہو گا جس پر کبھی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔

"وہ اپنی روکھی سوکھی روٹی پانی کے ساتھ کھانے کے لیئے بیٹھ جائے گا اور روٹی کا ایک لقمہ توڑے گا ـــــ اُف!"

مس مارتھا شرما گئی۔ "کھاتے وقت کیا وہ یہ بھی سوچے گا کہ اس ہاتھ نے اس میں مکھن دیا ہو گا؟ کیا وہ . . . . . ."

سامنے کا دروازہ کسی بدتمیز نے ایک زور کے دھماکے سے کھول مارا۔ کوئی شخص شور و غل مچاتا ہوا اندر آرہا تھا۔

مِس مارتھا لپک کر آگے بڑھی۔ دو آدمی تھے۔ ایک تو کوئی نوجوان تھا جو سگار پی رہا تھا اور جسے اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور دوسرا اس کا مصوّر۔

وہ غصّے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اُس کی ٹوپی سرک کر سر کے پچھلے حصّے کیطرف چلی گئی تھی اور اس کے بال نہایت بے ترتیبی سے وحشیوں کی طرح اُلجھے ہُوئے تھے۔ وہ اپنی دونوں مُٹھیاں بھینچ بھینچ کر نہایت خونخواری سے بار بار مِس مارتھا کی طرف آتا تھا مِس مارتھا کی طرف۔

اس کے بعد اُس نے پُوری قوّت سے گرج گرج کر اپنی جرمن زبان میں مس مارتھا کو "احمق۔ چڑیل" اور بہت سے اِس قسم کے سخت الفاظ کہے۔

نوجوان نے اُسے وہاں سے لے جانا چاہا۔

اس نے نہایت غصّے سے جواب دیا "میں نہیں جاؤں گا جب تک اس کو بتا نہ لوں"۔

وہ غصّے میں پیسے گِننے کی میز پر بار بار اپنی مُٹھیاں دے مارتا تھا پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا "تم نے میرا بیڑا غرق کر دیا ہے"۔ اور عینک کے اندر اس کی نیلی نیلی آنکھوں سے شُعلے نکلتے ہُوئے نظر آئے۔ "میں تمہیں بتا دیتا

ہوں کہ تم ایک بیوقوف بوڑھی بلی ہو!"

مِس مارتھا الماریوں کے سامنے اپنے ریشمی لہنگے پر ایک ہاتھ رکھے اِنتہائی ناتوانی کے انداز میں سر جھکائے کھڑی رہی اور نوجوان اپنے ساتھی سے کہنے لگا "چلو باہر تم نے اب بہت کچھ کہہ لیا ہے" اور پھر اُسے کالر سے پکڑ کر باہر چھوڑ آیا اور واپس آ کر مِس مارتھا سے بولا "خاتون اب میں تمہیں اس شور و شغب کی اصلی وجہ سُناتا ہوں۔ اس آدمی کا نام بلمبر جر ہے یہ نقشہ نویس ہے۔ اور مکانوں کے نقشے تیار کرتا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں تین ماہ سے وہ سخت جانکاہ محنت کے ساتھ شہر کے لئے ایک میونسپل ہال کی تعمیر کے سلسلے میں ایک نقشہ تیار کر رہا تھا۔ یہ ایک اِنعامی مُقابلہ تھا۔ کل وہ لکیروں پر سیاہی لگا کر اپنا کام بالکل ختم کر چکا تھا۔ تم کو معلوم ہی ہوگا کہ نقشہ نویس ہمیشہ پہلے پنسل سے اپنا کام ختم کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ باسی ڈبل روٹی کے مٹھی بھر ریزے لے کر پنسل کی لکیروں کو مٹا ڈالتا ہے۔ ڈبل روٹی ربڑ سے ذرا اچھی رہتی ہے۔

"بلمبر جر ڈبل روٹی یہاں سے خرید اکرتا تھا۔ ہاں تو آج ــــــ ہاں خاتون تمہیں معلوم ہے نا کہ مکھن ٹھیک نہیں ــــــ اب بلمبر جر کا وہ نقشہ سوائے ڈبل روٹیاں اور سموسے لپیٹنے کے اور کِس کام آسکتا ہے؟"

مس مارتھا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے نیلی نکتیوں والا ریشمی لہنگا اُتار کر رکھ دیا اور اپنا سادہ کپڑے کا معمولی لہنگا جو وہ اس سے قبل پہنا کرتی تھی پہن لیا۔ اس کے بعد اُس نے چہرے پر لگانے کے لیئے جو مرکب تیار کیا تھا اُسے کھڑکی سے باہر راکھ کے برتن میں اُنڈیل دیا۔

مچھلی

مچھلی

فرصت ملے تو کوئی شام دریائے نربدا کے کنارے کی چھوٹی دیہاتی سرائے میں گذاریئے۔ ہاں لیکن بیٹھئے تو ٹینوں والے کمرے میں "جہاں شراب چھانکر پیپوں میں بھری جاتی ہے۔ وہاں آپ کو ضرور دو ایک مچھیرے بیٹھے نظر آئیں گے جو اس وقت اپنی شراب میں گرم پانی اور میٹھا ڈال کر چسکیاں لے لے کر پی رہے ہوں گے۔ آدھ ہی گھنٹے میں وہ آپ کو ماہی گیری کے متعلق اتنی کہانیاں سنا ڈالیں گے کہ مارے ہنسی کے کم از کم ایک مہینے تک ضرور آپ کے معدے میں گڑبڑ رہے گی۔

شام کا وقت تھا میں اور عثمان سیر کے لئے چاند نگر روانہ ہوگئے۔ واپسی پر ذرا ستانے کے لئے اِس چھوٹی سی سرائے میں جا داخل ہوئے۔ یہ دریا کے کنارے سے قریب ہی واقع ہے۔

بیٹھک میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڈھا وہاں بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ قدرتی امر تھا کہ ہمارے اور اس کے درمیان باتیں ہوں۔

وہ کہنے لگا: "یار بڑا سہانا دن ہے"۔ میں نے کہا۔ "ہاں یار دن تو کل بھی

بڑا سہانا تھا۔" پھر ہم نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا کہ دِن کل بھی سہانا ہوگا۔ آخر میں عثمان بڈھے سے کہنے لگا۔" دیکھتے ہو اس دفعہ فصلیں بھی تو اچھی نظر آرہی ہیں۔"

اب معلوم نہیں، اس نے ہمارے کیا طور دیکھے اور کیوں یہ فرض کر لیا کہ ہم کوئی اجنبی ہیں، یہاں کی فضا سے بالکل ناآشنا، اور اگلی صبح ہمارا ارادہ ہے کہ یہاں سے چل دیں۔ خیر۔

باتوں میں جو ذرا وقفہ پڑا ——— تو ہماری نگاہیں اِدھر اُدھر کرے کا جائزہ لیتے لیتے بالآخر شیشے کے پُرانے سے گرد آلود نمائشی صندوق" پر آکر جم گئیں جو آتشدان سے بھی کہیں زیادہ اُونچا نصب کر دیا گیا تھا۔ اس صندوق میں ایک بڑی سی مچھلی رکھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

خدایا اتنی بڑی مچھلی ——— اور پہلی نظر میں تو میں نے درحقیقت یہ سمجھا کہ یہ کاڈ مچھلی ہے"۔

بُوڑھا میری نظروں ہی سے سب معاملہ بھانپ گیا اور کہنے لگا" کیوں یار کیسی عجیب چیز ہے۔ ہے نا عُمدہ"۔

میں نے کہا" عمدہ۔ اجی نایاب"۔

عثمان بُوڑھے سے کہنے لگا" کیوں میاں تمہارے خیال میں اسکا وزن

کیا ہو گا؟"

اب یہ صاحب اپنی جگہ سے ذرا اُوپر اُٹھے اور اپنے نیچے اپنا کوٹ سرکاتے ہُوئے بولے۔"یہی نو سیر چھ چھٹانک۔ آنے والے مہینے کی تین تاریخ تھی اسی دن میں نے اسے دریا سے پکڑ کا خشکی پر دے مارا تھا۔ پس ادھر کانٹے میں ایک چھوٹی سی مچھلی لگائی۔ ڈوری دریا میں پھینکی اور پُل کے عین نیچے سے اسے پکڑ لیا۔ لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس جگہ ایک بہت بڑی مچھلی رہتی ہے۔ میں نے سوچا چلو اسے پکڑ ہی لو۔ چنانچہ پکڑ لی۔ میرے خیال میں اب آپ کو اتنی بڑی مچھلیاں بہت کم نظر آئیں گی۔ اچھا صاحب اب میں جاتا ہوں۔ سلام۔"

یہ کہکر وہ باہر چلا گیا اور ہمیں تنہا چھوڑ گیا۔

اس کے بعد مجال ہے جو ہماری نظریں مچھلی پر سے ہٹیں۔ کیا ہی مچھلی تھی۔ ہم اسے دیکھ رہے تھے کہ ایک مقامی قُلی بھی، جو ابھی ابھی سرائے میں داخل ہُوا تھا، ہاتھ میں شراب کا برتن لئے کمرے کے دروازے میں آیا۔ اور مچھلی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔

عثمان اس کی طرف متوجہ ہوتے ہُوئے کہنے لگا۔"واللہ! بہت بڑی مچھلی ہے۔"

وہ کہنے لگا۔"آہا ہا۔ صاحب واقعی آپ درست فرما رہے ہیں۔" پھر

شراب، کا برتن اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا" جب یہ پکڑی گئی تھی آپ تو موجود نہیں تھے نا"

ہم نے جواب دیا" نہیں ہم تو اجنبی ہیں. اس علاقے سے بالکل ناواقف ہیں؟

کہنے لگا" اے ہے. بھلا پھر آپ کو کیا پتہ ہو سکتا ہے اجی کوئی پانچ سال گذرے ہوں جب میں نے اسے پکڑا تھا.

میں بے اختیار بول اُٹھا" او میاں کیا وہ تمہیں تھے.... اچھا تمہیں نے پکڑا تھا.... بھئی واہ"

ہمارے بوڑھے خوش باش دوست نے جواب دیا" جی حضور بندے نے ہی پکڑا تھا۔ ان دنوں دریا میں بند بندھا ہوا تھا۔ جمعے کا دن تھا۔ دوپہر کا وقت۔ اچھا اور سنئے۔ اس کے متعلق سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ میں نے کانٹے میں ایک مکھی لگا کر اسے قابو کیا تھا۔ میں تو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ اتنی بڑی مچھلی کا مجھے خواب و خیال بھی نہیں تھا۔ اور جب میں نے اس مجسم وزن کو اپنی ڈوری کے سرے کے ساتھ کھینچا تو مارے دہشت کے میں وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اور اب جناب اندازہ کر لیں کہ اس کا وزن تیرہ سیر ہو گا یا نہیں۔ اچھا جی اب جاتا ہوں سلام"۔

پانچ منٹ بعد ایک تیسرا آدمی اندر آیا جس نے بتایا کہ کس طرح اس نے ایک صبح سویرے ہی سویرے کانٹے میں ایک چھوٹی سی زرد زرد چھلکوں والی مچھلی لگا کر اسے پکڑا تھا۔ . . . . یہ آدمی بھی چلا گیا اور ایک اور ادھیڑ عمر کا مسخرہ جو بظاہر بڑا متین نظر آرہا تھا اندر آکر کھڑکی کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"معاف فرمائیے برا نہ مانئے۔ اتنے سوال کرنا۔ ہے تو بڑے منہ چھوٹوں کی سی بات لیکن ہم ہوئے اجنبی اس علاقے سے بالکل ناواقف۔ میں اور میرا بھائی آپ کے بڑے احسانمند ہوں گے۔ اور تاعمر آپکے غلام رہیں گے اگر آپ ہمیں یہ بتانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ کہ یہ مچھلی یہ دیو کی دیو آپ نے کس طرح پکڑی تھی"۔

وہ آدمی نہایت حیرت و استعجاب سے کہنے لگا۔ "ہیں آپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ یہ مچھلی میں نے پکڑی تھی"۔

ہم نے بتایا کہ ہمیں کسی نے بتایا تو نہیں یونہی ضمیر نے گواہی دی کہ یہ ضرور آپ ہی نے پکڑی ہو گی"۔

مسخرا اجنبی قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ "کمال ہو گیا . . . . . بھئی غضب ہو گیا۔ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ واقعی یہ میں نے ہی پکڑی تھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا علم کیسے ہو گیا۔ آپ نے کیسے بوجھ لیا۔ یار عجیب بات ہے"

اس کے بعد اس نے بتایا کہ کس طرح سے خشکی پر لانے میں اُسے آدھ گھنٹے تک کشمکش کرنی پڑی۔ اور اس کی چھڑی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد اِس نے بڑی احتیاط سے اس کا وزن کیا۔ تو یہ تیرہ سیر وزنی نکلی۔"

یہ آدمی بھی چلا گیا۔ اور اب وہاں کا زمیندار ہمارے پاس آن بیٹھا۔ ہم نے اسے وہ تمام کہانیاں سُنا دیں جو ہم اس مچھلی کے متعلق اب تک سُن رہے تھے۔ اس نے ان مسخروں کی خوش گپیوں سے بڑا ہی لطف اُٹھایا۔ اور ہم سب قہقہے پر قہقہہ لگاتے رہے۔

ہمارے بوڑھے دیانتدار دوست نے کچھ وقفے کے بعد پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگا ذرا قیاس تو کرو۔ پنجو۔ بنیا۔ بابا روشن آپ سے کہتے رہے ہیں کہ مچھلی ہم نے پکڑی تھی۔ ہا ہا ہا ہا خوب خوب پکڑتے تم اور پھر دیدیتے مجھے پکڑتے تم اور پڑی ہوتی میرے کمرے میں ہا ہا ہا ہا۔

اس کے بعد بوڑھے زمیندار نے اس مچھلی کی اصلی کہانی بیان کرنی شروع کی۔ اب معلوم ہوا کہ اب سے برسوں پہلے جبکہ وہ بالکل چھوکرا ہی تھا۔ یہ مچھلی اس نے پکڑی تھی۔ اس کارنامے میں ہنر اور شعور کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بلکہ اس میں قسمت کا ہاتھ تھا۔ جو ہر وقت ان لڑکوں کا انتظار کرتی رہتی ہے جو کسی سُہانی دوپہر کو سکول سے بھاگ کر کانٹے والی ڈوری کا ایک سرا درخت کے تنے سے باندھے

مچھلیاں پکڑتے رہتے ہیں۔ اتنی بڑی مچھلی پکڑ لانے پر وہ گھر والوں کی مار پیٹ سے بھی بچ گیا تھا۔ اور اس کا اُستاد بھی عش عش کرتا رہ گیا تھا۔

یہ بیان دے کر وہ باہر نکل گیا۔ اور میں نے اور عثمان نے پھر مچھلی پر نظریں گاڑ لیں۔

اُف! کتنی بڑی مچھلی تھی عجیب تھی۔ اسے دیکھتے اور حیران ہوتے پھر دیکھتے اور پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوتے۔

عثمان تو اسے قریب سے دیکھنے کے لئے اسقدر مضطرب ہُوا کہ ایک کرسی کی پُشت پر جا چڑھا تاکہ ٹھیک نظر آئے۔

کرسی کِھسک گئی اور عثمان نے اپنا آپ بچانے کے لئے نہایت وحشیانہ طریق سے مچھلی کے صندُوق پر ہاتھ ڈالا اور صندُوق ایک کڑکڑاہٹ کے ساتھ مع عثمان کے نیچے آرہا۔

میں لپک کر وہاں پہنچا۔ اور نہایت فکر سے پُوچھا کہ مچھلی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔

عُثمان نے اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور نہایت احتیاط سے آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے نہیں"۔ لیکن نقصان تو پہنچ چکا تھا مچھلی کے ہزار ریزے ہوگئے تھے۔ یعنی ہزار کہہ رہا ہوں ممکن ہے نوسو ننا نوے

ہوئے ہوں میں نے سوچا چلو اب اِنہیں کیا کہوں۔

یہ بات ذرا عجیب اور ناقابلِ یقین معلوم ہوتی تھی کہ یہ سوکھی ہوئی بھس بھری مچھلی اس طرح ریزے ریزے ہو جائے۔

اور یہ بات ہوتی بھی عجیب اور ناقابل یقین اگر یہ مچھلی سوکھی اور بھس بھری ہوتی لیکن یہ تھی کب؟

پہلے تو سچ مچ مچھلی ہی تھی، سوکھی ہوئی۔ اور اب! ہاہا!! ہاہا......

اب!! چکنی مٹی کے ننھے ننھے ریزے۔

ہاؤلی کا تھانہ

ہاؤلی کا تھانہ

اپنا ہرکارہ بنا لیجئے حضور! رحم کیجئے۔ بڑی مہربانی ہوگی چھ روپے تنخواہ مقرر ہو جائے۔ صاحب آخر کروں کیا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان بیچاروں کو کبھی پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں ملا۔ اب غلہ بیس ہی سیر تو بکتا ہے میں ہرکارے کا کام اس عمدگی سے سرانجام دُونگا کہ حضور دن بھر مجھ سے خوش رہا کریں گے اور جب سال ختم ہوگا تو ایک پگڑی انعام دینگے۔ میں اسٹیشن کی تمام سڑکوں سے واقف ہوں اور مجھے بہت کچھ معلوم ہے۔ صاحب میں ہر کام نہایت ہوشیاری سے کیا کرتا ہوں! اس سے پہلے میں پولیس میں تھا بُرے چال چلن کا شبہ اور میری نسبت! توبہ۔ توبہ۔ توبہ ضرور کسی دُشمن نے یہ قصہ گھڑا ہے۔ مَیں نے کبھی کسی سے نمک حرامی نہیں کی صاف دل آدمی ہوں۔ میرے ایک ایک لفظ میں سچائی ہوتی ہے۔ جب میں پولیس میں تھا سب لوگ جانتے تھے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ میری نسبت عام طور پر لوگ کہا کرتے تھے کہ افضل خاں بڑا سچا آدمی ہے۔ اس کی بات پر بھروسا کیا جا سکتا ہے صاحب میں دہلی کا پٹھان ہوں! دہلی کے تمام پٹھان شریف ہوتے ہیں۔ کیا جناب نے بھی دہلی دیکھی ہے؟ ہاں یہ بات واقعی درست ہے کہ دہلی کے پٹھانوں میں غنڈے بھی ہو سکتے ہیں صاحب! آپ تو بہت دانا معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی

نظروں سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ آپ خود ہی ضرور مجھے اپنا ہرکارہ بنالیں گے۔ میں صاحب کے عاشقانہ رقعے چپکے چپکے بغیر کسی کو دکھائے لے جاؤنگا، نہیں صاحب خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی بُری بات نہیں۔ مدت سے تمنا تھی کہ کبھی کسی آپ جیسے نیک صاحب کی نوکری کروں۔ اکثر نوعمر صاحب تو بڑے شیطان اور مُنہ پھٹ ہوتے ہیں۔ میں کبھی ان کی نوکری نہ کروں چاہے میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھُوکوں مرجائیں۔

میں پولیس میں کیوں نہ رہا؟ سب بات سچ سچ کہہ سُناؤں گا۔ واقعہ یُوں ہوُا کہ تھانے پر ایک بہت بڑی مُصیبت ٹوُٹ پڑی۔ رام بخش حوالدار۔ مولا بخش جگت رام بھیم سنگھ اور سُورج بل بھی اِس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ رام بخش اور مولا بخش اب تک قید خانے میں ہیں۔

گوگراں کی طرف جو سڑک جاتی ہے۔ اِس پر ہاڈلی کا تھانہ ہے۔ اس کے ارد گرد ڈکیتی زوروں پر ہے۔ ہم تمام کے تمام بہت بہادر آدمی تھے۔ اِسلئے ہمیں اس تھانے میں بھیج دیا گیا جو تھانہ نمبر ۲ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ تمام دن اور تمام رات ہم ڈاکوؤں کی تاڑ میں رہے۔ صاحب آپ کیوں ہنستے ہیں؟ میں بھی تو یہ بات مانتا ہوُں کہ ہمارے مقابلے میں ڈاکو بہت ہی عیار نکلے۔ معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر ہم نے خواہ مخواہ اور زیادہ تکلیف اُٹھانی مناسب نہ سمجھی۔

گرمی کا موسم تھا گرمیوں میں بھلا آدمی کر ہی کیا سکتا ہے؟ اب حضور کہتے: شہ زور ہیں لیکن کیا اس گرمی میں حضور بھی اپنے آپ میں کچھ طاقت محسوس کرتے ہیں؟ ہم نے صرف امن و امان کی خاطر ڈاکوؤں سے سمجھوتہ کر لیا۔ یہ سب کام حوالدار کا تھا جو بڑا موٹا تھا۔ ونبے کا ونبا۔ ہا ہا ہا! صاحب اب وہ جیل میں چٹا نیاں بن بن کر دبلا ہو رہا ہوگا۔ وہ ڈاکوؤں سے کہنے لگا۔ تم ہمیں کچھ تکلیف نہ پہنچانا اور ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔ جب فصلوں کی کٹائی ہو چکے تو جج صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک آدمی پھنسا دینا کسی کوڑ مغز کو بھیجنا ہم اس پر جھوٹ موٹ مقدمہ کھڑا کر دیں گے جو یقیناً کامیاب نہیں ہوگا۔ اس طرح ذرا ہم تھانے والوں کی عزت رہ جائے گی۔ ڈاکو یہ بات مان گئے اور تھانے میں ہماری تکلیفیں بھی ختم ہوئیں۔ اب ہم تمام دن چارپائیوں پہ بیٹھے مزے سے خربوزے کھاتے رہتے۔ صاحب ہاڈلی کے خربوزوں کا کچھ نہ پوچھئے۔ وہ گنے سے بھی زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔

اس ضلع میں ایک نائب کمشنر بھی تھا ——— اسسٹنٹ صاحب — توبہ! توبہ!! بڑا سخت آدمی تھا۔ میرے صاحب جیسا مضبوط جو ضرور ابھی مجھے اپنے سایہ میں جگہ دینے والے ہیں۔ صاحب! نیکم صاحب کی دو نہیں کئی آنکھیں تھیں وہ بڑی پھرتی سے ضلع بھر کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ لوگ اُسے شیر گوگرال کہتے کیونکہ وہ قصور وار لوگوں کی طرح شیر کی طرح دبے پاؤں آتا اور اپنے شکار کو چھاپ بیٹھتا۔ نیس تیس

میل کے فاصلے تک کے تحصیلدار اس کے ہاتھوں رو تے تھے۔ اس کی آمد یا روانگی کی کسی کو خبر نہ ہوتی تھی اور نہ اس کا کوئی کیمپ ہی تھا۔ جب اس کا گھوڑا تھکا ہوتا تو وہ ایک "بھوت گاڑی" پر سوار ہو جاتا۔ جانے میری بلا وہ لوگ خود اس گاڑی کو کیا بولتے ہیں۔ بس وہ ایسی تھی کہ صاحب چپکے سے چاندی کے تین پہیوں کے درمیان بیٹھ جاتا اور وہ چلنے لگتی۔ جب چلتی تو ہماری گاڑیوں کی طرح اس کے پہیوں سے چڑ چڑ کی آواز بالکل نہ نکلتی۔ وہ اسے ٹانگوں سے چلاتا تھا حضور! کچھ پتہ نہ چلتا کہ صاحب کہاں گیا ہے۔ بس دانہ کھلا کھلا کر پالے ہوئے گھوڑے کی طرح کودتا پھاندتا ایک دم یہ جا وہ جا۔ اُڑتے ہوئے باز کا سایہ بھی کھیت پر اتنا چپ چاپ نہیں پڑتا جتنی بے آواز یہ نیکم صاحب کی گاڑی تھی۔ ابھی یہاں ہے ابھی وہاں ہے اور ابھی غائب۔ پلوں میں رپورٹ مکمل ہوئی اور لوگوں کی سختی آئی۔ صاحب! کسی دن ذرا رودھیڑی کے تحصیلدار سے پوچھیے کہ مرغیوں کی چوری کیسے پکڑی گئی تھی!

ایک رات کا ذکر ہے کہ حسب معمول شام کا کھانا کھا کر اور حقہ وغیرہ پی کر ہم تھانے والے چارپائیوں پر سو گئے۔ جب ہم صبح اُٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری چھ رائفلوں میں سے ایک بھی نہیں رہی۔ سب کسی نے چرا لی ہیں اور پولیس کی کتاب بھی جو حوالدار کے چارج میں تھی غائب ہے یہ گڑبڑ دیکھ کر ہم بہت ڈرتے ہے

ہم نے دل میں کہا ڈاکو بھی بڑے بے مروّت ثابت ہوئے۔ کمبخت رات کو آ کر کیا غضب ڈھا گئے۔ ہمارے لئے یہ واقعہ بڑی شرمندگی کا باعث تھا۔ رام بخش حوالدار کہنے لگا "چپ رہو! معاملہ بڑا نازک ہو گیا ہے لیکن اب بھی اس کا علاج خوب ہو سکتا ہے۔ کوئی تجویز سوچتے ہیں.... اچھا! کہیں سے بکری کا ایک بچہ پکڑ لاؤ اور میری تلوار بھی لیتے آؤ۔ بیوقوفو! کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی کرو۔ یاد رکھو گدھے کیلئے لاٹھی اور آدمی کے لئے اشارہ!"

ہم فوراً سب بات سمجھ گئے۔ ہمیں برطرفی کا بڑا خطرہ تھا۔ جلدی سے کسی کی بکری کا بچہ پکڑ لائے اور اُسے اندر کے کمرے میں دھکیل دیا اور حوالدار کی بات غور سے سننے لگے۔

"بیس ڈاکو تھے سخت مقابلہ ہوا۔ ہمارے سب آدمی زخمی ہو گئے کوئی زخموں سے خالی نہ رہا۔ کھڑکی کی سیخیں توڑ دی گئیں۔

سورج بل تم ذرا یہ کام سنبھالو! بہادر و سخت جلدی کرو کیونکہ ابھی ہمیں شیر گو کرال کو خبر دینے کے لئے بھی ایک آدمی بھیجنا ہے۔"

یہ سن کر سورج بل نے لکڑی کی سلاخیں توڑ دیں اور میں حوالدار کی گھوڑی خربوزوں کے کھیت میں لے گیا اور اُسے ہنٹر مار مار کر کھیت میں خوب نچایا۔ یہاں تک کہ گھوڑی کے سموں سے تمام بیلیں اچھی طرح پامال ہو گئیں۔ اب تمام

کھیت میں گھوڑوں کے سُموں کے نشان ہی نشان نظر آتے تھے۔

یہ کام پُورا کر کے میں تھانے واپس آگیا۔ بکری کا بچہ ذبح کر دیا گیا۔ دیواروں کے کئی حصے آگ جلا کر سیاہ کر دیئے گئے اور ہر آدمی نے اپنے کپڑوں پر تھوڑا تھوڑا بکری کا خُون لگا لیا۔ ہاں صاحب! میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ یہ صاحب لوگ ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی خُود اپنے آپ کو زخمی کر کے اُن سے یہ کہے کہ کسی دوسرے آدمی نے مجھے زخمی کیا ہے تو فوراً معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ آدمی دھوکا دے رہا ہے یا سچ کہتا ہے۔ اس احتیاط کے لئے ہم نے خُود اپنے آپ کو زخمی نہ کیا بلکہ حوالدار نے اپنی تلوار لیکر ہم میں سے ایک کے بازو پر آہستہ سے ایک چرکا دیا۔ جو کھال کو چیرتا ہوا چربی تک جا پہنچا۔ ایک دُوسرے آدمی کو لات پر تیسرے کو ہاتھ کی اُلٹی جانب۔ بس اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کو اُس نے کسی نہ کسی جگہ سے زخمی کر دیا اور ہمارے زخموں سے لہُو بہنے لگا۔ ہم میں سے سورج بل سب سے زیادہ شوقین نکلا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی کے کئی بال نوچ ڈالے۔ آہا ہا! صاحب کسی نے کبھی ایسا مکمل انتظام نہیں کیا ہوگا۔ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا تو میں بھی قسم کھا کر یہ کہنے کو تیار تھا کہ سچ مچ ڈاکوؤں نے تھانے کی بہت بُری گت بنائی ہے۔ ہر جگہ بہت دُھواں پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر جگہ جگہ خُون کے قطرے نظر آتے تھے اور سامنے پامال کیئے ہوئے کھیت موجود تھے۔

حوالدار کہنے لگا "مولا بخش! اب گھوڑے پر زین کس کر صاحب کے گھر جاؤ اور ڈاکے کی خبر دو۔ افضل خان! ساتھ تم بھی جاؤ لیکن یاد رکھو اپنے آپ کو پسینے میں خوب شرابور کرنے کی کوشش کرنا نہیں تو کپڑوں سے لہو سوکھ جائے گا۔ میں یہاں ہی رہوں گا اور سیدھی ڈپٹی صاحب کو اطلاع دُونگا اور گاؤں کے لوگوں کو بھی تیار کر رکھوں گا تاکہ ڈپٹی صاحب کے آنے تک سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

مولا بخش گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں ساتھ ساتھ دوڑتا گیا اور ہم دونوں نہایت ہی بُری حالت بنا کر روہیتری کی تحصیل میں شیر گوکرال کے سامنے پہنچے۔ صاحب ہماری کہانی لمبی اور سچی تھی کیونکہ ہم نے ڈاکوؤں کے نام تک بتا دیئے تھے۔ لڑائی کا تمام حال سُنا کر ہم نے اُسے چلنے کیلئے کہا لیکن وہ شیر ہماری کہانی سُن کر ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ صرف مسکرا پڑا جیسا کہ عام طور پر صاحب لوگ اس وقت کرتے ہیں جب اُن کے دلوں میں عیاری چھپی ہوتی ہے۔ وہ ہم سے کہنے لگا "قسم کھا کر کہتے ہو کہ سچی رپورٹ دے رہے ہو۔" ہم نے جواب دیا "آپ کے غلام سب کچھ قسمیہ عرض کر رہے ہیں۔ لڑائی کا لہو بھی ابھی ہمارے کپڑوں سے خشک ہوا ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔ کہ کیا آپ کے غلاموں کا لہو نہیں؟" وہ کہنے لگا "ٹھیک! ٹھیک! تم نے خوب کیا ہے۔" لیکن نہ تو اس نے گھوڑا لانے کے لئے کہا اور نہ پہلے کی طرح اپنی بھوت گاڑی منگائی۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ "ابھی آرام کرو اور کھانا کھاؤ۔ تم تھک گئے ہو گے

میں ڈپٹی صاحب کا انتظار کر لوں۔

حوالدار کا قانونی فرض ہے کہ وہ تمام ڈکیتیوں کی خبر سیدھی ڈپٹی کو دے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت وہ بھی آگیا۔ ڈپٹی کیا تھا ایک موٹا سا بوڑھا کھوسٹ۔ بڑا مغرور اور غصے والا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن ہمیں اس سے کب ڈر آتا تھا۔ سب سے زیادہ خوفناک تو شیر گو کرالی کی خاموشی تھی۔ ڈپٹی کے ساتھ رام بخش حوالدار اور کچھ دوسرے آدمی تھے جو گاؤں کے دس آدمیوں کو گرفتار کئے ہوئے تھے۔ ان تمام آدمیوں کا چال چلن ہماری نظروں میں اچھا نہ رہا تھا اور ہماری پولیس انہیں قید کرانے لائی تھی ان کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے تھے اور وہ رحم کے لئے منتیں کر رہے تھے۔ ان دس غنڈوں میں امام بخش کسان بھی تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ہمارے حوالدار کے پاس آنے جانے سے منع کر دیا تھا۔ ان غنڈوں کی ہمیں لوگوں نے رپورٹ کی تھی اور انہیں خوب پھنسایا تھا۔ حوالدار اپنی اس چالاکی اور بہادری پر پھولا نہ سماتا تھا لیکن ڈپٹی صاحب اسٹنٹ صاحب سے سرگرمی نہ دکھانے پر ناراض ہوگئے اور اسے جیسا کہ صاحب لوگوں کی عادت ہے ڈیم ڈیم کہنے لگے اور حوالدار کی تعریف کرنے لگے۔

نیکم صاحب اپنی لمبی سی کرسی پر چپ چاپ بیٹھے تھے انہوں نے پوچھا "ان لوگوں سے قسمیں لے لی ہیں؟" ڈپٹی صاحب کہنے لگے "ہاں اور دس بدمعاشوں کو

کو بھی پکڑ لیا ہے ۔ ابھی اور بھی ہونگے ۔ گھوڑا لو اور سرکار کے نام پہ روانہ ہو جاؤ ۔"
نیکم صاحب کہنے لگے ہاں یقیناً" اور بھی ہونگے لیکن گھوڑے کی کوئی ضرورت
نہیں ۔ آؤ سب آدمی میرے ساتھ ۔"

میں نے امام بخش کے ٹخنے پر ایک نشان دیکھا اُسے سزا دے دی گئی تھی
جو سزا اُسے ملی تھی شاید آپ اس کے عذاب سے واقف نہیں ہیں ۔ بہت سخت ہوتی
ہے ۔ میں نے شیر گو کراں کا چہرہ غور سے دیکھا ۔ اس پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی
میں اس کے پیچھے کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ۔
صاحب میں نے خوب ہی کیا جو پیچھے کھڑا رہا ۔ نیکم صاحب نے سامنے کے غسل خانے
کا دروازہ کھول دیا ۔ اور اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی ۔ صاحب کیا کہوں
ساتھ ہی میرا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اندر چھ کے چھ رائفل اور
تھانہ ہاؤلی کی پولیس کی کتاب پڑی ہے ۔

معلوم ہوا کہ وہ رات کو بھوت گاڑی پہ جو بھوتوں کی طرح بے آواز ہے تھانے
گیا ہم سوئے ہوئے تھے ۔ وہ ہمارے نزدیک پھرتا رہا اور جاتے وقت رائفلیں اور کتاب
اٹھالے گیا ۔ دو دفعہ تھانے آیا اور ہر بار تین تین رائفلیں لیتا گیا ۔ یہ دیکھ کر حوالدار
کا جگر پانی ہو گیا ۔ وہ نیکم صاحب کے بوٹوں پہ گر پڑا اور مٹی میں اپنا سر رگڑ رگڑ کر چلانے لگا ۔
"حضور بندے پر رحم کیجیئے ! حضور بندے پر رحم کیجیئے !!"

اور میں؟ صاحب میں تھا دہلی کا پٹھان۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا نوجوان باپ۔ حوالدار کی گھوڑی صحن میں بندھی تھی میں لپک کر اس پر ہو بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔ سرکار کے آدمی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میں نہ جانتا تھا کہ کدھر جاؤں۔ آخر ایک جگہ ایسی آئی جہاں میری گھوڑی گر کر مر گئی۔ مجھے ایک اور گھوڑی مل گئی۔ میں اس پر سوار ہوا اور اللہ تعالےٰ کی مہربانی سے جو بے شک ہمیشہ دیانت دار آدمیوں کا ساتھ دیتا ہے میں ان کے پنجے سے بھاگ نکلا۔ لیکن حوالدار اور دوسرے آدمی اب تک جیل میں ہیں۔

میں غنڈا ہوں؟ اب جیسا حضور کہہ لیں۔ اگر حضور مجھے اپنا غلام بنا لیں گے تو خدا حضور کو بہت بڑا حاکم بنا دے گا اور حضور کی شادی پری جیسی خوبصورت اور بہت امیر میم صاحب سے ہو گی اور حضور کے بڑے بڑے موٹے تازے بیٹے پیدا ہونگے۔ بہت سے۔ خدا حضور کا ہمیشہ مددگار رہے اب تو صرف ایک کام باقی رہ گیا ہے ابھی میں شہر جاؤں گا اور اپنے بچوں کو اس محل جیسے عمدہ بنگلے میں لے آؤں گا اور اس کے بعد ———— بس حضور ہی میرے مائی باپ ہونگے اور میں ———— افضل خاں حضور کا غلام۔

سردار جی! میں بھی نوکر ہو گیا ہوں صاحب کا۔

کسان

کسان

نومبر آ گیا۔

رین الکس کہنے لگی "آج رات غضب کی سردی ہے۔ برنادو! ذرا آتشدان میں اور لکڑیاں جھونک دو۔"

اس علاقے میں ایندھن کی افراط تو تھی ہی برنادو نے فوراً اُٹھ کر ارشاد کی تعمیل کر دی۔

میز پر لکڑی کی ایک نئی چپاتی پڑی تھی۔ وہ دُودھ بلو کر اُس میں سے اپنی بیوی کے لئے مکھن نکال رہا تھا بچہ جھولے میں گہری نیند سویا پڑا تھا۔ اور خواب میں مُسکرا رہا تھا۔ مارگو چرخہ کات رہی تھی۔ رین الکس آگ کے قریب بیٹھی لمبی لمبی سلائیوں سے کچھ بُن رہی تھی اور اپنے کام میں اس قدر مصروف تھی کہ اپنے پوتے یا اُس سوتے بچے کو کبھی ایک نظر دیکھ لینے کے سوا شائد ہی وہ کسی دُوسری طرف متوجہ ہوتی۔ گھر کا چھوٹا سا کواڑ بند تھا حضرت مسیح کی صلیبی تصویر کے نیچے ایک مٹی کے برتن میں گلاب کے پھولوں کا ایک پودا لگا تھا جس کی ہری بھری شاخوں میں چند خوشنما پھول بہار دکھا رہے تھے۔ برنادو کی بانسری ایک طرف طاقچے پر پڑی تھی۔ جب سے جنگ کی خبر آئی تھی اس کا دل اس قسم کی تمام تفریحوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

یکایک باہر شور وشغب اور چیخ پکار سُنائی دی۔ اور پھر نہایت درد وکرب سے سسکیاں لے لے کر رونے کی صدائیں آنے لگیں۔

برنادو نے اُٹھ کر بندوق ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا تمام لوگ گھروں سے نکل کر گلی میں آ گئے تھے۔ خوف وہراس کی ماری عورتیں اپنے بچوں کو سینوں سے چمٹائے نہایت بلند آواز سے آہ وزاری کر رہی تھیں۔

مشرق کی طرف اُفق کے قریب سُرخ رنگ کی ایک مہیب روشنی دکھائی دے رہی تھی اور ہوا کے دوش پر مبہم گونجتی ہوئی گرج دھیمے دھیمے آ رہی تھی۔

برنادو نے باہر آ کر پوچھا "کیا ہو گیا ہے"؟

جواب میں یک دم بیسیوں آوازیں سُنائی دیں۔ "پرشین آ گئے! پرشین! وہ دیکھو سُرخ سُرخ روشنی! —— شہر جل رہا ہے!!"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیئے سب پر سناٹا طاری ہو گیا ایسا سناٹا جو اُن کے نالہ وشیون سے بھی کہیں زیادہ بھیانک تھا۔

بوڑن الکس اپنے پوتے کے قریب آ کھڑی ہوئی اور پھر اپنی حلیم اور سنجیدہ آواز سے کہنے لگی "اگر ہمیں بہر حال مرنا ہے تو آؤ کیوں نہ یہیں مریں"؟

برنادو نے جواب میں اُس کے ہاتھ کو آہستہ سے ایک بوسہ دیا اس جواب نے اسے بالکل مطمئن کر دیا تھا۔

مارگو بھی اپنے بچے کو سینے سے لگائے سہم کر ان کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھوڑی ہی دیر پہلے اس کے چہرے کا رنگ کس قدر شگفتہ تھا۔ اور اب زرد۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولی" وہ اب کیا کریں گے"۔

برفادو اُس کے سوال پر ذرا مسکرا کر کہنے لگا۔"خدا جانے وہ کیا کریں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے عورتوں اور بچوں کو شاید ہی وہ موت کے گھاٹ اتاریں"۔

گروہ میں سے آواز آئی" اتاریں گے! ضرور اتاریں گے!

عجب سناٹے کا عالم تھا۔ سب چپ چاپ کھڑے تھے۔ تاریکی میں گلی اور بھی زیادہ سنسان معلوم ہوتی تھی اور دور بہت دور مشرق میں شعلوں کی سی سرخ زبانیں بلند ہو رہی تھیں۔ اب بھی ہوا کی ہلکی ہلکی گونج سنائی دے رہی تھی جیسے بھوک کے مارے بھیڑیے غرا رہے ہوں یہ جنگ و جدال اور آتش و غارت کی گونج تھی۔

آخر ایک آدمی نے اس پر سکوت کو توڑا اور بہ آواز بلند کہنے لگا" کیا شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے چھتوں سے چمٹے رہو گے؟ کیا تمہیں دھواں دے کر نکالا جائیگا؟ چلو بھاگیں!"

لیکن پرن الکس نے اپنی پُر وقار آواز سے اُسے خوب ہی ملامت کی اور کہا۔ "خرگوش کی طرح اگر شکاری کتوں سے ڈر کر بھاگتے ہو تو جاؤ بھاگ جاؤ لیکن میں اور میرا کنبہ ایک قدم بھی اپنی بستی سے پرے جانے کے لئے تیار نہیں!

ایک دفعہ تو یہ سب جوانمرد خوب ہی شرمندہ ہوئے۔ ایک عورت، عورت کیا نوّے برس کی ایک ضعیف بڑھیا جوانمردی میں اُن سے سبقت لے گئی تھی.....
اور اب کوئی بھاگنے کا ذکر تک نہ کرتا تھا۔ ہوا کے بھر دجھونکوں میں تمام رات انہوں نے ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے گزار دی۔ بچے ماؤں کی گود میں سمٹ کر پڑے کانپتے رہے اور اس تاروں سے خالی تاریک فضا میں، وہ لوگ تمام رات آگ کے شعلوں کی طرف دیکھتے رہے۔

دن نکل آیا ——— کچھ دُھندلا سا اُداس اور بہت سرد۔

بوڑھا ماتورین بڑبڑا کر کہنے لگا "آنے دو جی انہیں! وہ آئیں اور صلح صفائی سے چلے جائیں تو ہم انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بچاؤ کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں۔ نہ سپاہی ہیں نہ ہتھیار اور بارود بھی شاید ہی ہو!"

اس کے جواب میں برنادو خاموش رہا۔ دفعۃً یکایک اپنے لمبے لمبے ڈھنگ مناسب اعضا کو سیدھا کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نیلی نیلی سنجیدہ آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔

رین النکس اپنے چھوٹے سے مکان کے دروازے میں بیٹھی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "تمہارے ہاتھ بے آزار ہیں۔ تمہارے دل پاک ہیں اور تمہارا ایمان روشن ہے۔ ضرورت آ پڑے تو موت سے مت ڈرو۔"

یہ سُن کر وہ نیچی نظر کر کے ذرا مسکرانے لگا۔ چند ہی آدمی وہاں باقی رہ گئے تھے کیونکہ بہت سے تو بوڑھے تھے اور باقی نوعمر لڑکے۔ وہی چند آدمی جلدی سے ایک جگہ اکٹھے ہو کر صلاح مشورہ کرنے لگے۔ بوڑھے ماتورین پسنھالیے اور مے فروشوں نے مل کر متفقہ فیصلہ کر لیا کہ آنے والی مصیبت سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ خیر اسی میں ہے کہ ہمارے پاس جو بھی اسلحہ وغیرہ اور کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں کہیں چھپا دیں۔ اور اپنا گھر بار بلا حیل وحجت اپنے خونخوار دُشمن کو سونپ دیں۔ اگر ہم نے کچھ اور کیا تو بس سمجھو قتل عام ہو جائیگا۔ اس چھوٹی سی نگری میں توپ تلوار اور آگ کے مقابلے کی تاب کہاں ہے؟

تمام بستی میں صرف برنا وہی ایک ایسا آدمی نکلا جس نے اُن کی سختی سے مخالفت کی اور کہا "کیا ...... ؟ کیا ہم اپنے گھر اپنے بچے اور بیویاں یُونہی ان کے حوالے کر دیں اور بد قسمتی سے انہیں ایک ضرب تک نہ پہنچائیں؟ نہیں! اگر ہم نے ایسا کیا تو مجھے ڈر ہے کہ ہم مارے شرم کے کہیں ڈوب نہ مریں؟ ہمیں کون مرد کہے گا؟ آؤ دُشمن پر ثابت کر دیں کہ فرانس میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جنہیں موت کا ڈر نہیں۔ آؤ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ تو کریں! قصہ مختصر یہ کہ بہادری کی موت مریں۔ اگر فرانس کا ہر فرد مادرِ وطن کی ہر امکانی مدد کیلئے خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت ہو تیار ہو جائے تو یہی حقیر سی مدد دُشمن کو بھگا دینے کے لئے کافی ہے"۔

ماتورین اور دوسرے لوگوں نے برنادو کا خوب ہی مضحکہ اڑایا اور اس کی باتوں پر غل مچایا اور کہا "تم بے وقوف ہو! کل کے بچے ہو! اپنے ساتھ ہم سب کو بھی تباہ کر دوگے۔ تمہیں کیا خبر ہے کہ ادھر بندوق کا ایک فیر ہوا۔ نہیں فیر تو کجا کہیں کوئی بندوق تک پائی گئی اور اُدھر دشمن نے سارے کے سارے گاؤں کو پھونک کر رکھ دیا۔"

برنادو نے اپنا جوش برقرار رکھا دلیلیں دیں تدبیریں لڑائیں اور آدھی رات تک اس کشمکش کو جاری رکھا۔ اس کے گالوں پر نمکین آنسو بھی بہ رہے تھے۔ بجا غصے اور نفرت وحقارت کے جذبے کے اظہار کے لئے اس کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ اس کے لبوں سے آج پہلی مرتبہ ایک بے باک، سادہ پُراثر اور دلسوز تقریر سنی گئی تھی لیکن اس کے ساتھیوں پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اُنہوں نے اپنے سونے کے تمام زیور چھتوں کی کڑیوں میں چھپا دیئے تھے۔ تھوڑی بہت دُبلی پتلی بھیڑیں جو باقی رہ گئی تھیں باڑوں میں بھوکوں مر رہی تھیں اور وہ خود سب کے سب بھوک کے مارے افسردہ دل اور مصیبت زدہ روز روز کے خطروں نے انہیں بالکل ہی مُردہ کر دیا تھا۔ مال ومتاع کی قدر تو انہیں تھی ہی لیکن ایک چیز انہیں اس سے زیادہ عزیز تھی۔ یہ چیز اُن کی جانیں تھیں جنہیں وہ کسی طرح ضائع نہ کرنا چاہتے تھے پس وہ اُسے پاگل پاگل کہہ کر چلانے لگے اور کہنے لگے "توبہ تھوڑا ہی عرصہ پہلے ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی شخص ہمارا قاتل ہوگا۔

رین الکس نے جو پاس ہی خاموش کھڑی تھی اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور اس کے کان میں کہنے لگی "میرے بچے تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور وہ غلط لیکن اپنے بھائیوں سے اتنی کشمکش کرنی بھی اچھی نہیں برنادو تم اپنی زندگی جس کام میں لانا چاہتے ہو لاؤ یہ تمہاری ملکیت ہے لیکن انہیں کی مرضی پر چھوڑ دو۔ جو چاہتے ہیں کریں گیدڑوں کو شیر بنانا تمہاری طاقت میں نہیں۔"

برنادو کا سر سینے پر جھک گیا۔

اور پھر اپنے ساتھیوں سے بڑبڑا کر کہنے لگا۔ "اچھا تم جو چاہتے ہو کرو۔ تمہاری مرضی۔"..... یکایک وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اس کی بندوق چھین کر رات کی سیاہی میں اس چھوٹے سے گرجے کی سمت غائب ہو گئے جو گھنے جنگل میں ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے بندوق اور باقی سب ہتھیار اس قربان گاہ کے نیچے دفن کر دیئے جہاں مصلوب یسوع کا مرمریں مجسمہ کھڑا تھا۔

اب ماتورین بصد اطمینان میخانے کے وطن پرستوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا "جان بچی لاکھوں پائے! اب ہمیں کوئی کھٹکا نہیں۔..... اجی شکر کرو شکر۔ ہم اس پاگل کی باتوں میں نہیں آئے اگر ہم وہ کرتے جو وہ کہہ رہا تھا تو بس سمجھ لو کہ ہم سب گئے سب....."

برنادو کے پاس اب مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ اب اگر اس کے

پاس کوئی چیز باقی رہ گئی تھی۔ تو وہ خود اس کی زندگی تھی۔ وہ بالکل چپ چاپ اور بے حس و حرکت کھڑا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی تمام خواہشات مردہ ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے وطن کی خاطر ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن سے مقابلہ کرتا لیکن افسوس انہوں نے تو اسے اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ اب وہ کھڑا تھا، تن تنہا، مایوس اور بے دست و پا۔

آخر آپ ہی آپ کہنے لگا "انتظار کرنے کے سوا اب اور کچھ باقی نہیں رہا۔"

اندھیرا ہو گیا۔ خزاں کا دن ختم ہو گیا تھا۔ برنادو بازو میز پر ٹکائے اور ان پر اپنا غمگین سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مارگو بچے کو بہلا رہی تھی اور رین الکس شاید دعا مانگ رہی تھی۔

یکایک باہر گلی میں عورتوں کی چیخ پکار اور گھوڑوں کی ٹاپ اور فوجیوں کی کرخت آوازیں سنائی دیں۔ اندھیرے میں تلواریں بجلی کی طرح چمک جاتی تھیں اور فوجی سوار ندی میں چھینٹے اڑاتے جھپٹے چلے آ رہے تھے۔

برنادو اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ زرد اور اس کی نیلی آنکھیں رات کی طرح تاریک ہو گئی تھیں۔

اس نے پھر آہستہ سے کہا "وہ آ گئے ہیں۔ انہیں لئے نہیں کہ اسے یکایک

کوئی خطرہ یا دہشت محسوس ہوئی تھی بلکہ اس لیے کہ اس وقت اس کی روح میں اپنے وطن اور اپنی قوم کی محبت سرایت کر چکی تھی۔ وہ دونوں کی حفاظت کیلئے آخری دم تک کشمکش کرتے ہوئے مرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا!

اس نے نہایت بے باکی سے گھر کا دروازہ کھولا اور دہلیز پر دشمن کے روبرو کھڑا ہو گیا گلی سپاہیوں سے بھر چکی تھی ——— کچھ سوار تھے اور کچھ پیادہ۔ ان کے گروہ کے گروہ جنگل میں اور سڑک پر اس طرح امنڈے چلے آتے تھے جیسے مردار پر گدھ۔

یہ ایک چھوٹی اور حقیر سی جگہ ہی تو تھی اسے یونہی امن سے رہنے دیتے۔ کسی کی جرأت تھی کہ ان کے سامنے آئے!

گاؤں کے لوگ نہایت بیچارگی کی حالت میں کھڑے تھے مصیبت نے ان کے آنسو تک خشک کر دیئے تھے۔ خانگی زندگی کا معمولی سامان ہی ان کی دولت تھا اور وہی ان کی نظروں کے سامنے ہمیشہ کے لیے لٹ رہا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ خدا جانے یہی اسلحہ اور آگ جو اس وقت ہمارے گھروں کو پھونک رہے ہیں۔ رات ختم ہونے سے پہلے پہلے ہمارا کیا حشر کرینگے۔

جھونپڑی کی ڈیوڑھی کے نیچے انجیر کے درختوں کے ساتھ لگ کر دو عورتیں خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی دیکھ رہی تھیں ——— برنادو کا رنگ زرد ہو

ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سیدھا کھڑا تھا حقارت کے غضبناک جذبے سے اُس کی آنکھیں جل اُٹھی تھیں۔ مارگو اپنے پھول سے خوبصورت بچے کو گود میں لیے بے حس و حرکت کھڑی تھی کیونکہ برنادو کی یہی مرضی تھی۔ ریین الکس اپنے چہرے پر ایک صبر آزما دہشت کے تاثرات لیئے ذرا سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور اُس نے اپنے سینے سے ایک صلیب لگا رکھی تھی۔

دفعتہ "مسلح گروہ میں سے ایک آواز آئی۔" پکڑ لاؤ اِس کسان کو ادھر!"
یکایک برنادو پر بہت سے ہاتھ آن پڑے اور فوجی اُسے اُس کے دروازے سے زبردستی دھکیل دھکیل کر اس جگہ لے گئے۔ جہاں نیزہ برداروں کا سردار ایک بڑے سے سفید جنگی گھوڑے پر بیٹھا تھا اس کا گھوڑا تھک کر لڑکھڑا رہا تھا اور اس کے نتھنوں سے شاید خون بہ رہا تھا۔

برنادو نے اپنے آپ کو اجنبیوں کی گرفت سے جھٹک کر چھڑا لیا اور دشمن کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا چہرہ زرد نہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی پیدا ہو گئی تھی جس سے اس کا عزم و استقلال ظاہر ہو رہا تھا۔

جرمن کماندار کہنے لگا "اچھا؟ باقی گدھوں سے تم ذرا کم بیوقوف معلوم ہوتے ہو۔ کیا تم اس ضلع کے گردونواح سے اچھی طرح واقف ہو؟"

"اچھی طرح!"

"تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟"

"تھے!!"

"پھر کہاں رکھے تم نے؟"

اگر مجھے اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو تم خود ان کی موجودگی محسوس کر لیتے۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی"۔

جرمن سردار نے اس کی طرف نہایت تیز نگاہوں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کے بہادرانہ جواب کی داد دے کر کہنے لگا" کیا تم بتا دو گے ہتھیار کہاں ہیں"؟

"نہیں!"

"تم جانتے ہو کہ اسلحہ چھپانے کی سزا موت ہے"؟

"ہاں ——— تمہارا قانون یہی ہے"۔

"ہاں ہمارا قانون یہی ہے اور بریشنیڈر کی مرضی ہی فرانس کا قانون ہے تم ایک بہادر آدمی ہو اور تمہاری قدر واقعی موت ہی کر سکتی ہے لیکن اب میں پھر تم سے پوچھتا ہوں کہ تم گرد و نواح سے اچھی طرح واقف ہو؟

برناد مسکرا پڑا جیسے ایک ماں مسکرائے جسے کوئی سادہ لوح یہ پوچھے کہ تمہیں اپنے مرحوم بچے کی شکل یاد ہے؟

اگر تم اِس سے خوب واقف ہو تو میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ میری کاب کا چھڑا پکڑ لو اور اس کے ساتھ چمٹے رہو اور جیسے کوّا ایک ہی سیدھ میں اُڑتا ہے اُسی طرح مجھے سیدھا اُسی جگہ لے چلو جہاں ہتھیار چھپائے گئے ہیں۔ اگر تم نے بتا دیا تو تمہاری جان بخشی کر دی جائے گی اور اگر تم نے ——"

"ہاں اگر میں نے نہ بتایا تو؟"

پھر تم گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔"

برناڈو خاموش تھا۔ سپاہیوں کے جمگھٹے میں اُسے سامنے کے درختوں کے نیچے اپنی جھونپڑی نظر آئی۔ مارگو اور ریِن الکس نہایت بیتابی سے کشمکش کر رہی تھیں کہ انہیں کہیں برناڈو دکھائی دے لیکن سپاہی ہر مرتبہ انہیں پیچھے دھکیل دیتے تھے۔ متحرک مشعلوں کی ہلتی ہوئی روشنی میں نہ تو وہ اسے دیکھ سکتی تھیں اور نہ اس ہنگامے میں کچھ سن سکتی تھیں —— یہ دیکھ کر برناڈو نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ایک لمحے کے بعد فوجی لیڈر نے نہایت بے صبری سے پوچھا۔ "اچھا پھر بتاؤ تم نے اپنے لیے کیا انتخاب کیا ہے؟"

برناڈو کے ہونٹ سفید پڑ گئے تھے لیکن جب اس نے جواب میں یہ الفاظ کہے کہ میں غدّار نہیں ہوں" تو وہ اس وقت کانپ نہیں رہے تھے۔ اس وقت اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ اس چھوٹی سی ڈیوڑھی کی طرف اُٹھ گئیں جہاں اب بھی آتشدان

میں آگ چمک رہی تھی اور ــــ جہاں اس نے اپنے عزیز ترین رشتہ داروں میں بیٹھ کر مسرت کے کئی سال گذارے تھے۔ آہ کہیں قسمت مجھے ہمیشہ کے لئے وہاں جانے سے روک نہ دے!

پرشین کمانڈر نے اُسے ذرا گھورا اور پھر کڑک کر کہنے لگا "شیخی بگھار رہا ہے یا تیرے بیان میں کچھ حقیقت بھی ہے؟"

برنادو نے بس ایک دفعہ اور جواب دیا "میں غدار نہیں ہُوں"۔

جرمن سردار نے اشارہ کیا۔ یکایک ایک دھماکا ہوا۔ برنادو زمین پہ مُردہ پڑا تھا۔ ایک گولی اس کے دماغ سے ہوتی ہوئی نکل گئی اور دوسری پھیپھڑوں میں پیوست ہو گئی۔ سپاہیوں نے اس کے کانپتے ہوئے گرم جسم کو پاؤں کی ایک ٹھوکر لگا کر پرے پھینک دیا۔

اُنہوں نے صرف ایک کسان کو مار ڈالا تھا!

چڑیا

چڑیا

لکس، الکس! او مہیب صورت! میلے کچیلے! بے رحم کُتے! ادھر آ! فوراً واپس آجا!

کُتے تک پہنچنے سے پہلے پہلے لڑکی کے ننھے دماغ میں جو تحقیر آمیز الفاظ آئے اس نے اپنے جوش کے اظہار کے لئے کہہ ڈالے۔

چھوٹے چھوٹے بالوں والا سفید رنگ کا کتا اسکیمو نسل سے تھا۔ اس کے بائیں کان سے لیکر مُنہ کے ایک حصے تک کالے بالوں کی ایک دھاری سی چلی گئی تھی جس سے وہ بہت ہی مکار معلوم ہوتا تھا۔ دُنیا کا کوئی کتا بھی تحقیر آمیز بے پروائی کے اظہار کیلئے ایسی شکل نہیں بنا سکتا۔ اس نے لڑکی کے خوبصورت بکھرے ہوئے بالوں کی طرف سر اُٹھا کر ایک لمحے کے لئے دیکھا وہ اس کی طرف دوڑی آرہی تھی۔ پھر اس نے بے پروائی سے دوبارہ اپنی توجہ ایک چھوٹی سی زندہ چیز کی طرف مبذول کر لی جو گھاس میں پڑی ہل رہی تھی۔ کتا اس کے نزدیک اپنی ناک لے جا کر سونگھنے لگا اور اس پر آہستہ آہستہ اپنا پنجہ پھیرنے لگا۔

"پیچھے ہٹ جائیے جناب!" کہہ کر آٹھ سال کی کم سن اور نازک لڑکی نے پُوری قوت سے کُتے کے پہلو پر ایک مُکّہ رسید کیا۔ پاپا نے مُکّہ تو کُتے کو مارا لیکن

چوٹ اُسے خُود آگئی اور آئی بھی خوب کیونکہ کتے کو اپنے خاندان کے علاوہ شاید ڈیل مچھلی سے بھی کچھ اثر ورثہ میں مِلا تھا۔ اس کے پہلو تو بالکل ڈیل مچھلی کی ہڈی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

پاپا کا منہ انگارے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے جھک کر گھاس پر سے اس ننھی سی جان کو اٹھا لیا اور اپنے بوسوں سے اُسے گرم کر دیا۔ "آہ یہ کِس قدر چھوٹی اور کِس قدر قابلِ رحم ہے — ایک ننھی سی چڑیا" — باغ میں ایک نہایت ہی پرانا اونچا سا درخت تھا جس پر چڑیا کا گھونسلا تھا۔ یہ اس گھونسلے سے قبل از وقت اڑ کر گر پڑی تھی۔ اس نے ابھی پوری طرح اُڑنا بھی نہ سیکھا تھا۔ لڑکی نے دِل میں کہا درخت کی چوٹی تو مینار تک جا پہنچی ہے اور اس کی گھنی شاخیں خُود بھی ایک جنگل ہیں۔ اب اس تھکی ماندی چڑیا کو اپنے گھر کا راستہ کیسے مِلے گا؟

چڑیا کو خُود بھی اپنی بدقسمتی کا علم تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ نہایت دردناک آواز سے چُوں چُوں کرنے لگ جاتی اور اپنی چمکدار سیاہ آنکھیں خوف اور تکلیف سے بند کر لیتی اور اپنا جسم سمٹا لیتی۔ اُف! اس کا دل کس زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ لڑکی نے سوچا یہ ضرور سخت زخمی ہو گئی ہے یقیناً اس میلے کچیلے کتے نے اس کی چھاتی توڑ ڈالی ہے۔ افسوس مجھے کِس طرح معلوم

ہو کہ اس کم بخت نے کیا شرارت کی ہے؟ اب بھی اس شوخ کتے کی اتنی جرأت تھی کہ اس نے اپنی تھوتھنی بچی کے کندھے پر رکھ دی جیسے وہ ابھی ابھی کئی دفعہ زبان سے چاٹ چکا تھا۔ اس کا دھوکا دینے کا سادہ انداز اور اس کی "فصیح" آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ "مجھے میری چیز واپس دے دو یہ میں نے پائی ہے اور میری ہے میں اس سے کھیلنا چاہتا ہوں۔ جب میں اسے اپنے پنجے سے چھوتا ہوں تو یہ کیسی عمدگی سے سمٹ جاتی ہے۔"

پاپا نے پھر حقارت سے کہا "ہٹ جاؤ جی۔" اور دوڑ کر کتے کو اپنے پاؤں سے زور کی ایک ٹھوکر لگائی جس سے اس کے نازک ٹخنے کا جوڑ اپنی جگہ سے ٹلتے ٹلتے رہا۔ لیکن کتا اپنے دل میں ضرور مسکرا پڑا ہو گا۔

وہ دوڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور چڑیا کو دودھ اور روٹی کے ٹکڑے کھلانے لگی۔ وہ جانور پالنے کا فن جانتی تھی۔ گزشتہ سال اس نے نہایت کامیابی سے چڑیا کے تین بچوں کو جو اپنے گھونسلے سے گر گئے تھے پال لیا تھا اور ان میں سے دو تو اس چڑیا سے بھی بڑے ہو گئے تھے لیکن وہ تو پھر بھی موٹی موٹی اور بیڈول چڑیاں تھیں اور ہزاروں ایسی اڑتی پھرتی ہیں اور یہ تو عام چڑیوں سے بالکل مختلف نہایت خوبصورت اور نازک چڑیا تھی۔

ننھی چڑیا اپنی محسنہ کی دی ہوئی خوراک نہ کھاتی اور جب وہ آہستہ سے اسکی

چونچ کھول کر اس میں دودھ ڈالتی تو وہ نہ پیتی۔

گھر کی باورچن پیسٹری بورڈ کے قریب کھڑی تھی۔ باورچن کیا تھی لمبے قد کی ایک لحیم و شحیم عورت شوربے کی پلیٹ کے سے چہرے والی اور مرجھائی ہوئی آنکھوں والی ڈائن۔ اس نے چڑیا کی طرف نہایت ترحم آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا "تم نے تو بیچاری چڑیا کو سخت دق کر رکھا ہے مجھے دو میں اسکی تکلیف کا خاتمہ کر دونگی۔"

پاپا کو سخت غصہ آگیا اس نے اپنا خوبصورت سر اُدپر اٹھایا اور اسے ذرا اُوپر کی طرف جنبش دیتے ہوئے کہنے لگی "تو اپنا ہی خاتمہ کریگی"۔

بیشمار کبوتر دل، چوزوں اور تیتروں کی قاتلہ، نہایت حقارت آمیز منہ بنا کر ذرا غصے سے بولی "میں ظالم نہیں ہوں میں کبھی ایک غریب اور بے کس جانور کو اپنے کھیلنے کیلئے اس طرح تکلیف نہ دوں"۔

باورچن کی ڈانٹ سن کر پاپا کانپ گئی اور اس پیشہ ور قاتلہ سے بچنے کیلئے باورچی خانہ چھوڑ کر بھاگ گئی۔

"اُف یہ باورچن کس قدر خوفناک باتیں کہہ سکتی ہے اور جو شاید درست بھی ہیں" کیونکہ میں اس سے کھیلنا چاہتی ہوں"، اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ بلی سے بھی زیادہ قصوروار ہے کیونکہ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں لیکن انسان اپنے

افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے لگلے دِن کیا ہوُا تھا۔ جب بوڑھے فلاک کے لئے وٹرنری سرجن بلایا گیا اور اس نے کہہ دیا کہ یہ لاعِلاج ہے؟ دادی اماں نے ابا سے کہہ دیا تھا کہ اِس پر رحم کرو اور اِسے گولی سے مار دو تاکہ یہ بغیر تکلیف کے مر جائے اس پر پاپا نے اپنی بندوق لے کر فلاک کو مار ڈالا تھا' وہ اُن کا بہت پیارا کتا تھا"۔

پاپا نے آہستہ سے چڑیا کے کان میں کہا "تم میری پیاری ہو۔ میں تم پر رحم کرونگی۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے لئے یا کسی اور پرندے کے لئے بہترین موت کیا ہو سکتی ہے۔ تم آخری لمحہ تک خیال کرتی رہو گی کہ میں اُڑ رہی ہوں' پھر تم ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاؤ گی ایک پرندے کیلئے تمام باتوں کا خاتمہ یہی ہے"۔

وہ دوڑ کر صحن کے پار چلی گئی اور برآمدے میں سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی بالاخانے پر چوکیدار کے کمرے میں جا پہنچی۔

چوکیدار نام ہی کا چوکیدار تھا وہ نہایت پُرانا نوکر تھا جسے سوائے ناس لینے اور سونے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ بالاخانے کے بُرج کو تو وہ اپنی مملکت ہی سمجھے بیٹھا تھا خود تو کبھی اُوپر نہ گیا تھا ہاں البتہ اسکی بوڑھی بلّی ٹام نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا کہ ہر آنے والے کیساتھ ساتھ اُوپر تک جائے۔

چوکیدار کے کمرے کا نصف پٹ کھُلا تھا۔ اس میں ایک سوراخ بھی تھا جس کے قریب سے گزرتے ہوئے پاپا نے اندر ایک نگاہ ڈالی۔ بوڑھا آدمی اپنی آرام کرسی پر سو رہا

پڑا تھا اور اس کے دوسری طرف ٹام میز پر بیٹھی محافظت کر رہی تھی۔

جونہی اس نے لڑکی کو آتے دیکھا میز پر سے کود پڑی اور اپنے آپ کو سکیڑ کر دروازے کی درز میں سے سانپ کی طرح نکل کر دبے پاؤں اس کے ساتھ ہولی اور نزدیک آکر اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ اس نے نہایت توجہ سے اپنی گول گول مقناطیسی آنکھوں سے پاپا کو گھورنا شروع کیا۔

معلوم نہیں اس نے پرندے کی بُو پالی یا خود ہی اُسے پتہ لگ گیا کہ لڑکی کے ہاتھ میں کیا ہے۔

زینہ گرد سے اٹا پڑا تھا جس پر شفق کی دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی۔ کھڑکیوں پر بھی گرد ہی گرد نظر آتی تھی۔ کھڑکیاں کیا تھیں محض چوکھٹے رہ گئے تھے جن پر مکڑی نے جالا تن رکھا تھا۔ کبھی کبھی کوئی چیز دوڑ کر پاس سے گذر جاتی —— شاید چوہے تھے۔ اس کے بعد کمرے میں کچھ گڑ بڑ سنائی دیتی اور کسی جاندار کی خوف اور تکلیف کی تیز اور باریک آواز کی چیخیں سننے میں آتیں۔ تھوڑی دیر بعد شکاری جانور پاپا کے پاس واپس جاتا اور اپنی زرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پاپا کی طرف دیکھنے لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلی یہ کہہ رہی ہے "مجھے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اور ہے تم مجھے اس سے محروم رکھنا چاہتی ہو لیکن یاد رکھو میں اسے لیکر رہوں گی۔ میرے پنجے بہت تیز ہیں"!

لڑکی ڈر گئی اور دوڑ کر زینے پر چڑھنے لگی آج تو زینہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا۔ اُف! یہ کس قدر بلند ہے اور اس کے پیچدار راستے نے تو دماغ ہی چکرا دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارد گرد کی تمام چیزیں گھوم رہی ہیں۔

دفعتہً چڑیا کو جنبش ہوئی اس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اس کے ننھے بازوؤں کو ایک جھٹکا سا لگا اور پھر وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ وہ بالکل جنبش نہ کرتی تھی۔ شاید یہ اس کے آخری لمحات تھے۔ اب پاپا غالباً ایک نعش اٹھائے لئے جا رہی تھی۔

کس قدر بھیانک خیال تھا — موت کا یہ خیال! وہ کانپ گئی اور آہستہ سے چڑیا کے پاس اپنے ننھے ننھے ہونٹ لے جا کر کہنے لگی "مت مرو! مت مرو! تم میرے ہاتھوں میں نہ مرو"۔ اس نے پرندے کے سر کو اپنے گال سے لگا لیا اور اپنی سانس سے اُسے گرم کرنے لگی۔

بلّی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ اُچھل کر لڑکی کے قریب آ گئی اور میاؤں میاؤں کر کے اُسے دھمکیاں دینے لگی۔ لڑکی کے دل میں ایک بزدلانہ خیال آیا۔ کیا میں پرندہ اسے دے دوں۔ یہ تو اب مر ہی چکا ہے۔ لیکن شاید اس کی جان پوری طرح نہیں نکلی اور بلی کی چیر پھاڑ کے خیال سے یہ بہت ڈرے گی اور اسے تکلیف ہو گی۔ نہیں — کبھی نہیں! میں اسے نہیں دونگی۔ میں اپنی مرضی کی مالک خود ہوں

میں کیوں ایک بوڑھی بلی سے شکست کھاؤں۔

دور ہو! میری آنکھوں سے دور ہو! ——— تو تو ایسی ذلیل ہے کہ تجھے بلی کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

وہ دل میں خوش ہونے لگی اور کہنے لگی "آہا آہا اس بلی کیلئے میں نے کیسی اچھی گالی سوچی ہے!"

اس کے بعد وہ پھر دوڑ کر سیڑھیوں پہ چڑھنے لگی آخر وہ اس دروازے کے قریب پہنچ گئی جس کے آگے ایک چبوترہ تھا۔

دروازے کی پرانی لکڑی میں شگاف ہو گئے تھے جن میں سے سورج کی سنہری اور رنگ برنگی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ پایا نے دروازہ کھولا اور باہر چبوترے پر آگئی۔ بلی بھی اس کے قدموں میں موجود تھی۔ اب اُسے بلی سے کوئی خوف معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس نے ننھی چڑیا کا منہ چوما۔

"اب میں تم پر رحم کرتی ہوں تمہیں اور تکلیف نہ ہو گی۔ تم گرتی جاؤ گی گرتی جاؤ گی لیکن تمہیں یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہو گا" اس کے بعد لڑکی نے بالا خانے کی چوٹی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔

بہت سے درختوں کی چوٹیاں یہاں تک آپہنچی تھیں اور پرانا درخت تو سب سے بڑھ گیا تھا۔ اور اس قدر قریب تھا کہ آدمی شاید اُسے چھو بھی سکے۔ سب سے

اونچی ٹہنیوں میں کچھ جنبش ہوئی اور کسی پرندے کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور ساتھ ہی پرندے کی مضطربانہ چیخ پکار سنائی دی۔ لڑکی چلا کر بولی "یہ تم ہو؟ — چڑیا کی اماں؟ آہ تم بھی کتنی بدقسمت ہو! تمہاری بچی آ رہی ہے لیکن افسوس کہ وقت سے بہت دیر بعد۔ اب یہ مر چکی ہے پاپا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا بلی اُچک کر منڈیر پر جا بیٹھی۔

لڑکی نے جھلّا کر کہا "میں تمہیں ہرگز نہ دُونگی! — ہرگز نہیں" ایک لمحے کیلئے اس نے زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مٹھی کھول دی۔

ایک لمحے تک چڑیا نیچے کی طرف گری اسکے بعد — او خدا! — اچھے خدا! یہ مردہ تو نہ تھی — یہ زندہ تھی! اس نے اپنے پر پھیلائے۔ اسکے گلے سے خوف میں ملی ہوئی مسرت کی ایک آواز نکلی اور وہ کچھ عجیب طرح اڑتی ہوئی جیسے کوئی مدہوش ہو اڑنے درخت کی بالائی شاخوں میں جا پہنچی۔ وہاں مسرت بھری آوازوں سے اسکا خیر مقدم کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت مضطرب ہو کر اس سے پوچھ رہا ہے "تم اچھی تو ہو؟ سچ مچ؟ بالکل اچھی؟"

"اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا" پاپا نے چلا کر یہ الفاظ کہے اور پھر بلی کے افسردہ اور مایوس گول چہرے کیطرف دیکھ کر ایک قہقہہ لگا کر بولی "بیوقوف بڈھی بلی! لگا اسکے پیچھے چھلانگ! اور اُسے پکڑ لے! وہ اب محفوظ ہے تجھ سے اور اپنے سب دشمنوں سے وہ اب اپنی ماں کے پاس ہے۔"

ننھی لڑکی وہیں ٹھیر گئی اور خیالات میں کھو گئی۔ اپنے اور چڑیا کے درمیان فاصلہ دیکھ کر اس نے آہستہ سے یہ لفظ دہرائے "— اپنی اماں کے پاس۔"

اُسے بالکل خبر نہ تھی کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ وہ اس قدر ننھی تھی ... لیکن ایک

اُس کی حسین بیوی

اُس کی حسین بیوی

میں ایک بازار میں سے گزر رہا تھا کہ مجھے اپنا عزیز دوست پال ڈورن ملا۔
میں نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کیلئے کہا "آداب عرض ہے جناب! اتنی مُدت کہاں چھپے رہے ہو؟ غضب کر دیا بھئی تم نے بھی۔ چھ مہینے ہونے کو آئے لیکن کبھی شکل تک نہ دکھائی۔ آخر اس کی کوئی وجہ؟ ہاں ہاں اب تو شادی بھی کرالی۔ کہو کیسے گزرتی ہے؟ میں اس خیال میں تھا کہ تم شادی کے پاس تک نہ پھٹکو گے۔ خدا کی قسم مجھے تم سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ لیکن عورت ذات . . . اُف خدایا تیری پناہ۔"
پال ہنس دیا اور میرے بازو میں بازو ڈال کر آگے چل پڑا۔ اس وقت میرے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا تھا۔ "پال ڈورن" اور "شادی" اُف کس قدر متضاد چیزیں تھیں۔ مجھے اب بھی یقین نہ آیا۔ افسوس! ہماری جوانی کا بھی کیا حشر ہوا۔
میں نے پال کو مائزی کی بات یاد دلائی لیکن شاید وہ اس ذکر سے کتراتا تھا۔ اسلئے میں نے گفتگو کا موضوع بدل لیا۔
ہم آگے جا رہے تھے وہ کیس سے ایک سگار نکال کر پینے لگا اور میں نے بار بار

کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اب وہ پہلے سے بھی ذرا زیادہ متین نظر آتا ہے اور اوسط درجے کے شرفا میں جو ایک خاموش متانت ہوتی ہے۔ وہ بھی اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ شادی کر چکا ہے نا میں نے اس سے جو مذاق کیا تھا اس پر دل ہی دل میں مجھے خود ندامت ہو رہی ہے۔"

یہ سوچکر میں نے اس سے کہا۔" اُو بیا ہے ہوئے لونڈے۔ تم جانتے ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں اور تم ؟ تمہاری نسبت کیا کہوں تم اب مجھ سے بہت مختلف ہو یعنی ایک خوبصورت بیوی کے شوہر!"

اُس نے آہستہ سے میرا بازو چھوڑ دیا اور کہنے لگا" اب اس ذکر کو چھوڑو گے بھی ؟ تم لوگوں کی گفتگو کی تان تو بس ایسی ہی باتوں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ بھئی مان لیا۔ مان لیا سو دفعہ مانا کہ میری بیوی حسین ہے! حسین ہے! حسین ہے! اور ہمیشہ حسین ہو کر میرے سر پر سوار رہے گی۔ میں اب تنگ آچکا ہوں، کہاں تک سنتا جاؤں۔ مجھے اپنی بیوی عزیز ہے لیکن ذرا انصاف سے کام لو۔ کیا تمہیں اس کے متعلق ذرہ برابر بھی واقفیت ہے کہ حسین بیوی کا شوہر ہونے کا کیا مطلب ہے ؟ تم ہو کل کے چھوکرے! اگر تمہیں اس کا تجربہ نہیں تو پھر اس کے متعلق تمہیں کچھ سننے کا بھی مطلق حق نہیں ہے۔ میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ لیکن اس کیلئے صبر ایوب!" یہ کہہ کر اُس نے زور زور سے سیٹی بجانی شروع کی۔

میں نے جانا میں اُس کا مطلب سمجھ گیا ہُوں اور دل ہی دِل میں اُسکی بے چارگی پر بہت خوش ہوُا۔

"پال! دیکھا کئے کی سزا آگے آئی۔ یہ تو صرف تمہارے عمل کی جزا ہے۔ ہاں! اب ذرا رقیبوں سے پالا پڑا ہے۔ اب چھٹی کا دُودھ یاد آیا ہے۔ خیر کوئی حرج نہیں۔ مطمئن رہو۔"

پال نے میری طرف حیرانی سے دیکھا اور کہا "او گدھے! رقابت وقابت کا کوئی سوال نہیں تیرا خیال کدھر ہے؟"

"کیا کہا؟ نہیں؟ کیا تمہارے سر پر رقابت کا جن سوار نہیں؟ اچھا! پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"ارے نہیں۔ بالکل نہیں۔ معاملہ دگر گوں ہے۔ میں چند لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ بھئی سچ تو یہ ہے کہ حسین بیوی اچھی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ... بشرطیکہ وہ اپنی خوبصورتی کیلئے خوبصورت نہ ہو۔"

"کیا لایعنی باتیں کر رہے ہو! کوئی عقل کی بات بھی کہو گے یا نہیں؟"

"لو سُنو۔ سب کچھ کہہ سُنانے کے سوا چارہ نہیں۔ میں تمہیں مثال کے ذریعہ سے صورتِ حالات تک پہنچاؤں گا۔"

اس کے بعد اپنا سگار سلگا کر وہ یوں گویا ہوُا:۔

"اب ذرا اُس دِن کا خیال کرو جب ہماری شادی ہوئی۔ ہم ماہِ مسرت" منانے جا رہے تھے۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور فوراً روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ نادان تھا نا۔ پہلے ہم میونچ پہنچے۔ میں نے چاہا کہ اُسے ذرا شہر دکھا دُوں اسکے بعد چند پُرانے دوستوں سے مِل کر ہم کوہستان بوریا کو چلے جائینگے۔ پہلے چند دنوں کے واقعات تو چھوڑ دو۔ قابلِ ذکر نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی خوش مَیں بھی خوش۔ ہم نے یہ کیا وہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تھوڑے ہی دِنوں کے بعد مجھے معلُوم ہوا کہ اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اُلجھن میں پڑ گئی ہے ––– وہ کوئی ایسی چیز حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے جو اس کے پاس موجُود نہیں۔ یا وہاں کی کوئی خاص بات اُسے پسند نہیں آتی۔ وہ چیز کیا ہو سکتی تھی؟ میں نے اس کے متعلق اُس سے پُوچھا بھی لیکن وہ کہنے لگی کہ میں تو بالکل خُوش ہُوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے کسی خاص چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو یہ شہر بہت پسند ہے۔ ہاں البتہ"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد وہ کچھ ہچکچا سی گئی میں نے کہا "ہاں ہاں کہو، کہو" اس پر وہ کہنے لگی "یہاں کے لوگ بہت ہی ناشائستہ ہیں"۔

میں بالکل اس کا مطلب نہ سمجھ سکا میں نے اُس سے کہا۔ "میری پیاری! میرے وطن کے لوگ ذرا پُرانے خیالات کے اور کچھ اتنے مہذب تو نہیں لیکن ناشائستہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

وہ کہنے لگی "نہیں! وہ ناشائستہ بھی ضرور ہیں ––– چاہے کوئی بازاروں میں

گھنٹہ بھر یا اس سے بھی زیادہ عرصہ پھرتا رہے کیا مجال ہے جو کوئی فرد مڑ کر دوسرے کی طرف دیکھے بھی۔ کیا یہی تہذیب ہے؟ لیکن مجھے اُس کی پروا نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہونگی کہ وہ ناشائستہ ہیں!"

سمجھے آپ؟ اب میری بیگم صاحبہ ناراض ہو چکی تھیں۔ ایک حسین عورت چاہتی ہے کہ بازاروں میں ہر طرف میرے ہی شیدائی نظر آئیں، لیکن اہلِ میونخ اس بات کے لئے تیار نہ تھے۔ تم ہنس رہے ہو ابھی ٹھہرو۔

دُوسرے دن صبح میں ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ دس بج چُکے تھے ہم نے ایک مشہور نمائش دیکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ ہوٹل میں میری بیوی کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ میں نو بجے سے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے تمام اخبارات مع اشتہاروں کے پڑھ ڈالے تھے۔ ناشتہ بھی کر چکا تھا۔ اور اب مجھے خدمتگار کے انتظار سے بھی شرم آ رہی تھی اور محض اسی لئے میں بیر کا دوسرا گلاس منگا کر پی رہا تھا میری میز کھڑکی کے نزدیک تھی اور میں نہایت مُردہ دِلی سے کھڑکی سے باہر تھیٹر کی عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید تمہیں وہ جگہ یاد بھی ہوگی۔ اِبسن وہیں بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت ہوٹل بالکل سُنسان ہو جاتا ہے خادمائیں بھی کاہلی سے دیواروں کیساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اگر اس وقت ہمارے سوا وہاں کوئی مہمان تھا تو وہ چند طلبہ تھے جو ایک بڑی سی میز کے اِردگرد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اس وقت کمرے

میں کچھ اندھیرا سا تھا "سیکون کلب" کے ممبروں کی سبز ٹوپیاں (جنہوں نے اس ہوٹل کو اپنا صدر مقام بنا رکھا ہے) دیوار پر ٹنگی ہوئی تھیں اور یہی ایک رنگین چیز تھی جو اس دھندلی روشنی میں بھی دیواروں پر دکھائی دے رہی تھی۔ ہوٹل کے اندر ہر طرف خاموشی طاری تھی، ہاں کبھی کبھی تاش کے پتوں کے میز پر زور سے پٹخنے کی آوازیں کمرے کے سکوت کو توڑ دیتی تھیں۔ گیارہ بج گئے ساڑھے گیارہ ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب میں نے اخباروں کے اشتہار بھی پڑھنے شروع کر دیئے کبھی کبھی دزدیدہ نظروں سے میں اس دروازے کی طرف بھی دیکھ لیتا جہاں سے اس کے باہر نکلنے کی توقع تھی۔

آخر وہ آ گئی۔ وہ ایک خوبصورت سا چست انگریزی فراک اور جرارڈی کی ہیٹ پہن کر نہایت ہی نزاکت سے خراماں خراماں باہر آئی۔ اس وقت وہ بہت ہی خوبصورت اور نہایت ہی شیریں ادا معلوم ہو رہی تھی اور خاص طور پر خوش تھی۔ اس نے نہایت ہی خوش خلقی سے ہوٹل کی منتظمہ اور خدمتگار سے میرا پتا پوچھا اور پھر مسکراتی ہوئی ہوٹل کے بڑے کمرے سے جہاں طالب علم بیٹھے تھے گذری۔ اب ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنے کھیل میں کس قدر منہمک ہیں جب وہ ان کے قریب پہنچی تو اس نے اپنی چھتری نیچے گرا دی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور چھتری اٹھانے کیلئے لپک کر بڑھا لیکن وقت پر نہ پہنچ سکا خادمہ نے جلدی سے

چھتری اُٹھالی۔ اگیتھا نے اس کا شکریہ بھی ادا کر دیا لیکن طلبہ اپنا کھیل چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ "تم کس چیز کا ناشتہ کرو گی" لیکن معلوم ہوا کہ وہ پھر بگڑ چکی ہے۔ مجھ سے کہنے لگی "میں کھڑکی کے قریب نہیں بیٹھتی یہاں سورج کی شعاعیں سخت تکلیف دہ ہیں"۔ میں نے کہا "بہتر! تو اچھی اگیتھا پھر ادھر آجاؤ"۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کمرے کے وسط کی ایک میز کے سامنے جو اُن طلبہ کی میز کے بہت نزدیک تھی جا بیٹھی اور جب اُس نے بیٹھنے کیلئے کرسی گھسیٹی تو ایک دوسری کرسی کو جس پر اخبار پڑے تھے جان بوجھ کر اُلٹ مارا۔

لڑکے پھر بھی کھیلتے رہے۔

بکھرے ہوئے اخبار میں نے اُٹھالئے اور نہایت خوشامد کے انداز سے دیکھو کر میں ضرور اس نمائش میں شریک ہونا چاہتا تھا) پھر اُس سے پوچھا۔ "کس چیز کا ناشتا کرو گی"؟

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی تیز میں آواز میں کچھ عجب انداز و ادا سے کہنے لگی "اچھا یہ تو بتاؤ اس وقت ان لڑکوں کو تاش کھیلنے پر اور بیر پینے کے سوا اور کوئی کام نہیں"؟

میری نظریں "وانتا دیلی" پر جمی ہوئی تھیں اور اب میں نے "کالون گوٹ" بھی

اُٹھا لیا تھا کیونکہ اسکی تقطیع ذرا بڑی ہوتی ہے۔ لیکن میری بیوی اب بھی اپنے ارادے سے باز نہ آئی تھی۔ اس وقت وہ چاکولیٹ پی رہی تھی۔ اور اُس نے مجھے کو کچھ اس انداز سے پکڑ رکھا تھا کہ اسکے چھوٹے سے پیارے پیارے ہاتھ کی نزاکت کا سحر کسی سے چھپا نہ رہے۔ آخر اس نے تنگ آکر اب کی ذرا واضح الفاظ میں دل کا بخار نکالنا شروع کیا۔ کہنے لگی "آہ بیچارے والدین! معلوم نہیں کس مشکل سے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنے خون پسینے کی کمائی ان بھلے مانسوں کی طرف بھیج رہے ہیں اور یہ ہیں کہ اپنا تمام قیمتی وقت بیئر پینے اور تاش کھیلنے میں ضائع کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں تقسیم اور اس کا ڈنڈا کہاں گیا۔"

میں بظاہر "کالون گزٹ" پڑھنے میں منہمک تھا۔ لیکن اُسے اس کی کیا پروا۔ وہ پھر بول اُٹھی "ذرا دیکھنا ان کی کھوپریوں پر وہ چھوٹی چھوٹی سبز ٹوپیاں کیا اچھی لگتی ہیں۔ کیا تم نے کوئی چیز اس سے زیادہ مضحکہ خیز بھی دیکھی ہے۔ کیا ریلوے کے قلیوں میں اور ان میں ذرہ برابر بھی فرق ہے؟"

اُس وقت جو میرے احساسات تھے بیان نہیں کر سکتا۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن میری بیوی مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں اس گرمی میں تفریح کے دوران میں ڈوئل لڑوں۔ لیکن میں نے اُونٹ کو نکیل سے پکڑا اور کہا معلوم ہوتا ہے تمہیں میونخ بالکل پسند نہیں اگر یہ معاملہ ہے تو ہمارا یہاں ٹھہرنا بے معنی ہے۔ دو گھنٹے تک شیلا ٹرسی

جانے والی ٹرین کا وقت ہو جائیگا۔ وہاں میرے ایک پرانے دوست مسٹر ڈریسچر رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ایک خوبصورت شہر بھی ہے۔ نمائش کا خیال فضول ہے۔ اسے جانے دو۔ آؤ اپنا سامان باندھ لیں اور ایک دو گھنٹے تک روانہ ہو جائیں بس اب یہ بات "طے شدہ" ہو گئی۔ وہ جانتی ہے کہ جب میں کسی امر کو "طے شدہ" قرار دے دیتا ہوں تو پھر اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔

ہم چار بجے شیلا ٹرسی پہنچ گئے۔ میں نے ڈریسچر کو بذریعہ تار اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ وہ اسٹیشن پر آ کر ہمیں اس ہوٹل میں لے گیا جو وہاں کی ایک جھیل کے کنارے واقع ہے۔ ہم نے ایک بڑا سا کمرہ کرائے پر لے لیا جہاں سے جھیل اور وادی کا خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ اگیتھا تھک گئی تھی اسلئے لیٹ گئی۔ میں اپنی بائیسکل پر تمام جھیل کے ارد گرد چکر لگاتا، گاؤں اور وہاں کے ڈاک خانے سے ہوتا ہوا آٹھ بجے کے قریب واپس آیا۔ وہ باغ میں ایک کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ دوسری میز پر گاؤں کے چند آدمی بیٹھے تھے اور تیسری میز پر گاؤں کا پادری وہاں کے بوڑھے "داروغہ شکار" کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس جگہ کی خوبصورت اور پرامن فضا مجھے بھا گئی۔ دل چاہتا تھا کہ جی بھر کے یہاں دن گزاریں۔ میں نے بائیسکل پرے رکھی اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ سفید براق لباس پہنے ہوئے تھی اور نہایت سستی سے اپنے ہاتھوں میں ایک کتاب پکڑے ہوئے اپنی بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے جھیل

کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک خوبصورت تصویر معلوم ہوتی تھی، لیکن افسوس!۔۔۔ تم جان گئے ہو گے۔ افسوس وہ دیہاتی وہ پادری اور "داروغہ شکار" اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔۔۔۔ کیا کہوں۔

میں ذرا ہچکچاتے ہوئے اس کے قریب پہنچا اور اس سے کہا "کہو یہ جگہ تو پسند آگئی؟ اچھی ہے نا؟"

جواب میں اس نے مجھ پر ایک ایسی نگاہ ڈالی جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی اور پھر کہنے لگی "تم نے اس جگہ کا کیا نام بتایا تھا؟ شیلا ٹرسی؟ اس جگہ کے متعلق میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ میں یہاں دو دن بھی نہ ٹھہروں گی۔ مجھے یہ جگہ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔"

"لیکن میرے خیال میں یہ جھیل اور۔۔۔۔"

"اپنا اپنا ذوق ہے۔ یہ جھیل چھوٹی سی اور بالکل فضول ہے۔"

"لیکن یہ خوبصورت وادی۔۔۔۔"

"وادیاں صحت کیلئے تباہ کن ہیں۔ ہر ڈاکٹر تمہیں بتا سکتا ہے۔"

"لیکن پہاڑ وغیرہ اور یہ۔۔۔۔"

"سب فضول ہیں۔"

اس کے بعد ہماری گفتگو کچھ دیر کے لیے رکی۔ آخر تھوڑی دیر بعد وہ کہنے لگی۔

"اور یہاں کھانا بھی کس قدر بیہودہ ملتا ہے۔ بیویریا کی شراب تو آدمی کو بہت موٹا کر

دیتی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ موٹی بن کر دیہاتی عورتوں کی سی ہو جاؤں۔ سنو اگر میرا مقصد خاموش زندگی بسر کرنا ہوتا تو میں شادی نہ کراتی۔ نن بن جاتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں۔"

میں نے جواب دیا "بہت اچھا اگر تمہیں یہ جگہ پسند نہیں تو اگر آج نہیں تو کل ہم ضرور یہاں سے روانہ ہو جائینگے۔"

میں کچھ بدل سا ہو گیا تھا یہ نت نیا تغیر و تبدل روز کا اسباب باندھنا نئے نئے کمروں میں نئے نئے آدمیوں سے دوچار ہونا ریل گاڑی کا ہم سفر مجھے سخت ناگوار تھا۔ میں تو اپنی مرضی کے مطابق کسی پُرامن جگہ میں رہ کر لطف اُٹھانا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ اگنیتھا کو فقط اپنے حُسن کی تعریفیں سُننے سے غرض تھی۔ جب ہم وی آنا میں کسی تھیٹر یا کسی کانسرٹ میں جاتے تھے تو ہر آدمی اُس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔ شاید وہیں سے اُسے اپنے حُسن کی تعریفیں سننے کی لت پڑ گئی تھی۔ اب وہ یہاں تھی۔ یہاں وہ بات کہاں۔ لیکن اپنے مداحوں کے بغیر اُس کی وہی حالت ہوتی ہے جو سگرٹ پینے والے کی سگریٹ کے بغیر۔ اس کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت ہی نہیں یہ حقائق ہیں اور اگر کسی کو اُن سے اختلاف ہو تو اُسے چاہیئے کہ کبھی حسین عورت سے شادی نہ کرے اور بس۔

یہ خیالات میرے دماغ میں اُس وقت چکر کھا رہے تھے جب ایک سہانی صبح

کوہ میں جنگلوں میں پھر رہا تھا۔ اُس وقت وہ سوئی ہوئی تھی گھومتا گھومتا میں جھیل کے کنارے آن کھڑا ہوا وہ دھوپ میں چمکتی ہوئی جھیل اور شگفتہ وادی کو بصد حسرت و یاس دیکھنے لگا۔

دنیا کا یہ حصہ مسرت کی ایک کان معلوم ہو رہا تھا یہاں کے لوگوں میں ایک خاص قسم کی خوش ادائی نظر آتی تھی اور میں ہرگز وہاں سے نہ جانا چاہتا تھا۔

یکایک میرے دل میں بجلی کی طرح ایک خیال دوڑ گیا شاید وہ . . . بشرطیکہ اس کا انتظام ہو سکے میں ڈریسچر کے چھوٹے سے خوبصورت مکان کی طرف لپکا۔ شاید تم ڈریسچر کو جانتے ہو وہی یوریرین نیشنل کمپنی کا مینیجر اور مشہور ظریف ایکٹر۔ بڑا خوش طبع آدمی ہے ہر وقت اُسے نئے خیالات سوجھتے رہتے ہیں بہترین رفیق ہے بہترین۔

میں نے جا کر اُس سے کہا۔ "ڈریسچر میں تم سے ایک مدد چاہتا ہوں تم تو یہاں ہر آدمی کو جانتے ہوگے۔ کیا تم مجھے ذرا ایک خوش شکل سا دیہاتی یا کوئی کلرک وغیرہ یا کوئی اور آدمی جو اس بات پر رضامند ہو "شیدائی" کا پارٹ ادا کرنے کیلئے مہیا کر سکو گے؟

"کس کا پارٹ؟"

"شیدائی کا! اس کے ذمہ صرف نظر بازی کا کام ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے نا میری بیوی اسکے بغیر نہیں رہ سکتی میرے خیال میں اس کا انتظام یوں کیا جا سکتا ہے کہ میں

اُس آدمی کی بیر وغیرہ اور ہوٹل میں اُس کے کھانے پینے کا خرچ برداشت کروں گا۔ تین مارک فی دن کے حساب سے اُسے اُجرت ملے گی۔ وہ باغ میں بیٹھ کر ٹکٹکی باندھ کر میری بیوی کی طرف دیکھتا رہے گا گویا اسکے عشق میں سرشار اور دیوانہ ہوگیا ہے"

عاشق اور دیوانہ! بہت اچھا بہت اچھا" ڈریسچر نے چلا کر کہا۔

میں نے اسے تمام صورتِ حالات سمجھا دی اور میونچ کے تمام واقعات اس کے سامنے دُہرا ڈالے اور بتا دیا کہ اگر میں نے کوئی "شیدائی" تلاش نہ کر لیا تو اگیتھا مجھے یہاں بھی نہ رہنے دیگی۔

ڈریسچر نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ ضرور اس کا بندوبست ہو جائیگا اس وقت میرے پاس کوئی فالتو ایکٹر تو نہیں تمام سخت مصروف ہیں البتہ . . . ہاں، چوبدار اس کام کے لئے بہت موزوں رہیگا اور میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ بہت ہی "قابل" آدمی ہے۔ کوٹ بھی اس کے پاس کافی نفیس ہے۔ بس بھئی مطمئن رہو اب یہ معاملہ مجھ پر رہا۔ میں ابھی اس کو بلاتا ہوں گا بہت قابل ہے بس آج دوپہر کو مشین اپنا کام شروع کردے گی۔ گھورنا ہے نا بس؟"

"ہاں گھورتے رہنا ہے۔"

"ذرا بیتابی سے آنکھیں مٹکا مٹکا کر گھور لیا اور کبھی کبھی "ہائے" کہہ کر دل ہاتھ سے تھام لیا۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایسی باتوں میں کتنا ماہر ہوں اور تم میرے سکھائے

ہوئے ایکٹروں کو پارٹ کرتے بھی دیکھ چکے ہو۔"

میں نے جواب دیا "میرے پیارے ڈریسچر میں تمہارا بڑا ممنون ہوں لیکن تم جانتے ہو...... ایک چوکیدار ؟ کیا وہ کچھ خوش شکل ہے ؟"

ڈریسچر کہنے لگا "تم اس کا کچھ خیال نہ کرو عورتیں اپنے شیدائیوں کی شکل کو نہیں دیکھتیں۔ اپنی شکل کو دیکھتی ہیں تم دیکھ لوگے......"

وہ سچ کہتا تھا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ چوبدار...... اف اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں نے کبھی کسی کو اس غضب کی نظر بازی کرتے نہیں دیکھا۔ ڈریسچر بھی غضب کا سٹیج مینیجر ہے۔

شام کو میں ڈاک خانے گیا۔ اگیتھا باغ میں رہی۔ اور نظر باز چوبدار ایک لمحے کیلئے بھی اپنے فرض سے نہ چوکا۔ جب میں واپس آیا تو آکر اگیتھا سے کہا "میں سٹیشن پر گاڑیوں کا وقت معلوم کرنے گیا تھا۔ ہمارے لئے سب سے بہتر وہ گاڑی رہیگی جو دس بجے صبح روانہ ہوتی ہے"

سینے میں میرا دل بلیوں اچھل گیا۔ میں کامیاب رہا تھا۔ اگیتھا میری بات کے جواب میں پکار اٹھی "تمہارا کیا مطلب ہے، تم بھی عجیب ہو، تم کسی جگہ امن سے بھی ٹھہرو گے یا نہیں ؟ دیکھو کیسی عمدہ جگہ ہے جھیل اور......"

میں نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے جواب دیا "لیکن یہ تو تمہارے معیارِ ذوق

کے مطابق بہت چھوٹی ہے"۔

"نہیں بھی تو اس کی خوبی ہے"۔

"اور یہ اردگرد کے پہاڑ"؟

"تمہاری صحت کیلئے پہاڑ بہت اچھے رہیں گے کیسی تازہ ہوا ہے پوچھ تو لو ڈاکٹروں سے۔ میں روز روز کے اسباب باندھ کر اور متواتر سفر سے تنگ آگئی ہوں۔ اچھا کر دو یہیں ٹھہرے رہو!

ہم وہاں تین ہفتے تک ٹھہرے رہے۔ چوہدار ہر اتوار کو مجھے باقاعدہ بل پیش کرتا۔ اکیس شلنگ اس کی تنخواہ بنتی دس بارہ مارک بیر کیلئے اور تین مارک کباب وغیرہ کیلئے اسے ملتے جب ہم وہاں سے واپس آنے لگے تو میں نزدیک کے شہر میں اسے ایک نیا کوٹ خرید دینے کیلئے اپنے ہمراہ لے گیا کیونکہ پرانے کوٹ کی آستینیں منظر بازی کے فرائض انجام دیتے دیتے بالکل پھٹ گئی تھیں۔

بہت ممکن ہے کہ ہم اس موسم گرما میں بھی چھٹیاں گذارنے کیلئے وہیں جائیں۔

فہرست مضامین!

پر پہنچا دیں۔ اس کے قلب کی ہر دھڑکن کے ساتھ کائنات اس طرح لرزتی ہوئی نظر آ رہی تھی جیسے پانی پر ہوا کے جھونکوں سے کشتی ڈانوا ڈول ہوا کرتی ہے۔ اگر اس وقت رضیہ کی زبان سے کوئی حرف بددعا کا نکل جاتا تو یقیناً عظیم کی تباہی کے واسطے کافی تھا۔ مگر رضیہ نے زبان نہ ہلائی، وہ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی اور نعیم کو اپنی گود میں بھینچکر اس نے رونا شروع کیا، وہ روئی اور خوب جی بھر کر روئی۔ جب طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے نعیم سے کہا۔ بیٹا عید کو کیا پہنو گے۔

نعیم :- اماں تم نے کہا تھا چچا جان کپڑے بنائیں گے۔

رضیہ :- چچا جان کہتے ہیں تم خود بناؤ۔

نعیم :- پھر تم ہی بنا دو۔

رضیہ نعیم کی اس معصومانہ بات پر پھر رو دی، اس نے نعیم کو گلے سے لگا کر کہا۔ بیٹا کہاں سے بنا دوں۔

نعیم اس کا جواب نہ دے سکا۔ فرشتوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ اگر وہ کچھ کہتا اور رضیہ کے قلب پر اس سے چوٹ لگتی تو اس کے دل کی چوٹ سے کونین کا ذرہ ذرہ تباہ ہو جاتا۔

عید آئی اور اپنی تمام ——— الم ——— بہاریں ساتھ لائی۔ عظیم کا گھر

عید کی مسرتوں کا آئینہ تھا۔ عظیم اور اُس کی بیوی مرصع کپڑوں سے آراستہ تھے۔ اور بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھا۔ عظیم کے ملازم بھی آقا معلوم ہوتے تھے۔ نعیم ابھی سو رہا تھا اور رضیہ مصلّیٰ پہ بیٹھی ہوئی شوہر کی رُوح سے کہہ رہی تھی:۔

"میرے سرتاج! نعیم آج ننگا ہے۔ اس کے سر پہ ٹوپی نہیں، پیر میں جوتہ نہیں! مجھے ڈر ہے کہ آپ کی اس کنیز کا صبر آج رخصت ہو جائے گا۔ آپ کی رُوح جنت میں آرام سے ہو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو تکلیف ہو۔ اس لئے دن بھر نعیم کو بہلاتی رہوں گی اور اُسے خبر نہ ہونے دوں گی کہ آج عید ہے۔ میں ہر حال میں خوش ہوں اور خدا جانتا ہے کہ میں نے عمر کا اتنا حصّہ کیونکر کاٹ دیا، مگر نعیم بچہ ہے وہ نہیں جانتا کہ اس کی ماں پہ کیا گزرتی ہے۔ اس لئے معاف کرنا میرے سرتاج اگر اس کی چیخیں آپ کو قبر میں بے چین کر دیں اور اس کے شور سے آپ کی دائمی نیند میں خلل پڑے۔"

رضیہ کا سلسلۂ خیال یہیں تک پہنچا تھا کہ نعیم نے کروٹ لی اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ امّاں کپڑے لاؤ —— امّاں کپڑے دو —— جلدی لاؤ امّاں کپڑے۔

رضیہ:۔ کیوں بیٹا کپڑے کیا کرو گے، کپڑے تو تم پہنے ہو۔

نعیمہ :- نہیں امّاں آج عید ہے - ابھی سوتے میں مجھ سے کسی نے کہا ہے کہ اٹھو آج عید ہے - ہم ضرور نئے کپڑے پہنیں گے -

رضیہ :- ٹھہرو بیٹا تمہارے ابّا جان جنّت سے تمہارے لئے کپڑے بھیجیں گے -

نعیم :- کب بھیجیں گے -

رضیہ :- منہ ہاتھ دھو کر ہمارے پاس آؤ اور اپنے ابّا جان کی مغفرت کیلئے دُعا مانگو، وہ خوش ہوں گے تو تمہیں جنت سے کپڑے بھیجیں گے

نعیم :- دعا میں مصروف ہو گیا اور اُس وقت تک ماں کے پاس مصلّی پر بیٹھا رہا جب تک لوگ عید کی نماز کو روانہ نہ ہوئے - ادھر رضیہ بال کھولے ہوئے سجدے میں پڑی تھی اور کہہ رہی تھی :-

"اے زمین و آسمان کے مالک! مجھے صبر دے اور میرے نعیم کو قدرت سے سمجھا دے کہ وہ اپنی ضد سے میرے دل کو زخمی نہ کرے جب دنیا عید کی عشرتوں سے معمور تھی اور جب جاہ و ثروت کے متوالے دولت و امارت کی نمائش میں حصّہ لے رہے تھے ایک یتیم بچہ پھٹے کپڑے پہن کر معصوم ہاتھ اٹھائے ہوئے باپ کے لئے مغفرت کی دعا کر رہا تھا اور ایک بیکس بیوہ بال پریشان کئے یتیم بچے کی ضد سے پناہ مانگ رہی تھی ۔"

مکتبہ اُردو لاہور کی ہر دلعزیز مطبوعات

پیغمبر صحرا . . ("پرافٹ آف دی ڈزرٹ کا اردو ترجمہ" خالد لطیف گابا) . . قیمت مجلد و مطلّا دو روپے

کمپنی کی حکومت .... اشتراکی ادیب باری ..... قیمت ...... ״

افکارِ زندان ..... ״ ..... ״ ..... ایک روپیہ

تین پیسے کی چھوکری ... قاضی عبد الغفار خان .... قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ

عورتوں کے افسانے ... کوثر چاند پوری ...... ״ ایک روپیہ چار آنے

دنیا کی حور اور دیگر افسانے ... ״ ...... ״ بارہ آنے صرف

آخری فیصلہ (ناول) .... قیسی رامپوری ..... ״ ״

شہنشاہ جبشہ (ڈرامہ) ... اختر اورینوی ایم۔ اے ... ״ آٹھ آنے ״

امیر خسرو کی نصیحت بیٹی کے نام "پروفیسر شجاع ناموس ایم۔ اے" ۔ قیمت چھ آنے

آہنگِ رزم ...... وقار انبالوی ...... قیمت مجلد و مطلّا دو روپے

کولمبس ...... پنڈت میلا رام وفا ...... ״ ״

ملنے کا پتہ :-

مکتبہ اردو لاہور